

سال نومبارک

دل کے آتشیں رنگ • رانجی کی تسمیہ رنگ

عالمی

سچی کہانیاں

JANUARY
2012

PDFBOOKSFREE.PK



155

جب میں کھو گئی تھی

عطیہ ہدایت اللہ

166

ویران مکان

فرح اسلم

178

کراچی سے کینیڈا تک

شگفتہ شفیق

196

مسئلہ یہ ہے

ادارہ

211

خیال آرائی

قارئین

218

پسند اپنی اپنی

قارئین

237

تاشون

شازی سعید مغل

258

بازگشت

سہام مرزا

148

گر جو صلے مضبوط ہوں

خلیل جبار

160

مجھے انصاف دو

ارم ایوب

171

یہ گدہ نما انسان

ارم زہرا

190

زندگی لکھ رہا ہوں

فیضان عثمانی

205

آپ کی ڈائری

قارئین

214

کتاب تبصرہ

عکاشہ

220

جن آنکھوں میں خواب بسے تھے

فاطمہ بلگرامی

245

گھائل آتما

حنیف حمر

9

احوال

ناصر رضا

46

اعتبار سفر تمام ہوا

صیبر شاہ

72

شہید کی ڈائری

منزہ سہام مرزا

84

سانجیاں نہیں ہے

غزالہ شاہین عبدالقیوم

98

دُعا سے بددعا تک

رحمہ

108

سولی اعتبار کی

اجالہ عادل

118

اُن کہی سی داستان

احمر منصور

144

نظر تو آتا ہے مگر

ایڈین اورین مسیح

7

چشم حیراں

منزہ سہام

33

وہ تو خوشبو ہے

راہِ محمود

54

وہ تاریک سردرات

دانیال احمد

74

میں جس ڈگر پہ تھی

اُم منائل

89

ایک عجیب پریم کتھا

رفاقت جاوید قاضی

103

تقدیر پہ بس نہیں

سید ابوبکر آزاد

111

ریت کا محل

گڈی آپا

131

اک کسک باقی ہے

خواجہ احمد عباس



چشم حیراں

میں ایک پاکستانی..... حیرت سے اپنے چاروں جانب دیکھتی ہوں۔ ہر شخص نا آشنا لگتا ہے۔ اپنا سایہ بھی اپنا نہیں لگتا۔ درو دیوار بھی مانوس نہیں۔ ہوا اور فضا میں بھی گھٹن ہے۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا میں کسی کو نظر نہیں آ رہی ہوں؟ کیا مجھے کوئی محسوس نہیں کر رہا ہے؟ لوگ مجھے کیوں روندتے ہوئے گزر رہے ہیں؟ یہ میرے اپنے ہیں پھر بھی؟ میرے ارد گرد کبھی خوشیاں رقصاں تھیں وہ اب کہاں ہیں؟ وہ نیلگوں آسمان وہ معطر ہوا کہاں ہے؟ میرے بچے خوف زدہ کیوں ہیں؟ میرے جوان بدظن کیوں ہیں؟ میری بہو بیٹیاں بے گور و کفن کیوں ہیں؟ بے ردا کیوں ہیں؟ کیوں.....؟ کیوں.....؟ میں چشم حیراں ہوں اور بس..... میرے ہاتھ برف کی مانند کیوں ہیں؟ میری آنکھیں پتھرائی ہوئی کیوں ہیں؟ میرے چاروں جانب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں یہ سب ہو رہا ہے؟

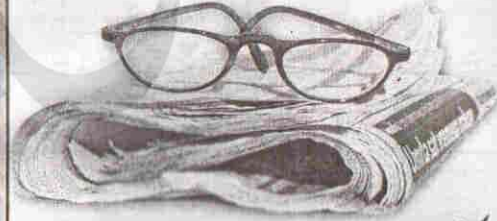
منزہ سہام

بعض خبریں صرف ہوتی ہیں خیال
ہر خبر کو بھی خبر مت جاے

فلک ٹائمز

Daily PalakTimes Karachi

- محترمہ فاطمہ ثریا بجیا کی سرپرستی میں جلد آ رہا ہے۔
- آپ کا اپنا اخبار، جو آپ سوچیں گے، وہ ہم لکھیں گے۔
- جو آپ چاہیں گے وہ ہم شائع کریں گے۔
- آپ کی اپنی منزلہ سہام کی زیادارت۔



جلد آ رہا ہے

ایجنٹ حضرات اور نمائندگان فوری رابطہ کریں۔

0300-2313256 - 021-34934369 - 021-34939823

احوال

اس پرچے کا مدیر قارئین کے درمیان

ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے دوست، قارئین کرام! زندگی، صحت، خوشی، کامیابی اور امن کی دعاؤں کے ساتھ سلامتی بھر اسلام آپ تک پہنچے۔ 2011ء کا سورج گزرے وقت کی گھائیوں میں ڈوب چکا ہے اور نئے سال کا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہو رہا ہے۔ اور میرے ذہن میں بس ایک سوال ہے کہ..... ہم یا پھر یہ جانتا وقت اور سال کیا ”ورثہ“ چھوڑ کر جا رہا ہے؟؟ کچھ تو ایسا ہونا چاہیے نا!..... جو اس بات کا ثبوت بن کے رہے کہ..... کبھی ہم بھی صرف زندہ ہی نہیں..... موجود بھی تھے..... اسی سوچ کے حوالے سے محسن بھوپالی مرحوم کی یہ سوچ ”ورثہ“ آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش ہے۔

اس موٹے بے ڈول تنے کے غار میں جھانکو
ویرانی اپنے بال بکھیرے..... خشک زباں سے
اک اک جز کو چاٹ رہی ہے
آؤ کوڑھ کی ماری شاخوں کے گلے سے پہلے
اپنی عمر کے سپیل سورج کے ڈھلنے سے پہلے
اک پودائی دیتے جائیں!

ورثہ

آخر کس امید پہ اپنا سر تہوڑائے
بوڑھے بیڑے کے نیچے بیٹھے
بیتے لمبے گنتے رہو گے
پوچھل سر سے ماضی کے احسان جھٹک کر اٹھو
دیکھو یہ سب کوڑھ کی ماری شاخیں
گل کر گرنے والی ہیں

اور اب آغاز احوال!

”بھائی ناصر! تم! آپ کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اسلامی جبری اور عیسوی سال نو کی دلی مبارکباد! ساتھ ہی ادارے کے تمام افراد اور ”سچی کہانیاں“ کے تمام راسخ ز اور قارئین کرام کو بھی اس دعا کے ساتھ کہ..... سال نو نہ صرف آپ سب کو بلکہ ملک کے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو بھی صحت، سلامتی، خوشیوں ہر قسم کی محرومیوں سے نجات، ظلم، نا انصافی، بد عنوان سیاستدانوں، اقتدار کے بھوکے عسکری افسرانوں، سامراجی طاغوتوں کے زوال، حق و انصاف کے حصول، بے روزگاری، افلاس، بد حالی اور ملک سے ہر قسم کے استحصال کے ہمیشہ کے لیے خاتمے کی نوید لے کر آئے بد عنوانیوں اور بے راہ روی سے ہمیشہ کے لیے نجات نصیب ہو، آمین۔ برخوردار کاشی چوہان نے ”احوال“ کے آغاز میں ”دعائے سال نو“ کی صورت پہلے ہی وہ سب کچھ کہہ دیا جو نہ صرف ہماری بلکہ ہر درمند دل رکھنے والے کی دلی خواہش ہے۔ اللہ کاشی کو نظر بد سے ہمیشہ محفوظ رکھے کہ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا ہے۔ چاہے ظلم ہو یا شر۔ ہم اس کی صلاحیتوں کے ہمیشہ سے معترف ہیں۔ اب آتے ہیں دبیر کے شمارے کی جانب۔ بھائی ناصر! آپ کی

سرورق

ماڈل: کنزرا

میک اپ: روز بیوٹی پارلر

فون: 34977970

عکاسی: موسیٰ رضا

رابطہ: 0300-2140977



شخصیت کا دیر کچھ ہوتا ہے

خدا نے آپ کو حسن کی دولت سے نوازا ہے۔ آپ کو لباس پہننے کا سلیقہ آتا ہے تو پھر آپ کو
اپنا سچی کہانیاں کے رزق کی زینت کیوں نہ بنائیں؟
آج ہے تابطہ تمام کیجیے

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

مختص اب خود بولنے لگی ہیں۔ اس مرتبہ شمارہ بہت پسند آیا۔ بات یہ تھی کہ وطن سے محبت اور قیام پاکستان سے جڑی ہجرت کی کہانیاں بہت خوب صورت تھیں۔ بھائی ناصر! ایسی کہانیاں اکثر و بیشتر شامل اشاعت ہونی چاہئیں تاکہ نوجوان نسل بھی جان سکے کہ وطن عزیز کے لیے ان کے اسلاف نے ایسے خون سے کیسی المناک کہانیاں تخلیق کیں۔ میجر (ر) امتیاز حسین کی ”باقی ہے ابھی رنگ“ اس ماہ کی حاصل مطالعہ کہانی تھی مٹی مٹی کے دلچسپ اور گفتہ پیرایہ میں اتنی المناک کہانی بیان کی جو کہ میجر صاحب ہی کا خاصہ لگتا ہے۔ ”موم کا گھر“ صبیحہ شاہ کی دکھوں کی آنچ میں چپ چاپ پھلتی عورت کی کہانی بہت دردناک تھی جو کم از کم ہمیں تو رلا گئی۔ ہم ہمیشہ سے دعا گو رہے ہیں کہ اللہ اگر تو کسی کو بیٹی دے تو اس کا مستقبل بہت اچھا کرنا۔ جسے کہانی کے اختتام پر ہم نے پھر دہرایا۔ ”کیا برا تھا مرنا“ بھی وطن عزیز کے قیام کے پس منظر بیان کرنی بہت دلگداز کہانی تھی جو محمد رضوان فیوم نے بہت خوب صورت انداز میں پیش کی۔ ”کیسا ستم ہے“ جیکل میٹلو کی سیلانی فطرت انسان کی دلگداز کہانی بہت اچھی لگی۔ زندگی کے ہر پہلو پر، علم، خوشی کو بیان کرنی کہانی جو ایک المیہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ مینا تاج ”پرچھائیاں ہمارا ہی تھیں“ لے کر آئیں۔ اگرچہ موضوع ”پریم کھانا“ تھا لیکن جس انداز میں یہ کھانا تحریر کیا وہ بہت ہی اچھا تھا۔ دل پذیر انداز اور تحریر میں روانی، ہمارے خیال میں اس ماہ کی خاص کہانی تھی۔ مینا تاج آج کل بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مینا اس انداز تحریر کو جاری رکھیں، بہت خوب! احمد سلیم اختر کی تحریریں ہمیشہ ہی خاص تحریر ہوتی ہیں سو ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ وطن کی رام میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے کی خاص کہانی ہے۔ مسرت گیلانی ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ چاہے نظم ہو یا نثر، خوب لکھتی ہیں۔ ”عمر کافی جیسے سزا“ مختصر نثر بہت پراثر کہانی تھی۔ عذرا فردوس کی ”مکافات عمل“ بھی اچھی لگی۔ اخباری خبروں کو خوب صورت کہانیوں میں ڈھالنے کا فن تو ارم زہرہ ہی جانتی اور خوب جانتی ہیں۔ ”ہاں میں قاتل ہوں“ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خطوط میں کسی غزالہ نہاں پر سیتے صدمات دکھائی کر گئے۔ اللہ ان کو یہ دکھ کھیلنے کا حوصلہ عطا فرمائے اور مرحومین کو بلند درجات، من شاہ اللہ آپ کی والدہ کو تعالیٰ علین میں جلد دے، آمین۔ ان تمام خواتین و حضرات کا شکریہ جنہیں ہماری کہانی پسند آئی۔ خاص کر روبینہ شاہین کا کہ انہوں نے ہماری تحریر کے بین السطور پیغام کو سمجھا جس میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں روح کی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ منظومات میں مسرت گیلانی کی ”سوچو ذرا“، من شاہ کی مختصر نظم ”چڑیا“، غزالہ شاہین عبد القدوم کی ”چچین“ اور قیصر پرویز راجپوت کی ”اپنی بہن کے لیے“ لا جواب رہیں۔ بھائی ناصر! خرابی صحت کے باعث ابھی تک انتہائی کچھ پڑھ پائے پھر آپ کا ٹیلی فونی پیغام کہ جلد از جلد بھیج دو جو کچھ لکھا ہے بھی پیش نظر ہے چنانچہ اس پر اکتفا کرتے ہیں۔

صحت، کاملہ کے لیے دعا گو ہیں۔

☒ صفیہ کل شاہ لاہور سے۔ ”ناصر صاحب السلام علیکم! امید ہے کہ ”پچی کہانیاں“ کی ٹیم اور اہل ادارہ بخیریت ہوں گے۔ لمبی غیر حاضری کے بعد پھر آگئی ہوں اور شرمندہ بھی ہوں۔ پچی کہانیاں سے ناتا بھلا کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ تمام احباب کو نئے سال کی دلی مبارکباد۔ شمارہ کافی تاخیر سے ملا۔ خوب صورت پس منظر کے ساتھ ساتھ ٹائٹل گرل کی تکیسی مسکراہٹ بھی اچھی لگی۔ کاشی چوہان کی خوب صورت ”دعاے سال نو“ پڑھ کے آمین آمین ہی کہتی رہی۔ ”احوال“ میں سب ہی خوب صورت باتیں اور تبصرے اچھے لگے۔ خصوصاً گفتہ شیخ، غزالہ شاہین، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، خصوصی خط فہیم انکل اور اشعار سے مزین صفیہ سلطانہ کے تبصرہ جات عمدہ رہے۔ انکل فہیم کے بھائی کے انتقال کا پڑھ کے دلی رنج ہوا۔ خدا تعالیٰ مرحوم کی بخشش کے ساتھ درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ من شاہ اور سیدی غزالہ کے خطوط پڑھ کے بھی دل ملال سے بھر گیا۔ خدا تعالیٰ مرحومین کی مغفرت کرے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کا کہانیوں کا انتخاب لا جواب تھا۔ سلیم ناصر کا زینت نامہ وہ بھی تصاویر کے ساتھ، ہمیں راجہ محمود کا ممنون کر گیا۔ ہر دل عزیز لی جنڈ کے بارے میں بہت کچھ نیا پتہ چلا اور بہت اچھا لگا۔ خصوصی کہانیوں میں ”باقی ہے ابھی رنگ“ واقعی بہت خاص رہی۔ امتیاز حسین نے بہت جاندار اور خوب صورت لکھا، خصوصاً شروع میں ان کی گفتہ بیانی، ادبی جاشنی لیے ہوئے تھی۔ معاشرے کے برائے نام عزت دار اور مہذب لوگوں کو آئینہ دکھائی صبیحہ شاہ کی تحریر ”موم کا گھر“ بھی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ اثر

جادوئی جیسے شاعر کا کردار حیران کر گیا۔ محمد عزیز کی اپنے استاد کی باتیں اور یادیں ان کی عقیدت کلو جا کر اور عظمت کو آشکار کرتی ہیں۔ اچھا استاد بھی ایک عظیم نعت ہے۔ محمد رضوان قیوم پاکستان سے جڑی یادگار تحریر لائے لیکن صفیہ کا انجام دکھی کر گیا۔ رضوان قیوم نے جزیات نگاری خوب کی۔ ”بین نمبر 105“ دلچسپ اور جس سے بھرپور مٹی اور صفدر عباس اعوان نے خوب صورت اسلوب میں سپر قلم کی ”زندگی سے گزر کر“ ایک اور اچھی تحریر تھی۔ رمشا کی کم سنی میں مہلک بیماری اور پھر موت ملول کر گئی اگر اس کے والد یوں غرق آب نہ کرتے تو اس کی روح بھی نہ بھٹکتی رہتی اور کہانیاں بھی اچھی تھیں..... ”ناشون“ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس بار ماہنامے کی جان ”کراچی سے کینیڈا تک رہا“ آپنی شگفتہ کے دلچسپ سفر کی تفصیلات جاننے کا بے چینی سے انتظار تھا اور دیکھیں انہوں نے اکیلے سفر بھی نہیں کیا۔ اسلام آباد، ٹورنٹو، رجمنڈ ہلز، کیسٹنٹو، نیا گرا فانی قلمی کہ اپنے انٹرویو اور مشاعرے میں بھی ہمیں ساتھ ساتھ رکھا۔ تصاویر مزہ اور بھی دو بالا کر گئیں۔ آصفہ اقبال بہت سادہ اور رواں انداز میں اپنی زیست کہانی لے کر آئیں۔ ان کے ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ ”گرو حوصلے جواں رہیں“ بھی اچھی لگی لیکن اس میں مزید کی بہت گنجائش موجود ہے۔ شاعری میں کاشی چوہان، شاہد فراز، شگفتہ، نیر رضوی، ایم اے راجہ اور شفیق احمد ندیم کے مقالات من کو بہائے۔ ایک کہانی لکھ رہی ہوں مکمل ہوتے ہی انشاء اللہ ارسال کروں گی۔

کچھ صفیہ بکلی شاہ صاحبہ! آپ کی ”بچی کہانیاں“ میں آمد ہمارا دل شاد اور آباد کر گئی..... اب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے..... اور ہاں! کہانی کا ہم بہت بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

✉ شگفتہ شفیق کراچی سے۔ ”محترم ناصر رضا بھائی، السلام علیکم اید ہے کہ ماشاء اللہ آپ بخیریت ہوں گے۔ دسمبر کا بچی کہانیاں ابھی تک آئیں سے موصول نہیں ہوا ہے۔ ایک اسال سے خرید لائے ہیں بلکہ کئی ایک لائے ہیں کیونکہ ٹورنٹو سے فرمائش آئی تھی کہ ہمیں ”بچی کہانیاں“ جلد بھیج دو ہم نے بھی تمہارا ”فرمانہ“ ”پڑھنا ہے۔ ویسے ناصر بھائی قیس بک پر بڑا ہی اچھا رسائیں آیا ہے۔ میرے سارے کینیڈا والے احباب نے اپنی رائے اور پسندیدگی سے نوازا ہے۔ میں گزشتہ دنوں بہت زیادہ مصروف رہی۔ پہلے تو میں اپنی بچی کے ساتھ، کیونکہ اس کے کان میں الوداعی دیک چل رہا تھا۔ سو روز اس کو لینے اور چھوڑنے جانا بھی میری ڈیوٹی تھی۔ پھر بقرعید آگئی سو اس کی مصروفیت..... ہاں بقرعید سے پہلے ایک دن ثمنینہ احمد (قومی اخبار کے آواز خواتین میگزین کی ایڈیٹر) کا فون آیا کہ آپ کا انٹرویو کرنا ہے۔ یہ آپ بتائیں کہ انٹرویو اپنے گھر میں دیں گی یا آفس آئے۔ ہم نے اخبار کا دفتر بھی دیکھا ہی نہیں تھا اور ہمارا بیٹا بھی اس وقت گراچی میں موجود تھا تو یہ بی سوچا کہ آفس جا کے انٹرویو دیا جائے۔ سو انٹرویو تو ہوا ہی، اُس کے ساتھ ہی ثمنینہ احمد نے قومی اخبار کا سارا سیٹ اپ دکھایا۔ سب لوگوں سے ملوایا بہت اچھا لگا۔ یہ انٹرویو 2 نومبر کو آیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ریڈیو سے سیمار ضار دا کا فون آیا کہ شگفتہ آپ کا انٹرویو FM-93 پر کرنا ہے۔ پلٹر کل تشریف لے آئیں۔ یہ ریڈیو پورا انٹرویو، زبردست تجربہ رہا۔ سیمار ضار دا کو تو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ البتہ وہاں خالد مبین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی خوب صورت شاعری تو ہم نے بہت پڑھی ہے جو کہ نہایت شاندار ہوئی ہے۔ ان سے ملنا بے حد اچھا لگا خالد مبین صاحب ملک کے بڑے قابل آدمی ہیں۔ یہ انٹرویو FM-93 پر ”ادب سرائے“ میں آن ایئر کیا تھا۔ سیمانے اگلے دن ٹیلی فون پر بتایا کہ آپ کا انٹرویو بہت پسند کیا گیا ہے۔ 15 نومبر کو میرا بیٹا فرح سعودی عرب روانہ ہوا اور 17 نومبر کو میں اور کنیز لال لاہور کی جانب چل دیے۔ کیونکہ کنزل کولاہور پی سی میں چار دن شوکت خانم اسپتال کے سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ تو میں بھی کنزل کا سایہ بن کے لاہور جا پہنچی اور کنزل اپنے میڈیکل سیمینار میں مصروف رہی اور میں اپنے پیارے عزیزوں اور عزیز از جان دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں میں بڑی رہی۔ وہاں پر زمر نعیم، بشری سجد، عظمیٰ خورشید، فریدہ جاوید فری اور رضوانہ کوثر سے ملاقات بہت ہی دل پذیر رہی۔ تمام مہربانوں نے اس قدر خاطر تواضع کی کہ حد نہیں۔ واقعی لاہور، لاہور ہے اور بے حد مہمان نواز لوگ وہاں بستے ہیں۔ جو کہ خاطر تواضع میں بھیجے جاتے ہیں۔ ایم اے راحت صاحب سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی اصل میں میرے پاس کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ وقت کی کمی تھی۔ اسی وجہ سے صفیہ بک سے بھی ملاقات نہ ہو سکی لیکن ٹیلی فون پر آدھی ملاقات سب سے ہی رہی۔ لاہور ہمیشہ سے مجھے بہت پسند ہے یہاں کے بایوں کی

دعائے مغفرت

گزشتہ دنوں اخباری دنیا کی نامور شخصیت عبدالرحیم پہلوان رضائے الہی سے رزقِ خاک ہوئے..... ادارہ مرحوم کے تمام اہل خانہ سے تعزیت کے ساتھ مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

خصوصیت محبت ہے۔ مروت ہے، ساتھ ہی بے حد انکساری بھی۔ ذمہ کی کہانیاں کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ”سلیم ناصر“ کی ان کہی یادیں خوب رہیں۔ میجر امتیاز حسین صاحب نے ”بانی ہے ابھی رنگ“ بہت اچھا لکھا۔ صبیحہ شاہ نے ”موم کا گھر“ لکھ کے دل موہ لیا۔ بانی تمام کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کے ایک تھیں ”گھٹا آتما“ اور ”ناشون“ کی اقساط بھی اچھی لگیں۔ عکاشہ نے احمد وقاص کی کتاب ”ستارے منتظر ہیں“ پر خوب تبصرہ کیا۔ شاعری بھی تمام بہت اچھی لگی۔ ”دعائے سال نو“ بہت پسند آئی اور ساتھ ہی منزہ کا ادارہ ”حق“ بے حد پسند آیا۔ آخر میں سارے اسٹاف ممبرز کو آپ کو منزہ اور تمام قارئین کو نئے سال کی دلی مبارکباد اجازت۔“

بھہ اچھی بہن شگفتہ شفیق! ماشاء اللہ اتنی مصروفیات اتنا کام، اتنا نام مبارک ہو، لیکن اس درمیان میں وہ آپ کا ”کہانی“ والا وعدہ کیا ہوا؟

✍️ ملک صفدر عباس اعوان، خانیوال سے۔ ”محترم ناصر رضا، آداب! ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضری لگوانے چلے آئے گر..... حاضری قبول کریں تو آپ کی خاص عنایت خاص نوازش ہوگی۔ پہلے میں تو آپ کی بہت بہت مہربانی کہ آپ نے میری کہانی کو اتنے پیار سے رسالے کی زینت بنا کر مجھے شکریہ کہنے کا موقع دیا۔ یقیناً میں دل خوشی سے بارغ باغ ہو گیا۔ ”بچی کہانیاں“ سے ایک ایسا ناٹھ بڑا ہے جواب ٹوٹنا مشکل ہے..... مجھے یاد ہے جب ایک دن یوریت سے فرار کے لیے ”بچی کہانیاں“ کا ایک شمارہ بازار سے گزرتے ہوئے ایک بک شاپ سے خرید لیا تھا۔ پھر تو جناب ایک بار پھر شروع کیا تو آخری لفظ تک پڑھ کر ہی دم لیا اور پھر کیا کہوں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے ہی اس کی راہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دبیر کار سالہ ہاتھ تو آگیا مگر ابھی ملل پڑھائیں ہے چو پڑھا ہے وہ اچھا لگا۔ میں اپنی دواور کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ ان پر بھی نظر کرم کر کے مجھے ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے کا موقع دیں۔ اب اجازت چاہتا ہوں اس دعا کے ساتھ آپ کو اور سب اہل وطن کو سلامتی امن کے ساتھ خوش و خرم رکھے، دشمنوں کی ہر بری سازش سے ہمیں اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کو راہ راست پر لائے۔“

بھہ محترم ملک صفدر عباس اعوان! آپ کی کہانیاں اچھی ہیں۔ بہت جلد ”بچی کہانیاں“ کے صفحات کی مہمان ہوں گی۔

✍️ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ”قابل احترام ناصر انکسار علیکم السلام! اللہ تعالیٰ سے نیک امید ہے کہ آپ کی نیم سہیت تمام پڑھنے والے بالکل خیریت سے ہوں گے۔ 2011ء ہم سے الوداعی چاہتا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی بہت کچھ ٹھویا اور بہت کچھ پایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آنے والا سال ہمارے لیے امن اور سکون بھرا ثابت ہو۔ اس بار ”بچی کہانیاں“ کچھ لیٹ آیا۔ سرورق پر ماہِ ربیع بہت سچ رہی تھی۔ ”احوال“ میں تمام بہن بھائیوں کے خطوط بہت اچھے تھے، عکاشہ آئی بہت دنوں بعد ”احوال“ میں آئیں۔ بہت اچھا لگا۔ آٹنی منزہ سہام کا ادارہ ”حق“ حقیقت سے قریب تر ہے۔ انکس! میری کہانی کو انعام کا حق دار ٹھہرانے اور میری موبائل کہانی شامل کرنے پر شکریہ..... ادا کار سلیم ناصر کی زندگی کا ”احوال“ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میجر امتیاز حسین کی کہانی ”بانی ہے ابھی رنگ“ پڑھ کے آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ صبیحہ شاہ کی کہانی ”موم کا گھر“ پڑھ کر دل بہت ادا ہوا۔ محمد عزیز کی ”وہ جس پائیں خاک پا“ اچھی لگی، کچھ شک نہیں کہ استادوں کی خدمت کرنے سے دنیا آخرت سنور جاتی ہے۔ محمد رضوان قیوم کی کہانی ”کیا برا تھا مرنا“ بھی بہت دیکھی کر گئی۔ ملک صفدر عباس اعوان کی برسر اسی کہانی ”کیبن نمبر 105“ پسند آئی۔ نیجیل میٹلو کی کہانی ”کیا ستم ہے“ بتاتی ہے کہ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ مں منزل خان کی کہانی ”سوئے سے مہنگا ناٹھ“ نے ثابت کیا کہ خدا انسان کو

دیک کی طرح ختم کر دیتا ہے۔ مینا تاج کی کہانی ”پرچھائیاں ہمراہی تھیں“ بہت ہی اچھی تھی۔ محمد سلیم اختر کی کہانی ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ فارحہ کی ”اگر حوصلے جواں رہیں“ محمد اسلم آزاد کی ”ہوس کے غلام“ نعیم حبیب کی ”دعا کے ہاتھ نہیں رہے“ مینا عالیہ کی ”خواب ہوشوں کا جنگل“ سرست گیلانی کی ”عمر کالی جیسے سزا“ عذرا فردوس کی ”مکافات عمل“ بہت دلچسپ ہی نہیں، سبق آموز بھی تھیں۔ دونوں پر اسرار کہانیاں اچھی تھیں۔ ارم زہرا کی کہانی ”ہاں میں قاتل ہوں“ شوبز کی چمکتی دنیا سے جڑے اندھیروں کی سبق آموز کہانی ہے۔ ”سفر کہانی“ میں آئی ٹی ٹکنفٹ شفیق کا سفر نامہ بہت دلچسپ لگا۔ ”لکھ رہی ہوں زندگی کو میں“ آصف بلوچ کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ ان کی خوشیوں کے لیے دعا میں۔ ”خیال آرائی“ والا سلسلہ اچھا جارہا ہے۔ احمد وقاص پر عکاشہ کا تبصرہ بہت جاندار رہا۔ ”پسند اپنی اپنی“ میں غزالہ شاہین عبدالقیوم اور روبینہ شاہین کے شعر پسند آئے۔ ”گھاسل آتما“ اچھا جارہا ہے اور ”ناشوں“ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ بازگشت ”قدرت کی فیاضی“ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ تمام پڑھنے والوں کو سلام۔ کچھ رہ گیا ہو تو بہت معذرت۔

کچھ اچھی سبکی سدرہ انور علی! تمہاری کہانی کو انعام کا حقدار قارئین نے اپنی آراء سے فرار دیا ہے۔ اس میں بھلا ہمارا شکر یہ کیوں؟

☞ سیدہ افشاں سحر کراچی سے۔ ”قابل احترام ناصر اکل السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ کافی عرصے بعد آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں۔ بہر حال ”احوال“ سے غیر حاضری کے باوجود سالے سے رشتہ قائم اور عرق ریزی سے مطالعہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ حسب معمول پہلے آپ کا اداریہ ”حق“ پڑھا۔ ہر نئے سال کی آمد پر وابستہ دعائیں اور امن و خوش حالی کا خواب، ہنوز شرمندہ تعبیر ہے۔ وہی منظر نامہ آج بھی ہے۔ بحیثیت مسلمان قوم، ہم اپنے وطن سے بھٹک گئے ہیں۔ ہماری دعائیں حقوق کی ادائیگی پر ہی قبول ہوں گی۔ جب ہماری قیادت امر کی خوشنودی کے بجائے اللہ اور رسول کے دین کے لیے کام کرے۔ سب سے پہلے راجہ محمود صاحب کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ بہت مغرور انداز میں لکھتے ہیں۔ جیسے گزشتہ شمارے میں ”لبو کا رسیا“ اور مشہور و معروف شخصیات کے حوالے سے بیش قیمت معلومات مہیا کرنے پر ”راجہ محمود صاحب“ کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ ”احوال“ میں سب کے تبصرے اچھے لگے لیکن صفیہ سلطانہ صاحبہ کے انداز کی تو بات ہی نرمالی ہے۔ مجھے محترم محمد نعیم اکل کے تبصرے کے جواب میں کچھ عرض کرنا تھا مگر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتی ہوں لیکن انتہا ضرور کہوں گی کہ سینئر ذلکھار یوں کو سالے سے ایسے غائب کیا جیسے ریمنڈ ڈیوس کو حکومت نے۔ امتیاز حسین کی تحریر ”باقی ہے ابھی رنگ“ اسے انداز کی ایک پراثر کہانی لگی جو یقیناً ناقابل فراموش ہے۔ ہمارا ملک پھر ہم سے قربانیاں مانگ رہا ہے۔ محمد سلیم اختر کی تحریر ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ اچھی لگی جس میں ساجد نے حقیقی زندگی کا مفہوم سمجھ کر وطن کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ عذرا فردوس کی تحریر ”مکافات عمل“ اسے موضوع کے لحاظ سے زبردست تحریر تھی۔ بے شک جائیداد کے حصول کی خاطر انسان کی ٹوٹل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جاوید عثمانی کی تحریر ”زندگی سے گزر کر“ اور نسreen رانا کی تحریر ”شجر موعود“ دونوں ہی بہترین تحریریں تھیں۔ نعیم حبیب کی چھوٹی سی تحریر ”دعا کے ہاتھ نہیں رہے“ ماں کی محبت ایک ایسا سندھ ہے۔ جس میں جتنی مرتبہ تیر و روح پوری طرح سیراب نہیں ہو پاتی۔ ہم سب کی کامیابیوں اور خوشی کے پیچھے ماں کی دعاؤں کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں انہیں بلند مقام عطا کرے، (آمین)۔“

کچھ اچھی سبکی سیدہ افشاں سحر! تمہارے اتنے عرصے تک غائب رہنے کی وجہ پوچھنے کے بجائے میں یہ معلوم کرنا ضروری سمجھ رہا ہوں کہ..... ہمارے ادارے میں تمہارے ساتھ ریمنڈ ڈیوس والا معاملہ کس نے کیا؟

☞ ممتاز احمد سیلا بیٹ ٹاؤن سرگودھا سے۔ ”قابل صد احترام ناصر رضا! سدا سلامت رہیں۔ السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کو ”چی کہانیاں“ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کرام کو نیا سال مبارک ہو۔ دعا ہے کہ نیا سال، سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں کا پیغام لے کر آئے، آمین۔ دبیر کا خوب صورت ٹائٹل والا جگہ گاتا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ ”احوال“ میں اپنا خط اور ”خیال آرائی“ میں اپنی تحریر دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ اتنی جگہ دینے پر تہ دل سے آپ کا ممنون و مشکور ہوں۔ ایک نئی موبائل کہانی اور ”خیال آرائی“ بعنوان ”غصہ“ حاضر خدمت ہے۔ امید ہے کہ پڑیرائی ہوگی۔ اب بات ہو جائے شمارہ

دعاے صحت

ہمارے ادارے کے دیرینہ ساتھی اور معروف شاعر محسن سلیم ان دنوں بستر علالت پر ہیں۔ وہ ربڑھ کی ہڈی کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ ان کی جلد از جلد صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کریں۔ ادارہ بھی ان کے لیے دعا گو ہے کہ خدائے بزرگ دیر تر انہیں شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے، (آمین)

ہمیر کی سب سے پہلے ذکر ”احوال“ کا۔ احوال کی محفل تو ایک خاندان کی مانند ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اپنے خاندان کے افراد سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اس محفل میں تمام قلم کاروں نے بہت عمدہ خطوط لکھے جن میں عکاشہ سحر، غزالہ شاہین عبد القیوم، عارفہ مسعود، ام عادل، عبد الحکیم ساجد، فرحت، ہمال اور صفیہ سلطانہ محفل کے تہرے بہت ہی خوب صورت اور شاندار تھے، بہت پسند آئے۔ راجہ محمود کی ”ان ہی یادیں“ میں انہوں نے ٹیلی ویژن کے عظیم فنکار کی یاد تازہ کر دی اور بڑے خوب صورت انداز میں سلیم ناصر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میجر (ر) امتیاز حسین کی کہانی ”بانی ہے ابھی رنگ“ بہت اچھوتی اور شاندار تھی بہت سے محققان سے انہوں نے پردہ اٹھایا ہے جو کہ پوری قوم کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ صبیحہ شاہ کی ”موم کا گھر“ شاعرانہ انداز میں لکھی خوب صورت پڑاؤں میں بہت دلگی اور دل کو مغموم کر دینے والی کہانی تھی۔ محمد رضوان قیوم کی کہانی ”کیا بڑا تھامنا“ دل کو ہلا دینے والی کہانی تھی اور ایک بہت بڑا سوال بھی ہے کہ کیا مسلمان کہلانے والے کا کردار اس قدر گھٹا نہ ہو سکتا ہے؟ ملک صفدر عباس اعوان، نجیل مینگو، مس منزل خان، فارحہ، محمد اسلم آزاد، جاوید عثمان کی کہانیاں بہت اچھی تھیں اور پسند آئیں۔ مینا تاج کی ”پرچھائیاں ہمراہی ہیں“ حیرت میں ڈوبی ایک نہایت شاندار کہانی تھی۔ سچی اور پاکیزہ محبت زندہ باد۔ محمد سلیم اختر کی ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ پڑھ کر بے اختیار یہ شعر لبوں پر آ گیا۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر

اللہ اللہ موت کو کسی نے مسیحا کر دیا

مسرت گیلانی کی ”عمر کاٹی جیسے سزا“ زیر دست کہانی تھی۔ گلشن آپا جس طرح صبر و استقلال، ہمت اور جدوجہد سے یہ کٹھن زندگی گزار رہی ہیں۔ اللہ کریم ان کو اجر عظیم سے نوازے گا انشاء اللہ۔ عذرا فر دوس کی ”مکافاتِ عمل“ ارم زہرا کی ”ہاں میں قاتل ہوں“ سبق آموز کہانیاں ہیں۔ نسرین رانا کی ”شجر ممنوعہ“ نے حیرت زدہ کر دیا۔ ”خیال آرائی“ میں ارباب قربان علی ابیری کی تحریر بہت پسند آئی۔ اس اجازت بہت سی دعاؤں، نیک خواہشات آپ کے لیے اور تمام قارئین کرام کے لیے۔

محترم ممتاز احمد! ”احوال“ میں آپ کی آمد ہمیں اچھی لگی..... آپ کی کہانی انشاء اللہ شمارہ فروری کا حصہ ہوگی۔

✉ راول کرم پوری، کوٹ قاضی ضلع وہاڑی سے۔ ”محترم ناصر رضا صاحب و محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ آداب! ایک طویل عرصے بعد ”سچی کہانیاں“ نظر سے گزرا۔ ماشاء اللہ اب بھی وہی آب و تاب لیے ہوئے ہے اور یہ بات عیاں ہوئی کہ اچھی اولاد وہی اپنے بزرگوں کی متاعِ سنجال کر رکھتی ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب مرحوم سہام مرزا صاحب کا شفقت بھرا سایہ ہمارے سر پر قائم تھا۔ بہت سی یادیں اور باذوق فی شخصیتوں کے درمیان ”سچی کہانیاں“ کا ایک گلستان آباد تھا۔ محسن بیویابی صاحبہ جیسی اعلیٰ پائے کی شخصیت کا رسالے کو اعتبار حاصل تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم اس رسالے کے مستقل قاری اور نگہباز تھے۔ ابتدائی دنوں میں کوٹ قاضی، کرم پور ضلع وہاڑی سے ”عبدالغنی انمول بھٹی“ اور بعد میں ”شہزادہ راول“ کے نام سے تحریریں رسالے کی زینت بنتی رہیں۔ پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور طبیعت فنِ شعریت کی طرف راغب ہو گئی اور میں اسی دشت کا مسافر ہو کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں بہت عزت دی اور دوشعری مجموعے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری پہلی درس گاہ ”سچی کہانیاں“ ہے اور میں اخبارات کے صفحات پر اس کا برملا اظہار کرتا ہوں۔ میرے اندر چھپے جذبات کو لفظوں کا پیرہن پہنانے کا سہرا ”سچی کہانیاں“ کو جانا ہے۔ تقریباً دس سال بعد ٹوٹے ہوئے اس سلسلے کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید میرے مذکورہ بالا پرانے

ناموں کا محترم ناصر رضا آپ کے اور منزه صلابہ کے شعور و ذہن میں کوئی پہلو نہ ہو تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ خیر دس سال بھی تو ایک عمر ہے لیکن اتنے عرصے اور پرانی باتوں کے تذکرے سے میری عمر کا اندازہ مت لگائیے گا۔ خیر اسے ابھی آتش جوان ہے۔ نئے قارئین کے لیے عرض ہے کہ میں نے اسی رسالے کے ذریعے اپنی اردو درست کی ہے۔ الفاظ پڑھنے سکھتے ہیں۔ یعنی بچپن سے ہی اس کا قاری دلکھاری ہوں۔ نومبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ کہانی کاروں کی فہرست دیکھی تو تمام نئے نام تھے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ”بچی کہانیاں“ کے صفحات میں ایک نئی ”بچی کی“ جنم لے رہی ہے۔ پرانے ناموں میں صرف محترمہ صفیہ سلطانہ غفل صلابہ کا خط اور تذکرہ موجود تھا۔ دوسرا نام عکاشہ سحر ایمان صلابہ کا ہے جن سے اخبارات کے ادبی صفحات میں بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ ”بچی کہانیاں“ میں ان کی موجودگی پر خوشی ہوئی کہ وہ اور میں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ شمارہ نظر سے گزرا تو کئی کہانیوں اور واقعات ذہن کے درجے میں اٹھ آئے جو ضبط تحریر میں لائے جاسکتے ہیں۔ سو انہی تحریروں کے ذریعے انشاء اللہ یہ رشتہ قائم رہے گا۔ اپنی کچھ غزلیں ارسال کر رہا ہوں وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے، آمین۔“

بھ محترم راول کرم پوری! آپ کو بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ آپ کا نام اور کام صرف ”بچی کہانیاں“ کے پرانے شماروں میں ہی نہیں ہمارے ذہن کے اوراق میں بھی یادوں کی تحریر کی صورت موجود ہے..... کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اب یہ سلسلہ ہمیشہ جڑا رہے۔

✉ رضیہ زمان کراچی سے۔ ”ناصر بھائی السلام علیکم! کیسے مزاج ہیں؟ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ایک طویل عرصہ بعد ”احوال“ میں آئی ہوں۔ دراصل بیماری یا پھر آزادی جان نہیں پیوڑنی۔ بیماری کیا ہے یہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں بس کمزوری سب سے بڑی بیماری ہے۔ کافی عرصے سے رسائل ملل طور پر پڑھ بھی نہیں سکتی ہوں۔ بستر پر لیٹنے سے فرصت ملے تو کچھ پڑھوں بھی، چلیں خیر اب اس عمر میں یہ تو ہوتا ہی ہے..... ہاں تو! میرے ”احوال“ کی محفل والے بچے اور بہن بھائیو! آپ سب کیسے ہیں؟ میری ڈھیروں دعائیں پیار آپ سب کے لیے۔ اللہ رب العزت آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ ترقی کی منزلیں طے کرتے رہیں اور ہماری دعائیں لیتے رہیں! صفیہ سلطانہ کا مکتوب پڑھا بہت خوشی ہوئی اللہ پاک ان کو اور عزت و مراتب عطا فرمائے اور صحت و تندرستی سے نوازے آمین ثنا آمین۔ ان کی صحت کے لیے میری خصوصی دعائیں ہیں۔ صفیہ حوصلہ رکھو اور اللہ پاک سے دعا کرو خود اپنے لیے، وہ اپنے بندے کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ میں دیر سے آؤں یا سویرے مگر یاد سب کو رکھتی ہوں۔ عرصہ دراز سے رسائل سے دوری رہی اس لیے کس نے کیا لکھا اور کیا لکھا؟ کچھ نہیں کہہ سکتی میری طرف سے سب اچھا ہے اور اچھا ہی ہوگا۔ اچھا ناصر بھائی آپ کے لیے بھی دلی دعائیں۔ منزه کو بھی میری ڈھیروں دعائیں کہیے، ہمت ہوئی تو بچی آفس کا چکر لگاؤں گی۔“

بھ رضیہ آپا! اللہ آپ کو صحت بھری زندگی دے۔ آپ کا ”احوال“ میں آنا ہمارے لیے بہت محبت اور مان کا باعث ہے۔

✉ حسین جو جو بورڈی شریف سے۔ ”اوہھ ناصر اگل، آداب۔ امید ہے کہ آپ بخیر رہتے ہوں گے۔ تمام قارئین کو نیا سال اور ساتھ ہی یکم جنوری کو تخلیق شدہ افرا کو سا لگرہ کی بھی مبارک باد دے کہ کوثر سعید آبی، مہناز اور ارشد علی ارشد بھائی جیسے ایٹام کو 20 جنوری بہت بہت مبارک ہو۔ شمارہ نمبر کے سرورق پر موجود ماڈل ماہ رخ مجھ سے پوچھ رہی تھی کیسی لگ رہی ہوں؟ میں نے بھی کہہ دیا حسن والوں کو پوچھنے کی ضرورت کیا ہے محترمہ! اب بات ہو جائے شمارے کی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے میں بات کرتی ہوں موبائل کہانی کی جو آنکھیں نم کر گئیں، (یہ فتنہ ہے) کہا گیا کہ اپنی بہنوں بیٹیوں کو موبائل فون نہ لے کر دیں لیکن میں اس بات کو مانتی ہوں کہ جس طرح انسان برا نہیں ہوتا بلکہ اسے حالات برا بننے پر مجبور کر دیتے ہیں تو موبائل بری چیز نہیں اس کا استعمال غلط ہو رہا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے کوئی شریف زادی کسی انجینی سے کوئی چیز لے سکتی ہے؟ جب کہ شہرین نے تو حد کردی راہ چلنے لڑکے سے موبائل نمبر لے لیا۔ یہ حرکت صرف وہی لڑکی کر سکتی ہے جو اپنے والدین اور مستقبل کو فراموش کر دیتی ہے۔ ”زندگی لکھ رہی ہوں“ ہائے آصفہ اقبال بلوچ، اپنی ذات کے متعلق خامیاں بیان کرنا بہت مشکل عمل ہوتا ہے لیکن آپ کی سچ بیانی جان کر اچھا لگا۔ ”سوئے“ سے ”ہنگامنا“ مس منزل نے منزل حاصل کرنے کا بہترین

مشورہ دیا ہے۔ امثال جیسی ساتھی میری بھی اسکول لائف کا حصہ رہی ہے۔ پڑھنے کے دوران لگا جیسے یہ میری اور اس ساتھی کی روداد ہے۔ وہ تیس انشاء اللہ کہانی کی صورت پیش کرنے کی کوشش کروں گی۔ ”ہوس کے غلام“ بہت ہی اعلیٰ کہانی اور انتقام اس سے بھی اعلیٰ تر ایک عورت نے بہت دلیری کا مظاہرہ کیا۔ بدلہ لینے کے حوالے سے ایک سبق آموز کہانی ہے۔ گھریلو خوں پر مشتمل کہانی بیٹا عالی کی جو خواہشوں کا جنگل بن گئی اور خواہشوں کے غلاموں کا راہ راست برآنا ممکن سا ہوا نظر آتا ہے۔ کہانی کا پلاٹ اور تصویر شاندار لگی۔ ”دعا کے ہاتھ نہیں رہے“ نعیم حبیب نے اپنی والدہ کی یادیں شیریں کیں۔ پیغام بہت اچھا دیا گیا ہے لیکن اب وہ انسان کہاں جوا جس میں بھائی چارے سے رہیں۔ مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا۔ ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ محمد سلیم اختر ایک پیاری کہانی لائے۔ راجہ محمود کے ذریعے سلیم ناصر کی زندگی کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ڈرامہ ”ان بچی“ ویسے بھی میرا فیورٹ رہا ہے۔ جب جب دیکھا ایک الگ ہی لطف آتا ہے۔ نہایت اعلیٰ فنکار تھے ماموں۔ ”گر جو صلے جواں رہیں“ صاف و شفاف موڑ لیے پسند آئی۔ گراچی سے کینیڈا کا سفر بہت اچھا لگا اور کینیڈا سے کراچی تک کا سفر اس سے بھی زیادہ اچھا ہوگا۔ جتنی بھی کہانیاں پڑھ پائی۔ ان میں سب سے مختلف اور عم زدہ کہانی ”کیا ستم ہے“ لگی۔ مزید تبصرہ ہمارے جوتمبرہ نگار جیسے ہیں وہی ڈیوٹی سر انجام دیں۔“

✍ اچھی۔ جی۔ حسین جوتمبرہ! اپنی اسکول لائف دوست کی روداد کہانی کی صورت کب بھیج رہی ہو؟
✍ مہک شیخ کراچی سے۔ ”محترم ناصر انکل السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی اور تندرستی دے، آمین۔ میں نے ”نچی کہانیاں“ چند مہینے پہلے سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ مجھے بہت پسند آیا اور ہر لحاظ سے بہتر لگا۔ میں پہلی بار آپ کے میگزین میں شرکت کر رہی ہوں۔ امید ہے نئے لکھنے والوں کی طرح آپ مجھے بھی دہل کم کریں گے۔ کیونکہ میں آپ کی پرانی رائٹرز فرحانہ شیخ کی چھوٹی بہن ہوں۔ ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے رسالے کو خیر باد کہہ دیا لیکن وہ ”نچی کہانیاں“ میں دوبارہ ضرور لوٹ کے آئیں گی، انشاء اللہ۔ شگفتہ شین صاحبہ کا سفر نامہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ایسا لگا کہ ہم ہی سفر کر رہے ہیں۔ عذرا فر دوس صلیب کی کہانی ”مکافات عمل“ واقعی بہت اچھی ہے۔ آج کل لوگ یہ بات نہیں سمجھ رہے ہیں کہ جو جیسا بونے گا ویسا کاٹے گا۔ سلیم اختر صاحب کی کہانی ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ ایک نہایت اور جوش جذبے سانی والی تھی جس کا جذبہ پاکستان کے لیے بہت شاندار تھا۔ راجہ محمود صاحب نے ”ان بچی یادیں“ سلیم ناصر صاحب کے بارے میں لکھا۔ ان کے بارے میں پڑھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ سدرہ انور اور شبنام زکی خیال آرائی بہت مہلک لطف ہوتی ہے۔ میری طرف سے تمام لکھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو۔“
✍ اچھی۔ جی۔ مہک شیخ! دل کی گہرائیوں سے ”احوال“ کی محفل میں خوش آمدید۔ آئندہ بھی تمہارے خط کا انتظار رہے گا..... اپنی بہن فرحانہ کو سلام اور دعا دیجیے گا۔

✍ قیصر پرویز راجپوت، R.J. سولر ایف ایم جیک آباد سے۔ محترم ناصر رضا السلام علیکم! یہ خط میں نے آپ کو اشاعت کے لیے نہیں بلکہ آپ کی عیادت کے لیے لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی بہن کے لیے جو لکھ دو رب کی کیفیت میں مستغرق ہو کر لکھی تھی وہ آپ نے شائع کی اور میں نے پڑھی تو مجھے یوں لگا گویا اس کے قبر کی نم مٹی پھر سے میری سانپوں میں مہک گئی ہے۔ میں نے پہلی بار ہی کوئی تحریر بھیجی اور آپ نے اسی ماہ شائع کر کے میرا مان رکھ لیا۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ کے توسط سے مجھے اس پرچے سے ملنے لگا وہ لکھا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میں نے یہ جرأت کی ہے۔ بہر حال کہانیاں سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن میں اپنی پیشہ وارانہ مصروفیت اور سولر ایف ایم 98 ریڈیو جیک آباد کے پروگرام کی وجہ سے اتنا وقت نہیں نکال پاتا تھا مگر اب میں ادب کے بہت فریب آ گیا ہوں کیونکہ کسی اچھے ادیب کی صحبت ادب کی طرف ملقت کرتی ہے سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا اور اب پروفیسر صفیہ صاحبہ کی نصف لائبریری میرے گھر منتقل ہو چکی ہے۔ میرے جن ساتھیوں نے اس لکھ کو پروگرام میں اور اب اس پرچے میں اشاعت پر مجھے فون کیے، سچ کیے میں تہہ دل سے ان سب کا شکر گزار ہوں۔ (خط شائع کریں گے تو خوشی ہوگی)۔“
✍ قیصر پرویز راجپوت صاحب! آپ کا ”نچی کہانیاں“ میں ”احوال“ کی محفل سے رشتہ جوڑنا ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔

✉ صفیہ سلطانہ مغل جبک آباد سے۔

ٹھنڈی ہوائیں کیا چلیں، میرے شہر میں
ہر طرف یادوں کا دبیر چھا گیا
محترم ناصر صاحب السلام علیکم سال نو مبارک۔ اس بار شاید سب سے پہلے نئے سورج کے نئے دن کے ساتھ ایک
یادوں کی کرن لے کر میں ہی آئی ہوں دردل وا ہے تو دروازہ کھولے

آؤ دبیر کی دھوپ میں کچھ دیر بیٹھ لیں
شاید یہ فرستیں نہ اگلے سال ملیں

جب بھی نئے سال کی آمد ہوتی ہے تو یکم جنوری کی آمد ہی میرے لیے سوچ کا ایک دروازہ اپنی ذات کے لیے ایک
”سکینڈ بے در“ میں درکھوتی ہے۔ شاید کوئی دن ہوتا تو میں اس سانچے کو (اپنی سالگرہ کے) بھلا بھی دیتی مگر ہر طرف دبیر
کی الوداع اور جنوری کو خوشی رہا کہنا، میرے زخموں کے کھر بڑا تار پھینکتا ہے۔ بہر حال دوسری جانب جب اپنی ذات کے
گنبد سے نکلوں تو پھر ملک کے حالات، وحشت، بربریت، دہشت گردی، غربت، افلاس، رشوت ستانی۔ ان کے ناگ
پھن اٹھائے لپک رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ پورا سال ڈستے ہیں۔ خدا جانے ہم کب ان خود کردہ مسائل سے آزاد ہوں
گے۔ کب ہمارے ملک کے مزدوروں کو وقت کی روٹی ملے گی۔ کب غریب کے تن پر کپڑا اچھے گا۔ کب دہقان کی بیٹی بیاہی
جائے گی۔ ناصر جی! یہ احساس بھی اندر سے کوڑے مارتا ہے کہ ہم کب تک اپنے دکھوں، اپنے غموں پر ماتم کنناں رہیں
گئے۔ ہم جو خود انسانیت کا پرچار کرتے ہیں کیا بھی ہم نے کسی کے آس پونچھے..... کیا کسی کی بھوک مٹائی..... کیا برائی کا قلع
قبع کرنے کی سعی کی..... ہم کیوں امداد دینی کے منتظر ہیں؟؟ یہ سب برائی کے عناصر جو من حیث القوم ہم میں پنپ رہے
ہیں۔ انہیں دور کرنے ان کی سنجائی کی بجائے ان کے لیے ہم آسان سے فرشتوں کے نزل کا انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ دوستو!
ہمارا الیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے گریبان میں جھانکنا چھوڑ دیا ہے

تم جو بھی لکھو نامہ اعمال فرشتو!

آخر میں میرے دور کے حالات بھی لکھو

لب ہی دیے تو بول پڑیں عبارتیں

کاغذ جلا دیئے تو قلم بولنے لگے

”کئی کہانیاں“ کے عمدہ حسن انتظام کی بدولت پرچہ 29 نومبر کی شب کی ایک دل کش صبح کو مل گیا تھا۔ ”حوال“ سے
جب آگے بڑھے تو شوق مطالعہ اور تجسس نے قدم جکڑ لیے۔ گفتہ فون پر پہلے ہی ”حوال چند“ سنا چکی تھیں۔ لہذا سب
سے پہلے اپنی پیاری دوست گفتہ کا سفر نامہ پڑھا۔ اس ادبی سفر میں ہی نہیں لگا، کہ اس بیٹی سفر میں بھی ان کے ساتھ ہیں۔
ہر منظر جوان کی آنکھ نے دیکھا، بہ بین ہم نے وہی محسوس کیا۔ ہائے اس وقت یہ آنکھیں مستنصر حسین تارڑ کو ہی ”وان“
کر دیتے تو آج ہم کہاں کہاں کی سیر کر چکے ہوتے۔ چلو فیرواں تو گفتہ جی! بہت اچھا لگا بہت خوب یہ قصیدہ ہم تمہیں
فون پر سنائیں گے اگلی قدم کا شہادت سے انتظار ہے۔ آصف اقبال بلوچ کا انٹرویو بھی اچھا لگا۔ صد شکر کہ تمہاری سخی کو صلاح
اچھا گیا مگر اس کے باوجود تمہاری تحریروں میں تم و عشوہ بہت ہے..... کیوں ڈیئر.....؟ اللہ تعالیٰ تمہیں مزید کامرانیاں اور
کامیابیاں عطا کرے۔ ارم زہرا! ”میں قائل ہوں“ بہت خوب صورت تحریر، بہت اثر انگیز، فکر انگیز اور بحر انگیز تمہارا قلم
آج کل جولا نیوں پر ہے۔ طبیعت کی اور تحریر کی یہ جولانی ہمیشہ سرگرمی میں رہے۔ مینا تاج بہت نایاب تحفے کے ساتھ
حاضر ہیں۔ بہت خوب تم نے کہانی کا حق ادا کر دیا۔

تو تو کہتا تھا کہ ہوتی ہے ہوا پانی میں

بس یہی سوچ کے میں کوڈ پڑا پانی میں

رات گئے جھیل یہ تم یہ کسے ڈھونڈتے ہو

کیا تمہارا بھی کوئی ڈوب گیا پانی میں

محمد عزیز کی کہانی نے ہمیں بھی ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے برآمدے میں لاکھڑا کیا۔ جہاں سے میری بھی بہت سی دلکش یادیں (بشمول 7 اکتوبر) وابستہ ہیں۔ ریڈیو حیدرآباد نے پاکستانی میڈیا کو، اسٹیج، ٹی وی اور فلم کو بہت اچھے فنکار دیے لہذا یقین کریں کہ میں خود اس کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی۔ یہاں کے دروہام میری ہر آہٹ اور ہر مسکراہٹ سے آشنا ہیں۔ جیورڈیو، حیدرآباد۔ بہت پر اثر اور قطعی مختلف انداز کی کہانی۔ مصنف کی زبانی واہ جنتاب۔

اس کی آواز میں کس نے ہے پکارا مجھ کو

تمہی ساحل پر رہو میں تو چلا پانی میں

فارحہ شاید یہ تمہاری پہلی کہانی تھی۔ بہر حال خدا کرے کہ تمہارے یہ حوصلے یونہی جوان رہیں اور اس قبیل کی عمدہ کہانیوں سے ہمیں نوازی رہو۔ فیہم جی! آپ کا خط بہت ہی اچھا تھا اتنا عمدہ، پر اثر خط لکھنے پر مبارک باد۔ آپ کی یہ بات اچھی لگی کہ روڈ ٹو گولڈ، صدائے بازگشت کے عنوان سے اگر صفحہ شخص کر دیا جائے تو پرانے سماجی اس صدا پر لوٹ آئیں گے۔ ناصر صاحب کی بات بھی بجائے مگر آپ کی بات دل کو لگی کہ پرانے ساتھیوں کو تو محبت کی ڈور سے باندھ رکھنا اور بھی ضروری ہے۔ امریکی جبریت، بربریت اور دہشت کے نام پر جو سارے وطن کے نو جوان فوجی شہید ہوئے امریکہ کو صرف افسوس ہوا۔ پاکستان تحقیقات کرے گا۔ عوام دو چار دن احتجاج کرے گی اور بس.....!! راوی چین کی بانسری بجائے گا اے خدا تو رحم کر اس قوم پر جو اب خود پر بھی رحم نہیں کر سکتی۔ سلام ان شہداء کو جن کے لبوں کی آبیاری سے پاکستان مشکبار ہے۔ خراج عقیدت اور ایک شعر

جب تک نہ جلیں دیپ شہیدوں کے لبوں سے

کہتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہو گا

بھو صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ! آپ نے جو لکھا وہ ہم نے دل کی آنکھوں سے پڑھا..... بہت ہی ”خاص بات“ عام سے انداز میں کہتے اور لکھتے کا ہنر آپ خوب جانتی ہیں۔

☒ ستر شرین اور بیس کراچی سے۔ ”ناصر صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری طبیعت کافی عرصے سے ناساز چل رہی ہے۔ اسی وجہ سے بہت دنوں کے بعد یہ دو کہانیاں بھیج رہی ہوں۔ ”جی کہانیاں“ ایک بہترین رسالہ ہے۔ تمام کہانیاں دل چھو لیتی ہیں۔ اللہ آپ کے رسالے کو اور ترقی دے اور ہم جیسے پریشان حال لوگوں کی کہانیاں پڑھ کر دوسروں کو اللہ کا شکر ادا کرنے کا موقع ملے، آمین۔ یہ دونوں کہانیاں جی ہیں ایک کہانی میری والدہ مرحومہ سرور زانی کی ہے جو بظاہر برداشت کرتے کرتے اللہ کو پیاری ہو گئیں اور دوسرے میرے ماموں کے لڑکے کا مصم اور ایک ٹی وی چینل کی اسکرپٹ لکھی کی ہے۔“

☒ ستر شرین اور بیس صاحبہ! ہم دل کی گہرائیوں سے آپ کی صحت بھری زندگی کے لیے دعا گو ہیں آپ کی دو کہانیوں میں سے ایک انتشاء اللہ شمارہ فروری میں شامل ہوگی۔

☒ کوثر سعید لاہور سے۔ ”ناصر رضا بھائی السلام علیکم! کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد ”احوال“ میں حاضر ہوں۔ اب دیکھتے ہیں کہ آپ ہماری حاضری قبول کرتے ہیں یا نہیں مگر میں اس سال کا آخری شمارہ دسمبر پڑھنے کے بعد خط لکھ رہی ہوں اور نئے سال کے پہلے پرچے میں بھی حاضر ہونا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ یہ نیا سال ہمارے اور آپ سب کے لیے بھی ڈھیر ساری خوشیاں، خفیں اور چاہتیں و خلوص اخلاق لے کر آئے گا، آمین۔ اور جو لوگ آپس میں ناراض ہیں وہ بھی ناراضی وغیرہ ختم کریں گے۔“

☒ اچھی بہن کوثر سعید! آپ کی ایک بار پھر ”احوال“ میں آمد ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ آئندہ بھی آپ کا انتظار رہے گا۔

☒ تجیل میلو کراچی سے۔ ”محترم رضا بھائی السلام علیکم! بھائی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری کہانی دسمبر کے ”جی کہانیاں“ میں شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ایک اعزاز بخشا۔ بھیا میری خوشی کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی سارے ادارے والوں کی مہربانی جن سب کے تعاون سے یہ سب ممکن ہوا خدا

سب کو بہت بہت خوش رکھے۔ مجھے امید ہے پڑھنے والے بھی مجھے ”چچی کہانیاں“ میں خوش آمدید کہیں گے اور میری کہانی انہیں بھی پسند آئے گی۔ باقی رسالے میں صبیحہ شاہ کی ”موسم کا گھر“، سمجھانیاں کی ”باقی ہے ابھی“، محمد عزیز کی ”نقش پا“ اور اس کے علاوہ سب کی شاعری پسند آئی۔ سلسلے بھی سب ہی خوب ہیں۔ ”خیال آرائی“ بہترین کاوش ہے۔

بھ اچھی بہن نیگل مینلو! شکریہ کیا؟ ”چچی کہانیاں“ آپ کا اپنا نامہ ہے آپ نئی کہانی کب ارسال کر رہی ہیں؟

✉ ایم سعید انور سعید، شاد باغ لاہور سے۔ ”اچھے ناصر بھائی! السلام علیکم کے بعد دعا ہے کہ ماہنامہ ”چچی کہانیاں“ کے دوست و تمام قارئین کرام اور آپ سمیت تمام اشاف کو زندگی میں صحت، کامیابی اور کامرانی حاصل ہو۔ خوب صورت ٹائٹل اور بہترین کہانیاں سے سجا شہارہ دیکر پڑھا۔ شمارے کی جتنی تحریف کی جائے کہ ہے۔ تمام کی تمام کہانیاں بہت ہی پسند آئیں ویسے بھائی ”چچی کہانیاں“ دیکھ کر اور پڑھ کر جتنی خوشی ہمیں ہوئی ہے اس کا اندازہ آپ نہیں لگ سکتے مگر اس میں اپنی کوئی خرابی و غلط و غیرہ شامل نہ ہونے پر جتنا دکھ نہیں ہوتا ہے اس کا بھی آپ اندازہ نہیں کر سکتے، اسی لیے تو ہم نے اتنا عرصہ خط نہ لکھ کر دل پر بہت جبر اور صبر کیا ہوا تھا مگر اس ماہ دسمبر کے شمارے میں فہیم بھائی نے ہم دوستوں کو آواز دی ہے۔ اس آواز کے ساتھ ساتھ ہم تو اس محفل میں حاضر ہو گئے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہماری حاضری سے اور بھی بہت سارے دوست حاضری ضرور لگوائیں گے اور ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے اور ویکلم ضرور کریں گے۔“

بھ اچھے بھائی، ایم سعید انور سعید! ویکلم ویکلم ویکلم..... کے ساتھ یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ..... جب آپ کا خط ہمیں ملے گا ہی نہیں یا پھر بہت تاخیر سے آئے گا تو..... ہم اسے بھلا شامل اشاعت کیسے کریں گے؟

✉ صائمہ کراچی سے۔ ”ناصر انکل آداب! میں آپ کی دل سے بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری کاوشوں کو ”چچی کہانیاں“ میں جگہ دی۔ ”چچی کہانیاں“ کا ہر ایک سلسلہ گوہر نایاب ہے۔ تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی ہوں لیکن سرورق سے لے کر بازگشت تک میں ”چچی کہانیاں“ کی دیوانی ہوں۔ ایک کہانی اور نظم ارسال کر رہی ہوں اگر مناسب لگے تو کسی قریبی شمارے میں لگا دیجئے گا۔ اب اجازت تمام پڑھنے والوں کو سلام اور سال نو کی مبارک باد۔“

بھ اچھی چچی صائمہ کراچی! تمہاری کہانی اچھی ہے جلد ”چچی کہانیاں“ کے صفحات پر سجے گی۔

✉ فیضان عثمانی حیدر آباد سے۔ ”محترم ناصر بھائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ آپ نے ”میری کہانی میری زبان“ کے لیے مجھ ناچیز کو لکھنے کا کہا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا آپ کا کہنا مانتے ہوئے میں نے دودن میں اپنی زندگی کی کہانی لکھ ڈالی ہے۔ میں اپنے ان دوستوں کا بہت بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ”احوال“ کے ذریعے میرے بیٹے کی پیدائش کی مبارک باد دی۔ ”احوال“ کا آغاز کاشی کی ”دعائے سال نو“ سے بہت اچھا لگا۔ عکاشہ سحر ایمان ماشاء اللہ کتابوں پر تبصرے والی ذمہ داری بہت حس و خوبی بھاری ہیں۔ ہماری پرانی لکھاری راجیلہ روٹی مدثر کا ”چچی کہانیاں“ میں آنا باعث مسرت ہے۔ میں خود کاشی کی عمر سے کے بعد ”احوال“ میں آ رہی ہوں مگر ”احوال“ میں دوستوں کے خطوط ہر ماہ پڑھتا ضرور ہوں۔ مجھے نیگل انکل کے خطوط خاص کر کے پڑھتا ہوں اور ان کے خطوط پڑھ کر مجھے بے ساختہ مرحوم محترم حیدر کا شری یاد آ جاتے ہیں کیونکہ فہیم انکل کے الفاظ میں ان کے خطوط کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس بار ”احوال“ کے لیے صرف اتنا ہی آئندہ مکمل تبصرے کے ساتھ آنے کی کوشش کروں گا۔“

بھ اچھے بھائی فیضان عثمانی! ہماری دعا ہے کہ آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں۔

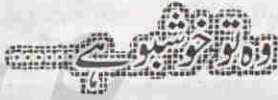
✉ فرحت جمال کراچی سے۔ ”ناصر بھائی! السلام علیکم! بہت ساری دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ حاضر ہوں۔ نئے سال کی آمد آمد ہے۔ ڈھیر ساری دعائیں اس آنے والے سال کے لیے اللہ تعالیٰ امن و سکون کی فضا قائم رکھے۔ ناصر بھائی! ”چچی کہانیاں“ نے تو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ بے حد شاندار شمارہ ہے۔ کاشی چوہان کی خوب صورت شاعری کے ساتھ ”احوال“ کا آغاز کیا۔ اس شاعری نے ”احوال“ کو چار چاند لگا دیئے۔ منزہ جی نے اپنے ادارے میں درست کہا کہ ہم

دعا کے تمام حقوق بھول کر بس اپنا حق مانگتے لگے ہیں۔ ”احوال“ میں سب ہی اپنی اپنی بات بہت خوب صورتی سے کرتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ شکر یہ کہوں گی ان سب بڑھنے والوں کا جنہیں میری شاعری اور خطوط پسند آتے ہیں۔ ”آن کہی یادیں“ سلیم ناصر کے بارے میں پڑھ کر بہت خوش ہوئی وہ آج بھی دلوں میں زندہ ہیں۔ ڈرامے تو سب ہی زیر دست رہے لیکن ”آنگن ٹڑھا“، ”دستک“ اور ”آن کہی“ کو تو آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔ ”باقی ہے ابھی رنگ“ کیا برا تھا مرنا، ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ آزادی پر لکھی بہترین کہانیاں لگیں لیکن جو کچھ ہمارے پیارے وطن میں ہو رہا ہے وہ کیا ہے؟ پوری چکاری، ڈاکہ زنی، انسانیت تو جیسے میر کر رہ گئی ہے۔ قبروں کی بے حرمتی، بربریت کا بازار گرم ہے اسی لیے ہمارے بزرگوں نے اپنی جان مال کی قربانیاں دی ہیں۔ لگتا ہے انسان آج درندوں کی صف میں اکٹھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔ صبیحہ شاہ کی کہانی ”موم کا گھر“ محمد عزیز کی کہانی ”وہ نقش پا.....“ ملک صفدر عباس کی کہانی ”کینن نمبر 105“ بہت اچھی لگیں۔ ”کیا ستم ہے“، ”سونے سے مہنگا نانا“ کہانیاں بہتر لگیں۔ مینا تاج کی کہانی ”پرچھائیاں جواں رہیں“ حوصلے مند عورت پر لکھی اچھی لگی۔ محمد اسلم کی کہانی ”ہوس کے غلام“ خوب تھی۔ نعیم حبیب کی کہانی ”دعا کے ہاتھ نہیں رہے“ پڑھ کر مجھے اپنی اُمید آنے لگیں۔ مینا عالیہ کی کہانی ”خواہشوں کا جنگل“ اچھی لگی۔ قناعت تو جیسے ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ مسرت گیلانی ”عمر کا نی جیسے سزا“ بہترین کہانی تھی۔ ”مکافات عمل“ عذرا فردوس کی کہانی اچھی تھی۔ سدرہ انور علی کی کہانی ”یہ فتنہ ہے“ آج کے معاشرے کا بدترین البہ! ”زندگی سے گزر کر“ جاوید عثمان کی کہانی اچھی لگی۔ ”شجر ممنوعہ“ نسreen رانا کی کہانی اچھی لگی۔ ارم زہرا ”ہاں میں قاتل ہوں“ خوب رہی۔ شگفتہ ”کراچی سے کینیڈا تک“ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آصفہ اقبال بلوچ کی ”زندگی لکھ رہی ہوں“ پڑھ کر اچھا لگا۔ ”تاشون“ اور ”گھاسل آتما“ سلسلے تو بہت ہی خوب ہیں۔ شاعری ہمیشہ کی طرح لا جواب ہے۔ شگفتہ شفیق کا سفر نامہ اور شاعری پسند آئی۔ ناصر بھائی! انشاء اللہ بہت جلد اپنی کہانی ارسال کروں گی۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کے ساتھ خیر کا معاملہ رکھے، آمین۔“

کچھ اچھی بہن فرحت جمال! آپ کی کہانی کا انتظار ہے..... ”کچی کہانیاں“ آپ کو پسند آ رہا ہے یہ جان کر دل شاد اور آباد ہو گیا۔

✉ وفا صد ام حسین غازی، حیدر آباد سے۔ ”ناصر رضا صاحب! اللہ رب العزت آپ کو اور ”کچی کہانیاں“ کی پوری ٹیم کو خوش اور شاد و آباد رکھے۔ ”کچی کہانیاں“ شمارہ دسمبر ملا، سرورق پر ماڈل کے ساتھ سلیم ناصر کی تصویر دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔ ”احوال“ میں ساتھیوں کے خط پڑھے۔ منزہ بہام کا ادارہ ”حق“ بہت اچھا لگا۔ ”زندہ کہانی“ میں راجہ محمود کے قلم سے ”آن کہی یادیں“ سلیم ناصر کے بارے میں پڑھ کر بہت خوش ہوئی اور معلومات میں اضافہ ہوا..... خصوصی کہانیوں میں نمبر (ر) امتیاز حسین کے قلم سے ”باقی ہے ابھی رنگ“ یہ بتاتی ہے کہ ہمارے بزرگوں، مہاجرین بھائیوں نے آزادی کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ صبیحہ شاہ کے قلم سے ”موم کا گھر“ بہت اچھی کہانی تھی۔ محمد عزیز کے قلم سے ”وہ نقش پا میں خاک پا“ میں ایک استاد کے لیے ایک شاگرد کی محبت نظر آتی ہے۔ ایسے شاگرد بہت کم ہی ہوتے ہیں۔ محمد رضوان نیوم کے قلم سے ”کیا برا تھا مرنا“ بڑی درد بھری داستان تھی۔ ملک صفدر عباس اعوان کے قلم سے ”کینن نمبر 105“ بہت دلچسپ اور حیرت بھری کہانی تھی۔ جیل مینٹو کے قلم سے ”کیا ستم ہے“ پسند آئی۔ مس منزل خان کے قلم سے ”سونے سے مہنگا نانا“ اچھی سبق آموز روداد تھی۔ مینا تاج کے قلم سے ”پرچھائیاں ہمارا ہی تھیں“ بڑی پیاری کہانی تھی اس سے ظاہر ہوا کہ محبت مرنے نہیں۔ محمد سلیم اختر کے قلم سے ”پھر وہ زندہ ہو گیا“ ایک بہترین کہانی تھی۔ فارحہ کے قلم سے ”گر حوصلے جواں رہیں“ بڑی اچھی کہانی تھی۔ ایسا صبر کرنے والی بہت کم عورتیں ہوتی ہیں۔ محمد اسلم آزاد ”ہوس کے غلام“ بڑی سبق آموز کہانی تھی۔ نعیم حبیب کے قلم سے ”دعا کے ہاتھ نہیں رہے“ ماں کی محبت سے بھری اچھی کہانی تھی۔ مینا عالیہ کے قلم سے ”خواہشوں کا جنگل“ اچھی کہانی تھی۔ مسرت گیلانی کے قلم سے ”عمر کا نی جیسے سزا“ ایک درد بھری روداد تھی۔ عذرا فردوس کے قلم ”مکافات عمل“ نے حیرت زدہ کر دیا۔ موبائل کہانیاں میں سدرہ انور علی کے قلم سے ”یہ فتنہ ہے“ تو جواں لڑکوں کے لیے عبرت بھری کہانی تھی۔ پراسرار کہانیوں میں جاوید عثمان زندانی کے

راجہ محمود



سید شا کر حسین کا خیال

کتنی نادیدہ تہنوں کی حسرت لے کر
چاند ہر روز اندھیروں سے گزر جاتا ہے

رجان ساز شاعرہ پروین شاکر کی زیست کے چند اوراق نذر قارئین



قلم سے ”زندگی سے گزر کر“ بڑی پیاری کہانی تھی۔ پہلی بار کسی کہانی نے رلا دیا۔ نرسین رانا کے قلم سے ”شجر ممنوعہ“ واقعی ناقابل یقین مگر دلچسپ کہانی تھی۔ ارم زہرا کے قلم سے ”ہاں میں قاتل ہوں“ عجیب امتوز کہانی تھی۔ باجی شگفتہ شفیق کے قلم سے ”کراچی سے کینڈا تک“ سفر نامہ بہت اچھا لگا۔ آصفہ اقبال بلوچ کے قلم سے ”زندگی لکھ رہی ہوں“ پڑھ کر پہلے دکھ ہوا اور آخر میں خوشی ہوئی۔ باجی آصفہ اللہ آپ کو خوش رکھے شاد آباد رکھے، آمین۔ ”آپ کی ڈائری“ بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ ”خیال آرائی“ کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ عکاشہ خرنے احمد و قاص کی کتاب پر بہت اچھا تبصرہ کیا۔ ”پہنڈ اپنی اپنی“ پسند آئی۔ مختصر یہ کہ دبیر کا پرچہ بہت اچھا رہا اور اب شدت سے جنوری کے پرچے کا انتظار ہے۔ ناصر رضا صاحب! میں ایک اور کہانی روانہ کر رہا ہوں اگر اچھی ہو تو ضرور شائع کر دیجیے گا۔ اگر چھپنے کے لائق نہ بھی ہو تو مجھے ”احوال“ میں ہی آگاہ کر دیجیے گا۔ میں اور اچھا لکھنے کی کوشش کروں گا۔

بہر و قاصدام حسین بخاری صاحب! آپ کی کہانی اچھی، قابل اشاعت ہے۔ لیکن آپ اس اچھی خبر کے باوجود اچھا لکھنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھیے گا۔

اس ماہ کا خصوصی خط

✉ اشعر جواد کراچی سے۔ ”ناصر بھائی سلام اور سلامتی کی دعا! آپ کو تمام قارئین اور لکھاری دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ دوڑتی بھاگتی زندگی کے ساتھ وقت کا کھیل جاری ہے۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔ اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ سب اپنی اپنی زندگی کا حساب دینے میں مصروف ہیں۔ وقت اور حالات نے ہر چہرہ اور منظر بدل دیا ہے۔ لوگوں کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ ایسے میں یہ سوال۔ یہ رونا کہ۔ ”سچی کہانیاں“ میں کل کون تھا۔ آج کون نہیں ہے؟ اب بہت بے معنی سا سوال لگنے لگا ہے۔ سب کے اپنے اپنے مسئلے اور معاملات ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی آپ کے لیے وقت نکال کر لکھ رہا ہے۔ ڈاک کا خرچہ برداشت کر رہا ہے۔ تو بس اس کی قدر کریں۔ اسے ”سچی کہانیاں“ کے صفحات پر عزت اور مقام دیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ۔ ہمارا ”کل“ اور ”کل“ کے لوگ بہت پیارے اور معتبر تھے۔ لیکن آج کے حالات نے سب کو وہ مار لگائی ہے کہ۔ بقول محسن نقوی

کس کی شب بے ملال کتنی ہے؟

کس کا دن چھین سے گزرتا ہے؟

مل گئے ہو تو مسکرا کے ملو!

کون پھر کس کو یاد کرتا ہے؟

بھ اچھے بھائی اشعر! تم نے جو لکھا ہے۔ وہ بہت خاص، بہت اندر کی بات ہے۔ سودل سے مکالمہ کر گئی ہے۔ مرحوم محسن بھوپالی صاحب نے۔ شاید ایسے ہی کسی معاملے۔ یا وقت کے لیے کہا ہے

بات بین السطور ہوتی ہے

شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

(نوٹ: ان محترم قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل ”احوال“ نہ ہو سکے۔ شوق شکی، یالکوٹ۔ مور شاہد و قاسم، کراچی۔ شیر حسین زیدی، کراچی۔ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور۔

ادرا اب اجازت
پھر ملیں گے گر خدا لایا
ناصر رضا

سر سید کالج میں بیت بازی کا مقابلہ عروج پر تھا۔ حاضرین خوبصورت شعروں سے محظوظ ہو رہے تھے اور ہر اچھے شعر پر داد دے رہے تھے۔ حاضرین کی تمام تر توجہ مقابلہ کرنے والی بیویوں پر تھی تاہم ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو پورے انہماک سے پروگرام کی میزبانی کرنے والی لڑکی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس شخص کا تعلق ریڈیو سے تھا اور اس کی جو ہر شاس نظروں نے پروگرام کی کپیئرنگ کرنے والی لڑکی میں چھپی صلاحیتیں بھانپ لی تھیں۔ اس شخص کو ریڈیو کے لیے سٹینٹ کی تلاش تھی۔ پروگرام کے دوران اس نے لڑکی کے پاس چٹ لکھ کر بھیجی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ چٹ پڑھ کر لڑکی خوش ہو گئی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریڈیو سے تعلق رکھنے والے اتنے بڑے نام نے اس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ پروگرام کے بعد لڑکی اس سے ملی تو اس شخص نے اسے ریڈیو پر پروگرام کرنے کی پیشکش کر دی۔ یہ بات سن کر لڑکی خوشی سے اچھل پڑی اور پھر یوم آزادی کے موقع پر اس لڑکی نے شاعرہ کی حیثیت سے اپنا پہلا پروگرام پیش کیا۔ ریڈیو پر اس کی مدھر آواز ہواؤں کے دوش پر لوگوں کی سماعتوں تک پہنچی تو سب ہی نے زندگی سے بھرپور اس آواز کو سراہا اور یوں اس کا رشتہ ریڈیو سے جڑ گیا اور وہ سات برس تک ریڈیو پر سامعین کی سماعتوں کو محظوظ کرنے کے



پروین شاکر اپنے مخصوص انداز میں شاعرہ پڑھتے ہوئے

سامان مہیا کرنے لگی۔ اس لڑکی نے نہ صرف ریڈیو پر نظامت کی بلکہ اس نے ہر قسم کے پروگرامز کیے جن میں ڈرامہ نگاری، نئوز ریلیٹنگ، اناؤنسمنٹ اور جشن موسیقی میں آواز کا جادو جگانا بھی شامل ہے۔ ریڈیو پر اپنی صلاحیتوں سے چھا جانے والی وہ لڑکی پروین شاکر تھی جبکہ سابق اسٹیشن ڈائریکٹر کراچی یاور مہدی وہ شخصیت تھے جنہوں نے پروین شاکر عرف پارہ کو ریڈیو پر متعارف کروایا۔ یاور صاحب نے بے شمار جوانوں کو ریڈیو پر متعارف کروایا اور پروین ان کی قابل فخر دریافت میں سے ایک تھی۔

۲۲ صفر ۱۳۷۳ء ہجری بروز سوموار 24 نومبر 1952ء کو کراچی کے لیڈی ڈفرن ہسپتال میں ڈیزی کے پھولوں کی رنگت والی پیاری سی بچی نے اس بے ثبات دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اس کی ماں نیگم افضل النساء اپنے وجود کے اس ننھے حصے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ یہ ان کی دوسری اولاد تھی۔ بچی کے والد سید شاکر حسین ہر ایک سے مبارک باد وصول کر رہے تھے۔ بچی کی روشن پیشانی کو دیکھ کر ماں نے اس کا نام ایک ستارے کے نام پر رکھا۔

پروین کو گھر میں سب پارہ کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی بچی تھیں خود پارہ کا رجحان ماں اور کتاب کے بعد جس شخصیت کی طرف سب سے زیادہ تھا وہ اس کے نانا سید حسن عسکری عظیم

آبادی تھے کوکہ والد سید شاکر حسین بھی اپنے وقت کے بہترین شاعر تھے تاہم نانا کا علم و ادب سے تعلق بالکل الگ ہی تھا۔ پارہ بچپن ہی سے شرارتی اور ذہین تھی پہلا پلن اس کی شخصیت کا حصہ تھا، چھلا بیٹھنا تو اسے آتا ہی نہ تھا شاید اس کی مضطرب مزاجی کی وجہ سے ہی اسے پارہ کہا جاتا تھا۔ وہ شرارتی تو تھی مگر بدتمیز نہیں۔ اس نے ہمیشہ بڑوں کا احترام کیا تاہم بچپن کی تصویروں میں وہ انتہائی خاموش طبع اور مجیدہ سی بچی دکھائی دیتی ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ تمام عزیز رشتے داروں میں اپنی شرارتوں کے حوالے سے مشہور تھی۔ اس کے نانا حسن عسکری کہا کرتے تھے۔

”پارہ جہاں جاتی ہے وہاں زلزلہ آ جاتا ہے۔“ مطلب کہ اس کی شرارتوں سے لوگ پناہ مانگتے تھے۔ اس کے نانا نے پروین کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

پروین کو علم و ادب سے محبت جیسے گھٹی میں ملی تھی۔ علم سے اس کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے بڑی بہن کو اسکول جاتا دیکھ کر خود بھی اسکول پہنچ جایا کرتی تھی حالانکہ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسی اسکول جانے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ اس کا تعلیمی سلسلہ ۳ شعبان ۱۳۷۶ء ہجری بمطابق ۱۹۵۵ء کو شروع ہوا۔

حضرت امام حسینؑ کے یوم ولادت کے موقع پر ۱۱۱۱ ہجری سے پروین کی کتب کروائی گئی اور یوں اس کے علمی سفر کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آج تین برس کی جو بچی علم کی راہ پر اپنے سفر کی ابتدا کر رہی ہے اس کا علم کسے کیسے اعزازات، کس کس مقام پر اس کے لیے اہم ہندے منتظر کھڑے ہیں۔

اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں اس نے تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی تاہم اپنی خدا داد ذہانت کے باعث دہری ترقی پا کر بہن کے ساتھ پانچویں جماعت میں داخل ہوئی۔ اسلامیہ اسکول کچھ عرصے بعد بند ہو گیا یوں دونوں بہنوں کو رضویہ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول میں پروین کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے آٹھویں جماعت سے وظیفہ حاصل کرنا شروع کر دیے اور یہ سلسلہ ایم پی اے تک جاری رہا۔ اس کے بچپن کے دوستوں میں شاہدہ حسن اور فردوس فاطمہ کا نام نمایاں ہے جسے وہ پیار سے دوشی کہا کرتی تھیں۔ دونوں سہیلیوں کا شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور دونوں ہی بیت بازی اور مباحثوں میں انعامات جیت کر لاتی تھیں۔ بچپن میں اسے کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے دن یا رات کی کوئی شخصیت نہیں تھی، کسی بھی وقت وہ کہانی کی فرمائش کر دیتی اور نانا حسن عسکری صاحب کو کہانی سنانا ہی پڑتی تھی حالانکہ دن کے وقت وہ سمجھاتے کہ بی بی.....! دن کو کہانیاں سننے والے راستہ بھول جایا کرتے ہیں مگر پارہ پھر پارہ تھی اسے اپنی ضد منوا کر ہی چین ملتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ایک روز وہ خود بھی کہانی بن جائے گی ایک ایسی کہانی جو دکھ و الم سے گندمی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے اس کا تعلق sagittarius یعنی برج قوس تھا۔ اسی لحاظ سے وہ خاصی شوخ بھی تھی۔ تقریبات اور مجالس میں اہتمام سے جاتی تھی۔ اسے مجالس پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ اس کی پسندیدہ ڈاکرہ بول ترابی تھیں۔

پارہ کو جانوروں سے بھی محبت تھی ٹوٹو نامی بلا اس نے پال رکھا تھا جو صرف اسی کے ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ وہ بلا آٹھ برس تک اس کے ساتھ رہا اور جب 1978ء میں اس بلی کی موت ہوئی تو وہ بہت

دن تک اداس رہی تھی۔

قربانی کے جانور بھی اسے بے حد پسند تھے۔ وہ اُن کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا کرتی تھی۔ تتلیاں بھی اس کی کمزوری تھیں۔ ایک بار جب وہ بھارت گئی تھی تو منصب و جاہ کے باوجود وہ تتلیاں خریدنے کی خواہش کو دبا نہیں سکی۔ پلاسٹک کی تتلیاں اس کے دل کو اس قدر بھانگیں کہ انہیں پا کر وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح خوشی

سے ہوئی جہاں سے اس نے انٹر کیا تھا۔

ایک دن اس کی استاد محترمہ عرفانہ عزیز نے اسے یوم دفاع پر نظم لکھنے کو کہا تو اس نے لکھ دی۔ اس حوالے سے اس کا کہنا تھا کہ استاد کے کہنے پر میں خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھ گئی اور نظم ہو گئی جسے میں نے اپنے نانا حسن عسکری کے سامنے رکھ دی۔
”نانا.....! اب میں نے نظم لکھی ہے۔“
”اچھا ایسا کرو میری آنکھوں پر ہاتھ رکھو اور نظم



”تین تین پروین شاعر اسکول میں ایوارڈ دیتے ہوئے“

سے نہال ہو گئی تھی۔

شاعری سے اس کا رشتہ اسکول کے زمانے سے ہی جڑ گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ میرا نہیں اور دبیر کو شوق سے پڑھتی تھی۔ اسی مطالعے نے اسے اساتذہ کی نظروں میں اچھی طالبہ کی حیثیت سے آشنا کر دیا۔ وہ جب آٹھویں کلاس میں تھی تو استادوں نے اسے مستقبل کی شاعرہ اور ادیبہ کہنا شروع کر دیا تھا تاہم شعری سفر کی باقاعدہ ابتدا اس سید گزل کا

سانو۔“ نانا نے جواب دیا۔

اس طرح اس کے شعری سفر کی ابتدا ہو گئی۔ نانا جی کو جو اپنی پہلی نظم سنائی تو پھر اس کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کے زرخیز ذہن پر خیالات کی آمد ہونے لگی۔ شروع میں نانا اس کی شاعری کی اصلاح کیا کرتے تھے جو کہ کالج میں لیکچرار تھے اور علم عروض کے فن میں طاق تھے۔ پروین کو روز و اوقاف سکھانے میں ان کا

ماں کردار رہا البتہ شاعری پروین کو عطیہ خداوندی ہی کر ملی تھی۔ ویسے پروین کے سگے نانا سید کاظم حسین صاحب بھی شاعر تھے اور اس کے والد کا شمار ہی اپنے وقت کے نامی گرامی شاعروں میں ہوتا تھا۔ اُن کی شاعری پڑھ کر احساس ہوتا ہے خدا نے شاعری کے معاملے میں ان کے خاندان پر خاص کرم کیا ہے۔ والد کے اشعار ان کے رجحانات مذہب اور چٹائی سے محبت اور راست گوئی کا پتہ دیتے ہیں۔

یہ خود دار مٹ سکتا ہے لیکن جھک نہیں سکتا لگائے لاکھ طاقت ظلم اپنی خوب باطل سے سید شاکر حسین کے لے پالک فرزند اور سید حسن عسکری عظیم آبادی کے سگے نواسے ناظم جعفری بھی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ چنانچہ ظلم و ادب سے محبت کرنے والوں کے درمیان پروین شاکر جیسے نادر روزگار شاعرہ کا ابھرنے کوئی الجھجھکے کی بات نہیں تھی۔ پروین کے ابتدائی دنوں کے اکثر اشعار زبان زد عام ہوئے تھے۔

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا، پیار کی بازی ہاروں تو پیا، تیری جیتوں تو تجھے پاؤں ماں سے کیا کہیں دکھ ہجر کا کہ خود پر بھی اتنی چھوٹی عمر کی بچیاں نہیں کھاتیں

ابتدا ہی سے شعر کہنے کا ہنر اس میں یوں سرایت کر گیا تھا کہ انی الہ یہ اشعار لکھنے پر وہ اول انعام جیت کر رانی تھی۔ بقول پروفیسر عرفانہ عزیز۔ ”عام طور پر لوگ سمجھتے تھے کہ اس طرح کے اشعار لکھنا اس کی عمر کی لڑکیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔“

وہ ابھی محض پندرہ برس کی تھی کہ ریڈیو کے سامعین اس کی آواز سے مانوس ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر یاد مریدی صاحب نے اس کے اندر چسپا جوہر بھناپ کر اسے ”بزمِ طلباء“

نامی پروگرام میں شرکت کی دعوت دے دی۔ اس وقت پروین فرسٹ ایئر کی طالبہ تھیں۔ مذکورہ پروگرام میں اس نے 14 اگست 1968ء کی شب اپنی دھرتی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

دفترا نور ہوا آگے بڑھا اک جبرائیل دل میں روشن کیے آزادی کی نوریں انجیل عزم کی آگ تھی ایمان کی حرارت دل میں ظلمتیں پگھلیں، ترشنے لگی اک صبح جمیل اس نے ریڈیو پر سیاست، شاعری، دستاویزی پروگرامز اور ڈرامہ نگاری سمیت ہر قسم کے پروگرام کیے۔ اس کے لکھے ہوئے ڈرامے کو ریڈیو کے ساتھ بہترین ڈراموں میں شمار کیا گیا۔ اسے 1970ء میں ”بزمِ طلباء“ کے تحت ہونے والے ”بزمِ طلباء“ مشاعرے میں اول انعام دیا گیا۔ اس انعام پر پروین اکثر کہتی تھی کہ مجھے یہ اعزاز اپنے تمام اعزازات سے زیادہ پیارا ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کا ریڈیو کا سفر جاری تھا کہ اسی دوران معروف شاعر عبید اللہ سلیم نے اسے ”فتون“ میں متعارف کروایا۔ ”فتون“ احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت نکلتا تھا۔ قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی پر اس نے ”فتون“ کی دنیا میں قدم رکھا اور یوں ادب کے افق پر ایک نیا حیران کن ستارہ طلوع ہوا۔ قاسمی صاحب کو وہ عموماً جان کہا کرتی تھی اور اپنا روحانی استاد تسلیم کرتی تھی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اس کا تعلیمی سفر بھی کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جامعہ کراچی میں شعبہ انگریزی میں داخل ہو چکی تھی۔ کراچی یونیورسٹی میں ہی تعلیم کے دوران پارہ کو محبت ہو گئی۔ محبت کے اس احساس نے اس کی آنکھوں میں بہار کے سنے سجادیے مگر اس کی محبت تضادات، آزمائشوں اور پھر شکست سے دوچار ہوئی مگر اس نے اس شکست کو دل کا روگ لگانے کے

جائے اسے شاعری کا ذریعہ بنایا۔ محبت کی ناکامی نے اس کے تخلیقی کیریئر پر بھی کوئی اثر نہیں ڈالا۔ پروین نے ایک نظر کا تمنائی بننے کے بجائے سر اٹھا کر چلنے کا فیصلہ کیا اور تمام عمر اپنے ارادے پر ثابت قدم رہی۔

جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ایم اے کرتے ہی اسے سرسید گرلز کالج میں لیکچرار کی پیشکش ہو گئی جسے اس نے قبول کر لیا۔ بعد ازاں اس نے

عبداللہ گرلز کالج میں بھی بطور لیکچرار پڑھایا جہاں وہ انگریزی ادب کی استاد تھیں۔ وہ اب عمر کے اس حصے میں تھیں کہ والدین کو اس کے سر پر چھت دیکھنے کی تمنائی تھی۔ ان کے دل میں بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی دعائیں نکلا گرتی تھیں۔ ایسے میں ڈاکٹر نصیر علی کا پیغام آ گیا۔ وہ بارہ کے سیکنڈ کزن تھے اور کنگ ایڈورڈ کالج سے فارغ

التحصیل۔ ان کا رشتہ منظور کر لیا گیا اور 1975ء میں وہ منگنی کے بندھن میں بندھ گئی۔ شادی ایک برس بعد یعنی 1976ء میں ٹھہرائی گئی تھی۔ ہمارے یہاں شادی سے چند دن پہلے لڑکی کو ماپوں بٹھایا جاتا ہے جس میں سہائیں دلہن کی خوش و خرم زندگی کے لیے کچھ رسمیں ادا کرتی ہیں۔ پروین نے اس لمحے کی منظر کشی کچھ یوں کی ہے۔

سات سہائیں اور میری پریشانی
صندل کی تحریر
بھلا پتھر کے لکھ کو کیا دھوئے گی
بس اتنا یاد ہے

جذبے کی پوری نیکی ہے
سب نے اپنے اپنے خدا کا
اسم مجھے دے ڈالا ہے
اور یہ سننے میں آیا ہے
شام ڈھلے
جنگل کے سفر میں
اسم بہت کام آتے ہیں
پارہ نے اپنی ازدواجی زندگی کے لمحوں کو اپنی



پارہ اپنے استاد اور دو حوالی باب احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ

بیشتر نظموں میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ پارہ کی شادی اس کی والدہ بیگم افضل النساء بنت کاظم حسین کی مگی ماموں زاد بہن محترمہ منظری بیگم کے صاحب زادے ڈاکٹر سید نصیر علی کے ہمراہ جمعرات 14 اکتوبر 1976ء کو کراچی کے ابوالحسن مریج ہال میں ہوئی جس میں عزیز و اقارب کے علاوہ اہل ادب بھی شریک ہوئے۔ شادی کا رڈ اس کے والد شا کر حسین اور احمد ندیم قاسمی کی جانب سے جاری کیے گئے جبکہ پروین کا حق مہر شرعی ۱۳۰۰۰ روپے رکھا گیا۔ اس کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام انتہائی خوشگوار اور حسین تھے۔ جب اس کے شوہر کی پوسٹنگ اسلام

آباد میں ہوئی۔ وہ اس کی زندگی کے اصولی دن گزریں۔ شوہر کی پھوار اس پر ٹوٹ کر برسی تھی وہ اپنی تکی کدوہ مستقل اسلام آباد میں پڑاؤ ڈال لے کر شوہر اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ جلد ہی کراچی واپس آ گئے۔ سسرال میں رہتے ہوئے اسے خود میں کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ گھر میں تو سب کی لاڈلی تھی جہاں اس کے ناز اٹھائے جاتے تھے مگر سسرال میں مشترکہ خاندانی نظام تھا اس لیے اس کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں۔ وہ صبح کالج جاتی اور واپس آ کر گھر داری میں جت جاتی۔ اس طرح کتابوں سے دور ہو گئی مگر یہ دوری زیادہ عرصے قائم نہیں رہی۔ اس دوران اسے دوبارہ آپریشن کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بار گلے کا آپریشن اور دوسری بار اینڈکس کے درد کے باعث سرجری کی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔

اس کی ازدواجی زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی کہ اس میں آہستہ آہستہ مشکلات در آئیں۔ اس کی خانگی زندگی میں زہر آلودگی کسی اور نے نہیں بلکہ اس نے اپنے سرایوں نے کی۔ اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ ڈاکٹر نصیر مشاعروں میں جانے پر اعتراض کرتے تھے تاہم پروین کے بچی کو اس صورت حال کو سننا ہیال لیتے۔ شوہر کا اعتراض تو شادی کا رڈ ہی ہوتا تھا مگر سرایوں کی روایتی سوچ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی چلی گئی۔ شوہر اس کے سرایوں کے باعث ہار رہتے تھے اس لیے اس کا بار بار والدہ کمر والوں سے رہنا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ماحول میں ایلو جھٹ کر لے اور سرایوں کی خواہش کے مطابق خود کو بحال لے کر حالات اس نچ پر آ گئے کہ وہ مکے میں آ کر رہنے لگی اور دوبارہ کتابوں میں دل ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ سرایوں کے ساتھ

کشیدگی کا اعتراف اس نے نقاد ظہیر صدیقی کے نام ایک خط میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

”میرے اور نصیر کے تعلقات بہت اچھے ہیں مگر ان کے گھر والوں سے میں ایڈجسٹ نہیں کر سکی اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ میں میزیا کر ہی نہیں تھی سوچنے والا ذہن رکھتے ہوئے ایک لڑکی تھی۔ نصیر تقریباً روز ہی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ویک اینڈ پر رہ بھی جاتے ہیں مگر ہم آج تک الگ گھر لے کر نہیں رہ سکے عین موقع پر کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں تو اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے لیے نصیر کے ساتھ نکلی تھی اور پھر صورت حال اتنی بگڑ گئی کہ خود نصیر نے ہی فیصلہ کیا کہ میرا یہیں رہنا بہتر ہے۔“

مندرجہ بالا الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پارہ کے شوہر سے کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ وہ دونوں اچھے رہنا چاہتے تھے۔ بہر حال اس کی زندگی کے کٹھن ایام اسی طرح گزر رہے تھے کہ اسے ناظم آباد کے علاقے میں اپنے والدین کے گھر کے قریب ایک گھر لے گیا جہاں اس کی زندگی میں کچھ سکون آ گیا اور وہ پھر سے توجہ کے ساتھ پڑھنے لکھنے کی جانب راغب ہو گئی۔ اس اثناء میں بی بی وی پر اس کی نظامت میں مشاعرے اور ادبی پروگرام نشر ہوتے رہے۔ وہ زندگی کی کٹھنایوں اور مصائب سے نیروا تھی کہ قدرت نے اس کے گلشن میں خوشی کی ایک نوید دی۔ 20 نومبر 1979ء کو مراد کی صورت میں اس کی کوہنچر گئی۔ پروین نے زندگی کی اتنی بڑی خوشی کا اظہار اپنی نظمیں میں کیا ہے۔

”کائنات کے خالق“ جواز تیری موٹی صورت
اور ”میرالال“ خالہ تاماں کے جذبات کو اجاگر کرتی
دلکش نظمیں ہیں۔

بیٹے کی پیدائش نے جہاں اس کے من کو

ہے کہ انہیں Full Bright Scholarship ملی۔ ایک شخصیت پروین شاکر کی ہے اور دوسری مہتاب اکبر راشدی ہیں جو پروین کی بہترین دوست تھیں۔ پروین 1990ء میں امریکہ گئی جہاں 1992ء تک تعلیم حاصل کرتی رہی۔ اسی دوران اسے پاکستان میں اعلیٰ ترین سول اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ 24 مارچ 1991ء کو وہ ایوارڈ وصول کرنے پاکستان آئی جبکہ مئی 1991ء میں ایک بار پھر واپس آنا پڑا کیونکہ اس کا وظیفہ نامعلوم وجہ سے منسوخ ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ ماہ قیام کے بعد وہ دوبارہ امریکہ چلی گئی۔ امریکہ میں وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کالج میں پڑھانے بھی لگی اور ایک سے زائد تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگی۔ وہاں اس نے بیٹے مراد کو Tobin School میں ساتویں جماعت میں داخل کروایا تھا۔ 2 فروری 1992ء کو اس کے والد معمولی علالت کے باعث انتقال کر گئے۔ یہ صدمہ اس کے لیے بہت بڑا تھا جس سے نبرد آزما ہونا اسے بہت مشکل لگا تھا کیونکہ والد نے ہر کڑے

کمال تھی کہ اس کی روح تک مجروح ہو گئی تھی۔ پروین کی اپنی ایک نظم "Misfit" اس کی گھریلو زندگی کے دکھوں کی بھرپور عکاس ہے۔ اسلام آباد میں اس کا پہلا گھر F-7 کے علاقے میں تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات انکم ٹیکس گروپ کی سینئر افسر کے نام پر پروین قادر آغا سے ہوئی جنہوں نے اسے تاجر بن کر رہے تو گزارہ ممکن ہے کیونکہ شوہر صاحب دنیا بھڑاؤں کی رفاقت کا احساس دیا۔ یہ دور اس کے لیے والوں کے طعنوں تھنوں کا مقابلہ کرنے کی سبک نہیں رکھتے تھے۔ والدین نے اس کی خانگی زندگی بچانے کی بہت کوشش کی۔ اورت کامردوں کے معاشرے میں جینا کتنا دھیر

DHA کے علاقے میں سرکاری گھر مل گیا۔ اس اعلیٰ ملازمت کے دوران اسے کئی حکمرانی امتحانوں سے گزرنا پڑا اور اس نے اپنی فطری ذہانت سے تمام امتحان میں سرخروئی حاصل کی مگر دوسری طرف اس کی ازدواجی زندگی ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی۔ شوہر کا کہنا تھا کہ لکھنا پڑھنا ترک کر کے مکمل گھریلو عورت بن کر رہے تو گزارہ ممکن ہے کیونکہ شوہر صاحب دنیا بھڑاؤں کی رفاقت کا احساس دیا۔ یہ دور اس کے لیے والوں کے طعنوں تھنوں کا مقابلہ کرنے کی سبک نہیں رکھتے تھے۔ والدین نے اس کی خانگی زندگی بچانے کی بہت کوشش کی۔ اورت کامردوں کے معاشرے میں جینا کتنا دھیر

خوشیوں سے بھر دیا، وہیں اس کے بہتر اور مستحکم مستقبل کی فکر بھی اسے لاحق ہو گئی۔ یہی فکر اسے کراچی یونیورسٹی میں دوبارہ کھینچ کر لے آئی اور وہ انگریزی لسانیات میں داخلہ لے کر پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ 1981ء میں اس نے انگریزی لسانیات میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے بہتر مستقبل کی خاطر دن رات محنت کر رہی تھی۔ وہ بیٹا جو خاصی منتوں مرادوں کے بعد اس کے گھر کے آگن

میں پھول کی مانند کھلا تھا اور جسے وہ گیتو کہہ کر بلاتی تھی اپنے اسی لعل کے لیے وہ بہتر زندگی کے حصول کی کوششوں میں لگی رہی



اعزازات

پروین شاکر کو 1978ء میں "آدم جی ایوارڈ"۔ 1989ء میں "فیض احمد فیض بین الاقوامی ایوارڈ برائے شاعری"۔ 1991ء میں "صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی" ملا جبکہ بعد از مرگ "نشان فضیلت" طلباء کراچی یونیورسٹی 1995ء۔ APNS ایوارڈ لاہور 1995ء اور "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے ٹیکسلا" 2004ء۔

وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا خصوصاً شادی ٹوٹنے کے بعد تو اسے والد کی بہت زیادہ سپورٹ ملی تھی۔ جون 1992ء میں اسے انتہائی اعلیٰ اعزاز نصیب ہوا جب ہارورڈ یونیورسٹی سے اسے ایم پی اے کی ڈگری ملی۔ اس نے 12 میں سے 10 پرچوں میں A گریڈ حاصل کیا تھا۔ 23 جون 92ء کو وہ کراچی پہنچی۔ کچھ عرصے تک وہ اپنی والدہ اور بہن کے پاس رہی اور پھر اسلام آباد دسرکاری گھر میں منتقل ہو گئی۔ اسے

ازدواجی سفر محض دس برس بعد ہی اختتام پذیر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسری شادی کر لی جبکہ پروین نے دوبارہ گھریلو زندگی کا خیال دل سے نکال دیا۔ اس نے ہاں اس کا قیام اپنے کی شادی ٹوٹنے پر اس کی ایک کولیک محترمہ مہر سلطانہ کا تہرہ کچھ یوں تھا کہ "پروین تو چننا گھونسلہ ٹوٹا نہیں دیکھ سکتی تھی نہ جانے اس نے اسے گھر کے ٹوٹنے کے دکھ کو کیسے جھیلنا ہوگا؟" 20 ستمبر 1987ء کو دوبارہ اپنے اکلوتے لخت جگر انگلی تھامے تنہائی کے اذیت ناک سفر پر روانہ ہو گئی اس نے اسلام آباد کراچی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ بظاہر ہر لحاظ سے کامیاب نظر آتی تھی مگر اندر سے

اور اسی خیال کے تحت اس نے سی ایس ایس (CSS) کا امتحان دینے کی ٹھانی اور مقابلے کا یہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس کی کامیابی پر اس کے شوہر نے حیرت سے کہا تھا۔ "مجھے کیا پتہ تھا" یہ کامیاب ہو جائیں گی۔ میں نے تو یونہی اجازت دے دی تھی۔" ڈاکٹر نصیر کے اس جملے پر پروین کے والد نے جواب کیا کہ "تجربہ ہے تمہیں اس کی ذہانت کا اندازہ نہیں؟" سی ایس ایس کرنے کے بعد وہ ٹریننگ اکیڈمی لاہور گئی اور ٹریننگ مکمل کر کے اسے کراچی کے

سی ایس ایس کرنے کے بعد وہ ٹریننگ اکیڈمی لاہور گئی اور ٹریننگ مکمل کر کے اسے کراچی کے



شعری مجموعے

پروین شاکر کے چھ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ”خوشبو“ (1976ء)۔ صد برگ (1980ء)۔ خودکلامی (1985ء)۔ انکار (1990ء)۔ ماہنامہ (1994ء) اور ایک شعری مجموعہ ”کف آئینہ“ (1995ء) جو ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔

احساس جانے کیوں اور کیسے اجاگر ہو گیا تھا؟ جانے زندگی کی آخری صبح وہ کیسے جاگتی تھی؟ موت اور آخرت کے احساسات نے پچھلے کئی روز سے اس پر غلبہ کیا ہوا تھا۔ بہر حال اس نے اپنے لاڈلے گیتو کے لیے ناشتا تیار کیا، اپنے کپڑوں پر استری کی خالدہ حسین سے فون پر بات کی اور پھر ناشتا کرنے کے بعد تقریباً 9 بجے بیٹے کو ناشتے کی ہدایت کرتے ہوئے دفتر کے لیے روانہ ہوگئی۔ بیٹے نے اُسے خدا حافظ کہا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ماں کو آخری بار گڈ بائے کہہ رہا ہے۔

اُس دن پروین سبز لباس میں ملیں تھی۔ جس وقت دفتر جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوئی، موسم اُس کی پسند کے مطابق تھا، آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی اور بارش کی پوری تیاری تھی۔ اس کی سواری دفتر کی جانب گاڑن تھی۔ مارگر روڈ کا راستہ اسے

کسی عزیز کی شادی میں شریک ہونے لاهور گئی۔ 23 دسمبر کو اس نے اپنی محسن بیگم پروین آغا سے آخری ملاقات کی۔ اس نے نئے شادی شدہ جوڑے کے اعزاز میں اسلام آباد کلب میں دعوت دی۔ 25 دسمبر کو جو قائد اعظم کا جنم دن ہے، اس نے اپنے کچھ قریبی پڑوسیوں کی دعوت کی۔ اسی دن اس نے بالوں میں مہندی لگائی کہ بادل گھر آئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے پاس اس کی دیرینہ دوست رفاقت قاضی کے زیورات رکھے ہیں جنہیں لوٹانے وہ مراد کے ساتھ اُن کے گھر گئی۔

”یہ اپنی امانت واپس لے لو۔“

رفاقت خفا ہوئی۔ ”یہ زیورات کہاں بھاگے جا رہے تھے؟“

پارہ نے کہا۔ ”زندگی کا کیا بھر دے؟“

اس کی موت کے دن جو کالم روزنامہ ”جنگ“ کو موصول ہوا، اُس کا پہلا جملہ تھا۔ ”موت برحق ہے۔“ اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ اگلی شام اس کے آخری سفر کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔

زندگی کی آخری شب آنکھوں میں کئی تھیں رات بھر جیسے ایک بے قراری سی رہی تھی، آدھی رات کے وقت وہ بستر سے اٹھی اور بیٹے کے کمرے میں آ کر اسے محویت سے دیکھنے لگی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ اسی وقت اچانک مراد کی آنکھ کھلی تو اس نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔

”کیا ہوا ماما؟“

”کچھ نہیں بیٹا.....! بس دیکھنے آگئی تھی کہ اتنی سردی میں تم آرام سے تو سو رہے ہو؟“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

وہ رات تھی یا پہاڑ ایک ایک لمحہ جیسے داعی اجل مار رہا تھا۔ اس کے بھی لاشعور میں موت کا

حسن عسکری عظیم آبادی کی بات ذہن کے درمیان میں کوئی ہے کہ پارہ جہاں جاتی ہے وہاں زلزلہ آ جاتا ہے.....“

اس نے ہر جگہ کی بے ضابطگی اور بد عنوانی پر قلم اٹھایا مگر کمال ظرافت کے ساتھ اور یہ ظرافت کسی عام شخصیت کے قلم کا شاخسانہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھی۔ اس نے بے لاگ تبصرے کیے اور کالم کے لغوی معنی کی عملی تصویر بنی اپنی جگہ مستحکم رہی۔ کالم کے معنی ستون یا کھمبے کے ہیں۔ ان کالمز پر اسے بعد از مرگ APNS کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

پارہ جگمگے کسٹرمز میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھی۔ اسی حوالے سے اس کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا تاہم اس کے باوجود اس نے زندگی میں بہت کچھ کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ مارچ 1995ء میں اس کے تھیس کے ری اوپن ہونے کا امکان تھا ساتھ ہی اگلوتے شہزادے کو کامیاب انسان بننے دیکھنے کی مہلت کی دعا جو شرف قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ جنوری 1995ء میں ہی ٹی وی کے ایک ادبی پروگرام ”خزن“ کی کپیڈنگ بھی کرنا تھی مگر داعی اجل نے اسے یہ سب دیکھنا نصیب نہیں کیا۔ اس کی زندگی کے آخری دن بڑے مصروف اور یادگار تھے۔ ان دنوں کراچی میں اسن واماں کی صورت حال کے باعث اسے اسن مارچ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا تعلق کسی ایک صوبے یا شہر سے نہیں بلکہ پاکستان سے ہے۔ خواتین کے مشاعرے میں مدعو کیا گیا تو اس کا جواب تھا۔

”وہ ایک شاعرہ ہے، اسے مردانہ یا زنانہ ڈبے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔“

18 دسمبر کو وہ پروین قادر آغا کے ہمراہ ان کے

رنگوں پھولوں اور خوشبو سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا اسی لیے دنیا بھر کے خوش رنگ پھول اس کے گھر کی زینت بنے۔

اسلام آباد میں قیام کے دوران اسے بہت سے اچھے دوستوں کا ساتھ بھی ملا جن میں ایک نام رفاقت قاضی کا بھی ہے جو اپنے نام کی طرح نہایت ہی اچھی رفیق ثابت ہوئیں۔ انہوں نے پروین کو خونی رشتوں سے زیادہ محبت دی تھی۔ پروین کا بیٹا مراد زمانہ طالب علمی میں ان ہی کے پاس قیام کرتا تھا۔ پروین کے دوستوں کا حلقہ وسیع نہیں تھا مگر جتنے بھی دوست تھے، وہ سب اس کی قدر و منزلت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس نے قائد اعظم یونیورسٹی سے انگریزی میں دو کورسز کیے اور انگریزی میں پی ایچ ڈی کرنے کی ٹھانی۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد جہاں اس کی زندگی دکھوں سے اٹ گئی وہیں دوسری طرف تعلیمی کامیابیاں اعزازات و انعامات اور فی عروج کا دائرہ ہر گزرتے دن کے ساتھ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اپنی موت کے وقت وہ ڈائریکٹر ٹر آف انٹیلی جنس کسٹمز اینڈ ایکسائز میں اسٹنٹ ڈائریکٹر ٹر آف انسپکشن اینڈ آڈٹ تھی۔ اس نے منشیات پر ایک مقالہ بھی تحریر کیا جسے چین میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ مسلسل سفر پارہ کو ایسے مقام پر لے آیا جس کا ہر شخص تمنائی ہوتا ہے۔ پیشتر ممالک کے دورے اعزازات اعلیٰ تعلیم کا حصول، طیب رزق کی دعا کی مستجابی پارہ ایک فخر مستحکم بن گئی۔

پروین نے شاعری کے ساتھ نثر میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے، ترجمے کیے اور اخبارات کے لیے کالمز بھی لکھے۔ اس نے 1993ء سے 1994ء تک 25 کالمز تحریر کیے۔ ان کالمز کو پڑھ کر پارہ کے نانا سید

بے حد پسند تھا۔ پہاڑی راستے اور خوب صورت مناظر اسے الگ ہی دنیا میں لے جاتے تھے۔ دفتر جاتے ہوئے وہ ان ہی مناظر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس پر آمد ہونے لگی۔ اس نے قلم نکالا اور صفحہ قرطاس پر اپنے خیالات کو لفظوں کی صورت دینے لگی۔ پارہ کا ڈرائیور یوسف ایک کہنہ مشق ڈرائیور تھا۔ یوسف کا بیٹا بھی اسی شاہراہ پر جاں بحق ہو چکا تھا۔ سفر اسی طرح اطمینان و خاموشی سے کٹ رہا تھا کہ اچانک جیسے زلزلہ سا آگیا، مخالف سمت سے آنے

وہ تصحیح کے دانوں کو حرکت دینے میں مصروف تھیں کہ تصحیح بھی ساکت ہو گئی اور وہ مراد جس کی خاطر پارہ نے ہر بہار سے منہ موڑ لیا تھا، آپریشن تھیٹر کے باہر بے چینی سے ٹھہرا، استعجاب کے عالم میں اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا، نرس نے پروین کا سامان جو کہ انگوٹھی پر اس اور جوتے پر مشتمل تھا، یہ چند چیزیں پروین آپا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"Sorry, She is no more with us."



پروین اپنی آخری آرام گاہ میں خواستراحت

والی ایک مسافر بس ایک چھوٹی سی نیلی کار جس کا نمبر IDC-4362 تھا، روندتی ہوئی چلی گئی اور ایک درخت کے قریب جا کر ٹکرائی۔ اُس کار میں موجود دونوں نفوس جانے کب تک موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہے پھر ایک راہ گیر نے انہیں پہچانا، گاڑی کو کاٹ کر پارہ کو نکالا گیا۔ اس کے ہینڈ بیگ کو ٹولا گیا تو ایک کارڈ برآمد ہوا جس سے پارہ کی شناخت ہوئی۔

”پروین شاکر.....! اوہ خدایا.....! یہ پروین شاکر ہے؟“

اُس بندہ خدا کے منہ سے نکلا۔ ڈرائیور موقع پر ہی دم توڑ چکا تھا جبکہ پروین کے جسم میں سانسوں کی ڈورا بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اسے فوراً پھر اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کوما میں ہے۔ پروین پر اس عالم میں دو گھنٹے گزر گئے تھے جبکہ دوسری طرف ایک اور پروین جسے وہ پروین آپا کہا کرتی تھی

پروین اب اس جہان فانی میں نہیں رہی تھی اور محض 42 برس کی مختصر زندگی گزار کر اپنے رب حقیقی کے پاس پلٹ گئی تھی۔

جب دنیا اندھیر ہو جاتی ہے تو آسمان بھی سر چھپانے کے لیے کافی نہیں ہوتا، شاید اسی لیے پارہ نے کہا تھا۔

شریک ہو گئی سازش میں کس کے کہنے پر؟ یہ کس کے قتل پر اب ہاتھ مل رہی ہے ہوا؟ وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں علم سے لبریز رہی، علم نجوم پر بھی اسے اعتماد ہوا، وہ اس علم کے ذریعے

زندگی کے پوشیدہ راز کو جاننے کے لیے کوشاں رہی تھی۔ کسی نجومی نے کہا تھا۔

”آپ چار کتابیں ہی لکھ پائیں گی۔ آپ اپریل اور دسمبر کے مہینوں میں سفر سے گریز کریں۔“ لیکن وہ یہی جواب دیتی۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتی۔“

زندگی کے مختلف ادوار میں وہ موت کے تصور پر لکھتی رہی مگر جانے سے کچھ عرصے قبل وہ محض موت کے خدشات میں گھری ہوئی ملتی ہے۔ وہ اس طرح اپنا اسباب سمیٹ رہی تھی جیسے اسے موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس کے جسدِ خاکی کو اس کے گھر واقع G/10 لانے کے بجائے پروین کے گھر لے جایا گیا جہاں نوپا ہوتا جوڑے کے لیے دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ پروین کے جسدِ خاکی کی آمد سے قبل تمام انتظامات سفید چاندنیوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔

بارش مسلسل برس رہی تھی اور پروین کا سفر بھی بارش کی ہوا ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ اس کا سر بری طرح زخمی تھا جسے چھپانے کے لیے سفید پٹی باندھ دی گئی تھی تاہم اس کا چہرہ پوری طرح محفوظ تھا اور آب و تاب سے چمک رہا تھا پھر وہ شام بھی آ پہنچی جب خوشبو کی پذیرائی کے لیے دنیا بھر کے پھول اُس کے زخم زخم سر پر لے کر اپنے نرم کس سے سرشار کرنے آئے۔ شام کے سائے مزید گہرے ہوئے تو اسے وہاں لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آیا۔

ہے کون سا وہ دیس جہاں تم چلے گئے؟ وہی شاہراہیں جو چند گھنٹے پیشتر لوڈ شیڈنگ کے باعث اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اب پوری طرح روشن تھیں۔ H-8 اسلام آباد کا قبرستان..... اس کا گلاب ادا اس کا نیا مسکن اُس کی آخری آرام گاہ

تھا۔ اُس کے مراد نے بڑی ہمت و حوصلے سے اُسے زمین کی کودے کے حوالے کیا اور وہ منوں مٹی تلے ہمیشہ کے لیے کم ہو گئی۔

میں خاک کو پھر خاک پر چھوڑ آئی رضائے الہی کی تکمیل کردی

☆☆

غیر مطبوعہ غزل

زیر نظر غزل پروین کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں

آنکھیں کھلیں تو سامنے ایک اور خواب تھا رکھا ہوا سرہانے یہ تازہ گلاب تھا

.....

ایسے سا گیا کوئی آغوش خاک میں جیسے کہ قبر جام تھی اور وہ شراب تھا

.....

ملاح کیسے بولتا دریا کے سامنے اسوار کمال آب تھا اور بخش آب تھا

.....

ہر چشمہ سفر نے مسافر سے یہ کہا اب تک دیکھنا تو محض اک سراب تھا

.....

مچھڑا ہے آج کوئی تو یہ بھی کھلا کہ کیوں کچھ دن سے شہر جاں میں بہت اضطراب تھا

☆☆

(اس مضمون کی تیاری میں نصرت زہرا کی تصنیف ”پارہ پارہ“ سے مدد لی گئی ہے جس کے لیے ہم مصنفہ کے بے حد ممنون ہیں۔)

صبحہ شاہ

اعتبار سفر ہو انتقام

بشیر بدر خیال

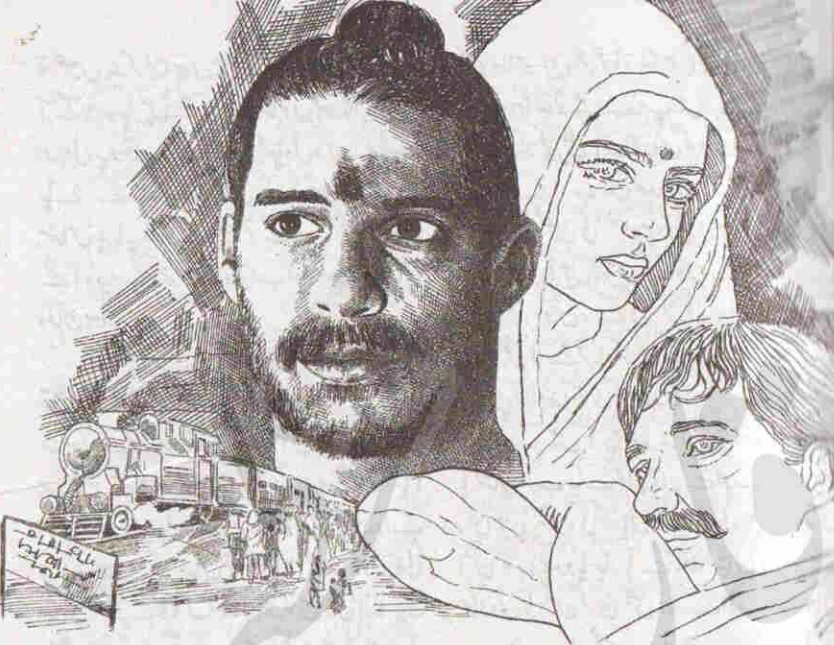
نہ غموں کا میرے حساب لے نہ غموں کا اپنے حساب دے
وہ عجیب رات تھی کیا کہیں جو گزر گئی سو گزر گئی

سقوط ڈھاکا اور حال کے منظر ناموں کی تصویر کشائی ایک پہلو کہانی

دل نہیں چاہتا کہ آنکھیں کھولوں مگر پہلو اور ٹانگ سے اٹھتی یہ ٹیسیں..... بے اختیار آہ نکل جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی رضا کار کوئی نہ کوئی ڈاکٹر میری جانب لپک کر آتا ہے میرا سر سہلا کر مجھ پر شفقت سے جھک کر میرا حال پوچھتا ہے مگر میں بول نہیں سکتا الفاظ میری گرفت سے پھسل کر جانے کہاں کھو گئے ہیں کہ میں انتہائی ضروری باتوں کا بھی جواب نہیں دے سکتا اور خالی خالی آنکھوں سے آنے والوں کے چہروں پر پھیلی ہمدردی اور رنج و غم کے سائے دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اچھل کر کھڑا ہو جاؤں ایسے کہ میری ٹانگ اور میرے پہلو میں لگے لاتعداد ٹانگے یوں ادھر جائیں کہ کبھی مل نہ سکیں یہاں سے وہاں تک خون بہہ جائے اتنا بہے اتنا بہے کہ یہ دھڑکتا ہوا دل یہ کیپوڑ کی طرح تیزی سے چلتا ہوا ذہن دونوں ٹھہر جائیں۔ میں سوچتا نہیں

چاہتا میں بولنا چاہتا ہوں میں رونا چاہتا ہوں مگر میرے لفظوں اور میرے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اسپتال کے دروازے پر آہ و فغاں سے گونج رہے ہیں۔ کہیں زخموں کی آہ بکا ہے تو کہیں لاشوں کے لواحقین کی سیدہ کو بی زبوس ڈاکٹروں اور رضا کاروں کی بھاگ دوڑ جانفشانی کا عالم اس سے قلیل کم از کم میں نے نہیں دیکھا اور..... اور تھ ہے مجھ پر کہ میں بے حسی کی تصویر بنا پڑا ہوں وزرائے کرام، عوامدین شہر رضا کار ڈاکٹر آتے ہیں سب بستروں پر باری باری رکتے ہیں کوئی بستر نشین روتا ہے کوئی چلاتا ہے کوئی اپنے اہل خانہ کا ذکر کرتا ہے اور کوئی اپنے جلے آشیانے کا رونا روتا ہے اور آنے والے اس کا سر اس کی پشت سہلا کر اسے تسلی دیتے ہیں۔

”ہم آپ کے ساتھ ہیں مجرموں کی سرکوبی کی



ہائے گی مجرموں کو کیفر رواں تک پہنچایا جائے گا“
معاوضہ دیا جائے گا۔“

بارد کچھ چکا ہوں۔ آہ..... غم روزگار نے سب کچھ بھلا دیا تھا اور آج..... آج میں فرصت سے ہوں ہاں بالکل فرصت سے یہاں بستر پہ سرخ کمر اورٹھے لیٹا ہوں ٹپ..... ٹپ..... ٹپ خون قطرہ قطرہ اسٹینڈ پہ ٹنگی بوتل سے میری رگوں میں نئی زندگی بن کر دوڑ رہا ہے ایسا ہی سرخ سرخ قطرہ قطرہ زندگی کا پیغام یہاں سے وہاں تک بہت سے لوگوں کی رگوں میں منتقل ہو رہا ہے اور میں ان ایک ایک کر کے لپکتے قطروں کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ خون کی یہ لاتعداد بوتلیں لاتعداد لوگوں نے عطیہ کی ہوں گی ان سب کے خون کا رنگ تو ایک ہی ہے پھر وہ آگ کیسی تھی جو پندرہ برس قبل میری عطیہ میری بہن اور بہت سے بھائیوں کی بہنوں کو نکل گئی تھی اور پرسوں پھر میری شیوہ.....؟ اوہ یہ عیادت کو آنے والوں کی ایک اور جماعت ہے ان کے ساتھ اپنے فوٹو گرافرز ہیں میں

اور پھر ان جملوں کی گردان کرتے کرتے وہ حضرات اور بی وی کا کیمرو جھٹک بھی آتا ہے۔ میں بھی رونا چاہتا ہوں چلا چلا کر رونا چاہتا ہوں ان زرد دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر اپنی نو عمر بیٹی اپنے نوجوان بیٹے اور بی بی لیلیٰ کا نوحہ پڑھنا چاہتا ہوں اپنے جلے آشیانے کی راکھ و چنگاریاں اپنے والوں تسلیاں دینے والوں معاوضہ دینے والوں کے دل و دماغ میں بھر دینا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے کیا ہوا ہے کہ میرا ذہن بیدار ہے اور زبان مردہ ہو گئی ہے۔ میری بیٹی بیٹی آنکھیں ایک ایک چہرے کو تھپتی ہیں اور بس لوگ اس کے سر ہا کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور میں اس کے ساتھ کس وحشت لینا پردہ ذہن پر چلتی

ایک ایک ہمدردی دہرے لے کر اب تک ہزاروں

آنکھیں بند کر لیتا ہوں تاکہ یہ لوگ مجھے سوتا سمجھ کر آگے بڑھ جائیں۔ آج بہت سالوں بعد پھر وہی یاد درودل پہ دستک دے رہی ہے چاول دن کے کھیت چائے کے باغات، اناس کی خوشبو و پیچی کی مٹھاس پدماپہ ہلکورے لیتے نوکے اور ہانچوں کے نئے آنے یہ سب کچھ خواب و سراب ہوا سب کچھ خیال و گمان ہوا۔

بھی مہاجر ہیں مگر کوئی پاکستانی نہیں۔ وطن عزیز
روحنت ہوا تھا تو میں نے کمپ میں سردی سے سکتے
ہوئے چند ٹنگری ٹکی نامہ نگاروں کو دیکھ کر سوچا تھا کہ
اب ہمارے ادب میں صدیوں تک لٹی عصمتوں کی
سسکیاں گونجیں گی، معصوم دوشیزاؤں کی روجوں کی
کربناکیاں آہیں بھریں گی ناؤں کے پٹھے بچوں کی
سرخ افتق روشن رکھے گی، کڑیل جوانوں کے بے
کوکوفن لاشے فریاد کریں گے لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا
کیا ہمارا حافظہ اتنی کمزور ہے؟

ماں نے سوچا کہ یہ مجھے گولی کیوں نہیں مارتے؟
 'کاش' کوئی خنجر میرے پہلو میں اتر جائے، 'کاش'
 کوئی گولی میرا سر چھاڑ کر نکل جائے، 'کاش' لیکن میں
 زندہ رہا، میرا ایک بنگالی دوست شمس الدین مجھے
 ہاں سے نکال کر عینیت ماموں کے گھر چھوڑ گیا
 ہاں اماں! بابا اور بہت سے لوگ جمع تھے، تب میں
 نے اماں کو بتایا تھا کہ اماں! عطو شہید ہو گئی ہے، میں
 نے خود اس کی لاش دیکھی ہے۔ سینٹ جوزف کالج
 کے گیٹ کے سامنے اسے کتنی پانی والوں نے گولی کا
 نشانہ بنایا ہے۔ اس کا دوپٹہ خون سے تر ہو رہا تھا۔
 کہتے کہتے الفاظ میرے لبوں میں رو دیئے تھے اور
 ماں نے سجدہ شکر ادا کیا تھا کہ ان کی جوان بیٹی اب
 مدحوں کی دھرتی سے بہت دور اور محفوظ ہو گئی

شبنمی قطرے لرزاں نظر آئے۔ آہ سوچتا ہوں یہ
آنسو کہاں سے آجاتے ہیں؟ روح میں کوئی جھرنا
ہوگا اور تب اس جھرنے کی جلتی لگ نے میرے دل
میں کہکشاں ہی جگمگادی تھی۔

رہتی اور میں..... میں اندر باہر ایک وحشت کے عالم میں چکراتا پھرتا پھر ایسا ہوا کہ زخموں پر کھر بڑ بننے لگے زندگی ایسی مصروف اتنی تیز رفتار ہو گئی تھی کہ پندرہ دسمبر بھی آنسوؤں کی سوغات لانا بھول جاتی۔ اب میں پہلی دسمبر سے ہی اخباروں کے کبھی نہ شائع ہونے والے سقوط ڈھاکہ نمبر تلاش نہیں کرتا پھرتا تھا۔

اب تو ذکو کی شادی کا مرحلہ تھا۔ صورتو شبو کی تعلیم کے مسائل تھے۔ بھیا کا بیٹا صورتو میٹرک پاس کر چکا تھا اور اب ٹیوشن کر کے اپنا پوچھ خود اٹھا رہا تھا۔ وہ انٹر سائنس کا طالب علم تھا اور سائنس دان بننا چاہتا تھا۔ شبو بھیا مرحوم کی بیٹی فرسٹ ایئر میں آگئی تھی اور کہتی تھی کہ چاچو! میں پیچر بنوں گی۔ صورتو اس کا مذاق اڑاتا کہ ہاں تو تو پیچر بن سکتی ہے اور کیا بنے گی؟ تب وہ بڑے دکھ سے اور اعتماد سے کہتی کہ نہیں بھائی! پیچر کو ہماری قوم نے ہم نے خود پیچر بنایا ہے مگر دیکھنا میں مثالی پیچر بنوں گی۔ اپنے عمل سے درس اخوت و محبت و محنت دینے والی پیچر۔

وہ جون کی ایک تپتی ڈھلتی دوپہر تھی۔ رات کو جزیروں سے ہر گھر میں ایک ٹیوب لائٹ ضرور روشن ہو جاتی تھی اور بس مگر دوپہر میں دن بھر گری سے بچنے کا کوئی سامان نہ تھا۔

اُس روز میں اپنی شفٹ کر کے گھر پہنچا تو گھر پہ ہولناک سناٹا طاری تھا نہ صورتو شبو کی نوک جھونک تھی نہ ذکو کی مترنم گنگناہٹیں اور نہ ہی اماں واپا کی باتوں کی دھیمی دھیمی آواز۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ کیا بات ہے؟

میں نے سر جھکائے گم صم بیٹھی ذکو کا سر ہلایا بغیر نگاہیں ملائے اس نے ایک ایروگرام آگے بڑھا دیا اور چوکی پہ پھیلا جرت۔ ٹانگے کے لیے آئے ہوئے دوپٹے اور ستارے سینے لگی۔

میں نے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے ایروگرام کھولا اور سنائے میں رہ گیا۔ یہ عطا کا خط تھا۔ چورنگا ہوں سے اماں کی طرف دیکھا وہ مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ اُن کی سرخ سرخ تپتی ہوئی جلتی ہوئی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ تو تو کہتا تھا عطا شہید ہو گئی؟ تو نے خود اُس کی لاش دیکھی ہے؟

میں نے نظریں جھکا لیں پلٹا تو باہر نظر پڑی وہ چوکی پہ سیدھے لیٹے چھت تک رہے تھے۔ اچانک ہی بہت سی نئی جھریاں اُن کے چہرے پر ابھر آئی تھیں۔ اُن کے چہرے سے زندگی کے سارے احساسات غائب ہو رہے تھے۔ میں چوروں کی مانند باہر برآمدے میں جا بیٹھا پھر میں نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو چوما آنکھوں سینے سے لگایا اور کھولا۔

”پیاری اماں جان!

السلام علیکم!

سلام کرنے کی عادت چھٹ گئی ہے۔ غمت کبھی ہوں۔ اب تو آج سلام لکھتے ہوئے قلم ایک سا گیا۔ آپ لوگوں کا پتہ مجھے کہاں سے اور کیسے ملا یہ الگ داستان ہے اور میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ سب کہانیاں لکھوں؟

پیاری اماں! میری دعا میری تمنا ہے کہ آپ سب ہمیشہ عافیت و خیریت سے رہیں۔ میں کہاں ہوں کن حالات سے گزر کر یہاں تک آئی ہوں سننے سنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب سے آپ لوگوں کا پتہ ملا ہے میرا دل تڑپ رہا تھا مگر جی بھی نہیں چاہتا تھا۔

آج جب دل کی تڑپ حد سے سوا ہو گئی برداشت سے باہر ہو گئی تو میں نے قلم اٹھالیا اماں اب آپ جب اس کاغذ کے پرزے کو سینے سے لگا

کرے میں کی تو شاید اس لمحے میں میرے بے چین دل کو کچھ قرار آ جائے۔

سب کو بہت سلام اور دعا۔ بہت بہت دعا میں۔ خدا کرے میری عمر بقیہ عمر کے تمام لمحے آپ لوگوں کو مل جائیں کہ میرے لیے تو زندگی اب ایک گالی بن گئی ہے۔

بد نصیب عطیہ!

عطا مگر آج۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹ بہا۔ عطا میری جان! میری معصوم پیاری بے گناہ پاکیزہ بہن! تو جس کچھ جس جوہر میں بھی ہے کنول کے پھول کی مانند ہے پاک پوتر..... اور پھر اماں! ابابہیدہ بھر بھی تو نہ جی سکے۔ ذکو کی رخصتی کیا ہوئی اُن دونوں نے بھی آگے پیچھے ایک ہفتہ کے اندر رخت سفر باندھ لیا۔ میں آنکھوں میں پیچڑ جانے والوں کے چہرے بسائے دھوپ میں سائبان تلاش کرتا پھر رہا تھا تب ایک دن بہت سادگی بہت خاموشی سے پروین ارمان نہیں ضرورت بن کر میرے آنگن میں اتر آئی اور چاندنی کی مانند پورے ماحول کو اپنے حصار میں لے لیا۔ مہربان شہنشاہ حراج کی ہنس کھڑکی نے میرے گھر کے مسائل اور حالات کو بہت جلد سمجھ لیا۔ وہ بھی سونا رنگہ میں پہنکارتے عصیت کے ناگ کی ڈسی ہوئی تھی بہن بھائی ماں باپ سب کو وہاں وارا آئی تھی اور اب رشتے کی کسی خال پر بوجھ بنی ہوئی تھی سبھی سبھی لڑکی ذرا کھٹکے پر چوک اٹھتی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں مٹی باہی اور اندروں کا خوف رچ گیا تھا اسی خوف نے اسے وحشت زدہ ہرنی کی طرح چونکا وہ بزدل بنا دیا تھا۔ اس کی بزدلی سے ہم تینوں عاجز تھے وہ تنہا باہر نہیں آ سکتی تھی۔ مغرب کے بعد اندر اپنے پر پھیلاتا تو اس پر وحشت طاری ہونے لگتی۔ میں یا صورتو

دیر سے گھر پہنچتے تو اس کا آدھا خون خشک ہو چکا ہوتا، ہمیں دیکھتے ہی برس پڑتی اور پھر رونے بیٹھ جاتی تب صورتو زور سے ہنستا۔

”چھوٹی امی.....! یہ جڑیا ابیاد لے کر کیسے جیو گی؟“

”نہیں جینا مجھے تم لوگ ایسے بے پروا ہی کرو گے تو بس جلد ہی مر جاؤں گی میں۔“ وہ جواب دیتی اور زور و شور سے رونے لگتی۔

میں اس کا دکھ جانتا تھا وہ اتنے ہولناک ماحول و حالات سے گزر کر آئی تھی کہ اب ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی اسے آنکھوں کے خدشے میں مبتلا کر جاتا۔ ہر فرد ہر اجنبی اسے مشکوک معلوم ہوتا تھا۔

ابھی شادی کو کچھ ماہ ہی تو ہوئے تھے میں نے سوچا تھا کہ اپنی محبت سے اپنی چاہت سے میں اس کے دل میں سدا بہار پھول اگاؤں گا اس کے سہنے کپکپے اعتماد کو بحال کروں گا اسے بہادر اور جی دار بناؤں گا کہ آخر اسے میری نسل کا امین بننا تھا جس کا پہلا نمائندہ چھ ماہ بعد اس کائنات میں آنے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کمزور سبھی ہوئی خود اعتمادی سے محروم مائیں ایک مضبوط اور پر اعتماد نسل کو جنم نہیں دے سکتیں۔

وہ چودہ دسمبر کی ایک خشک دوپہر تھی صورتو نزول کھانسی و بخار میں مبتلا تھا اس لیے کالج نہیں گیا تھا وہ بستر میں لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ شبو نے بھی جانے کیوں آج چھٹی کر لی تھی اور باورچی خانے میں چینی پیٹتی بیٹھی جانے کیوں مستقل بنے جا رہی تھیں۔ میری دوپہر کی شفٹ میں ڈیوٹی تھی میں طر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک باہر گلی میں دوڑتے قدموں کی آوازیں بچوں و عورتوں کی چیخ و پکار گونجنے لگی اور پھر کلا شکوف کے لگا تار فائروں سے گھروں کی

دیواریں لرزنے لگیں۔

جینک پہننے پہننے میرے ہاتھ تھم گئے، براعتیار میری نگاہ پروین کی جانب اٹھی۔ ”کتنی ہنسی.....“ پروین کی بے اختیار چیخ نکل گئی وہ شبو سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”چھوٹی امی کو سنبھالو شبو.....!“ یہ کہتے ہوئے صبور لحاف پھینک کر اٹھا اور میرے روکنے سے پہلے ہی اس نے ننگے پاؤں باہر چھلانگ لگا دی۔ میں اس کے پیچھے لپکا باہر کا منظر میری سوچ اور ذہن کو غلطوج کر گیا۔ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ گلی میں نقاب پوشوں کا راج تھا۔ میں سمجھا ڈاکو کس آئے ہیں لیکن بھلا انہیں یہاں سے کیا لے گا؟ پھر منظر تیزی سے بدلنے لگے۔ میں نے صورت کو ایک زخمی بچے کو ہاتھوں پر سنبھالتے اور پھر خود اسے زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ گلی کے فرش پر خالی کارٹوس ادھر سے ادھر تک بچتے جا رہے تھے۔ گھروں کے اندر دندناتے عورتوں، لڑکیوں کو بالوں سے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ڈاکوؤں کو دیکھ کر مجھے شبو اور پروین کا خیال آیا۔

”آہستہ ساربان.....! یہ آگینے ہیں۔“ رحمت اللعالمین کا کہا ہوا یہ جملہ عورتوں کے لیے تھا۔

اب اپنے آگینوں کی حفاظت کیسے کروں؟

میں دیوانہ وار اندر کی طرف پلٹا تو چھ سات نقاب پوش مجھے دھکا دے کر اندر گھس آئے۔ میں تڑپ کر ان پر چھٹا تو میرے پہلو میں میری ٹانگ میں جیسے آگ بجھ گئی اور یہ آگ سینکڑوں میں میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ چکر اکر گرتے ہوئے میرا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا، سرخ سرخ خون میرے ماتھے سے بہہ کر میری آنکھوں

میں داخل ہو رہا تھا، میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں دفعتاً مجھے صبور کا خیال آیا، میں نے پریشانگی سے آنکھیں کھولیں۔ ارد گرد بھڑکتے آگ اور نفرت کے شعلوں کو دیکھا اور پھر اس کے بعد نہیں کیا ہوا، کس کس پر قیامتیں ٹوٹیں؟ کون کون سے ستارے و خورشید بجھے؟ وحشتیں کہاں کہاں پھیں کیسے کیسے گل بدن خس و خاشاک ہوئے؟ سور کے سوداگر ہتھتے ہتھتے گھروں میں قبرستانوں کی ویرانیاں پھیلا کر کہاں غائب ہو گئے، مجھے کچھ نہیں آکھ کھلی تو یہ سفید بستر تھا اور جسم و جان سے اشقی نہیں اور چاروں طرف ایک چیخ و پکار افراتفری کا عالم تھا۔ میری آنکھیں کھلتی دیکھ کر افراد میری جانب لپکے، ان میں ڈاکٹر بھی ہوا رضا کار بھی اور اخبار نویس بھی۔ ڈاکٹر میرے زخموں اور میری ذہنی کیفیت کے بارے میں فکر مند ہیں رضا کار میرے لواحقین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہے ہیں اور اخبار نویسوں کو میری داستان میں کسی سنسنی خیز پہلو کی تلاش ہے، سیاسی رہنما اسے عوامی رابطہ مہم کا موقع سمجھ رہے ہیں، وزراء کے کرام و امراء شہر اپنے ساتھ خوبصورت و عددوں کی نوید لیے ہوئے ہیں اور اس نوید کو ہماری پھٹی جھولیوں میں ڈالتے ہوئے کل کے اخبارات میں ان کی تصاویر چھپیں گی۔

میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں ماحول کو سمجھ رہا ہوں، واقعات کی کڑیاں ملا رہا ہوں، میں ان لوگوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، میری چیخ دل پروین، میری نسل کی امین، میری شبو، میرا صبور کہاں گئے سب؟ کیا حملہ آور مسلمان نہیں تھے؟ اگر تھے تو ان پر مسلمانوں کا خون کس نے مباح کیا تھا؟ میں ان سامنے سے آنے والے عمائدین شہر کے وفد کو ان عیادت کو آنے والے وزراء کو ان کی

دی کیسروں کو؟ ان باخبر اخبار نویسوں کو؟ مجھوڑ کر لپکنا چاہتا ہوں کہ یہ آگ کیسے بھڑکی؟ اس کے لیے زمین کس نے ہموار کی؟ یہ قیامت کیوں آئی؟ اور اس قیامت کے برپا ہونے میں کس کس کا ہاتھ ہے؟ مگر میری زبان تنگ ہے، میں بولنا چاہتا ہوں بول نہیں سکتا، میری زبان اینٹھ کر لکڑی کا ٹکڑا بن گئی ہے۔ ڈاکٹر نے آنے والے وفد کو بتا رہا ہے۔

”اب یہ بالکل ٹھیک ہیں، پہلو اور ٹانگ میں زخم ہیں جو جلد ہی بھر جائیں گے خطرے کی کوئی بات نہیں۔“

”مگر سنو سنو ڈاکٹر، خطرے کی بات ہے، اس زخم کا کیا ہے؟ اسے تو بھرنا ہے، بھر ہی جائے گا مگر جو گھاؤ اس ملت کے چہرے پر لگے ہیں جو داغ اس قوم کے دامن پر پڑے ہیں انہیں کس طرح دور کیا جائے گا؟ ہماری فکر میں جو اندھیرا پھیل گیا ہے اسے دور کرنے کے لیے کس سورج کا مرہون منت ہونا پڑے گا اور ہمیں اس کی کیا قیمت ادا کرنا ہوگی؟ اینٹ گارے کے گھر تباہ ہوتے ہیں تو دوبارہ بن ہی جاتے ہیں، ان میں زندگی کی رونقیں بھی لوٹ آتی ہیں لیکن جانوں کا زیاں، اربانوں کا زیاں، رشتوں کا زیاں، اعتماد کا زیاں، یہ نقصان کون پورا کرے گا؟

یہ دبسم کا مہینہ ہے ناں، اور میں سوچ رہا ہوں کہ شکر ہے کہ اب اماں اور ابا دنیا میں نہیں ہیں ورنہ میں ان کو یہ سچ کیسے بتاتا کہ اماں.....! شبو اور پروین شہید ہو گئیں؟ میں نے خود ان کی خون میں تڑپا لاشیں دیکھی ہیں اور اب میں تنہا ہوں، اب ہسپتال کا بستر ہو یا فٹ پاتھ کا کنارہ، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا، میرا اعتبار سفر تو تمام ہو چکا

سال نو مناؤں کیسے؟

صافیہ ہر سال جو تم نظم بنی لکھتی ہو اپنے لفظوں سے بے مول یونہی کہتی ہو دردنا کا غنہ بجاتی کیوں ہو حال دل غیروں کو سناتی کیوں ہو کیا اس تنگ پر اس کا اثر ہوتا ہے کیا تیری دید سے اس کا چہرہ قمر ہوتا ہے ہیں تیرے چار سوار مسائل کتنے اور میر ہیں تجھ کو یہ وسائل کتنے کسی افلاس زدہ چہرے پہ نظر ڈالی ہے جس کی بھوک ناں شہینہ کی سواہی ہے سیلاب نے جس کے گھر وندے کو مٹا ڈالا ہے آندھیوں نے گھر کے چراغوں کو بجھا ڈالا ہے اور چلے ہو تم نے سال کا جشن منانے کیلئے اپنی دولت کو بے مصرف لٹانے کیلئے کچھ سستی کی؟ بھوک ان کی مٹائی تم نے؟ سوکھی روٹی کبھی پانی سے ہے کھائی تم نے پچی نیوایر کا کیک جوا بھی کاٹا ہے اس طرف دیکھ جہاں جینی ہے نہ آٹا ہے نصف شب کو فائرنگ ہوائی جو کہیں ہوتی ہے بیٹی مزدور کی چپکے سے کہیں روتی ہے ہائے کیا لوگ جنہیں گولیاں چلانے کو ملیں اور یہاں سر درد کی گولیاں بھی نہ کھانے کو ملیں ”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا“ ”راجتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا“

صافیہ سلطانہ

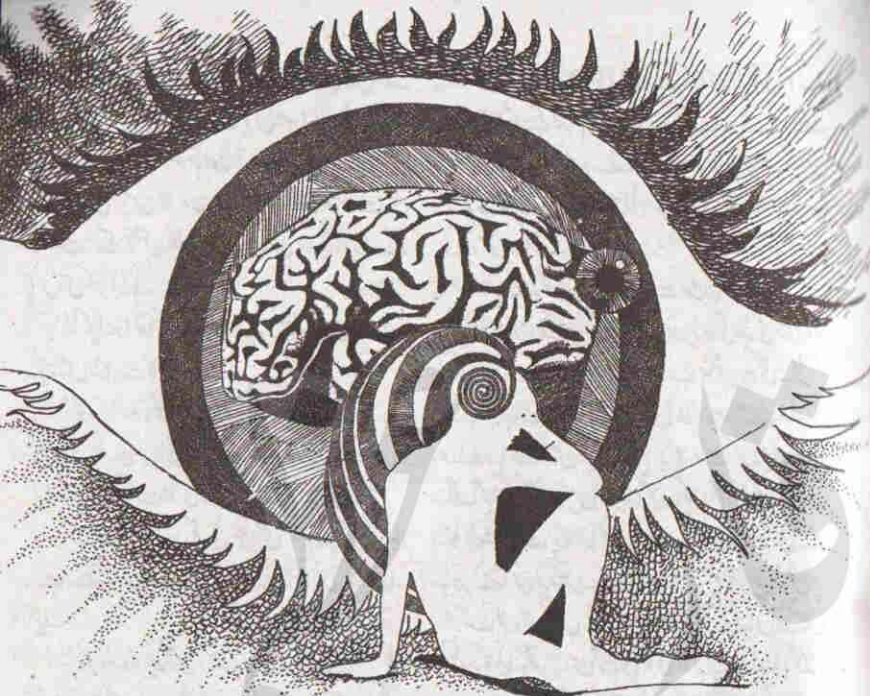
دانیال احمد

وہ تاریک سر درازات

پروین شاکر کا خیال

ایک آسیب کے مکان میں ہوں
اور رد بلا نہیں ملتا

ایک قتل کے گرد گھومتا پراسرار و چالاک قاتل کا حیرت انگیز احوال



نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ چند ساعت کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر ایک گہرا سانس میرے سینے سے برآمد ہوا اور میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے اور میری یادداشت بکھر چکی ہے انسپکٹر۔“ بلاخر میں نے کہا۔ بے بسی میرے لہجے سے عیاں تھی۔

”میرے پاس بہت وقت ہے۔“ دور بیٹھے انسپکٹر کی آواز گونجی ساتھ ہی چند من دبائے جانے کی آواز سنائی دی شاید اس نے میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے واکس ریکارڈ آن کر دیا تھا۔

”میں درمیان میں نہیں ٹوکوں گا“ تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا پھر چند ساعت خاموش رہا اس دوران ایک اہم فیصلہ لیا اور اس کے بعد اپنے ذہن اور زبان کو آزاد چھوڑ دیا۔

وہ رات انتہائی تاریک اور سرد تھی اور ہرگز رتے پل کے ساتھ اس کی تاریکی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ سردی سے میرے دانت بج رہے تھے اور کھٹ کھٹ کی عجیب و غریب آواز کانوں سے ہوتی ہوئی میرے ٹھنڈے ہونے بدن میں اتر رہی تھی۔ انسپکٹر تھوڑے فاصلے پر بیٹھا خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ بے صبرانہ نہیں تھا اور ایک ماہر سراخ رساں کی حیثیت سے انتظار کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھا۔ وہ میرے سامنے اپنے سوالات رکھ چکا تھا اور اب جواب کا منتظر تھا۔ میرے بازو میں شدید تکلیف ہو رہی تھی، حلق بھی خشک ہو گیا تھا۔ کمر تاریکی کی دبیز سرد چادر کی لپیٹ میں تھا۔ انسپکٹر زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا۔ میں نے خود سے کہا۔ میرے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے دھڑکن تیز تھی اور کئی بے رنگ مناظر میری نظروں کے سامنے بہت تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اچانک مجھے چکر آنے لگے اور میں

اب کمرے میں میری آواز گونج رہی تھی۔ وہ پراسرار بیت کی دھند میں لپٹی ایک سنسان رات تھی انسپکٹر! گھپ اندھیرے کو وقفے وقفے سے چرتی سانسیوں کی آواز پڑی ہی ہولناک معلوم ہوتی تھی۔ رات بلا کی سرد تھی اور میری انگلیاں میز پر دھرے گلاس پر لگی تھیں جس کی ٹھنڈک انگلی سے ہوتی ہوئی میرے جسم میں اتر رہی تھی۔ کسی نامعلوم مقام سے خون منجمد کر دینے والی ہوا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور ماحول کی پراسراریت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ٹھنڈ نے میرے بازو کے زخم کو مزید تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں خوف سے کانپ رہا ہوں۔

تاریکی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ کھڑکی سے بھی روشنی کے داغے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے اے مضبوطی سے بند کر کے پردے ڈال دیئے گئے

تھے۔ ہم چاروں اس تاریک ٹھنڈے کمرے میں گہرے گہرے سانس لے رہے تھے اور ایک گلاس پر انگلیاں ٹکائے بیٹھے تھے۔ اچانک سارہ زور سے چیخی اور ہڑبڑا کر میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے یوں چیخنے سے وہاں موجود باقی تین افراد بھی گھبرا گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں میز زور سے ہلنے لگی اور گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

”لائٹ آن کر دو۔“ علی نے تقریباً چیخنے ہوئے کہا اور اپنی منگیتر کو تھام لیا۔ میں تیزی سے سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا اور ہڑبڑاہٹ میں تمام بٹن بیک وقت دبا دیئے۔ تاریک کمرہ اچانک مصنوعی روشنی سے بھر گیا۔

کی صورت پر دھرے تھے۔ علی کی آنکھوں میں غصہ
تیر رہا تھا۔ وہ اپنی منگیت کے یوں گھبرا جانے پر جینی
سے شدید ناراض معلوم ہوتا تھا۔ دوسری جانب جینی
کھڑی تھی جس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ حالات کی
نزاکت کے پیش نظر میں خاموش سوچ بورڈ کے
پاس ہی کھڑا رہا۔

”کیا ہوا تھا؟“ جینی کے سرخ لب داہوئے۔
لہجے میں شکایت کا عنصر تھا۔

”وہ..... وہ گلاس حرکت کر رہا.....“ سارہ نے
ٹشے کی کچیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

”اسے تو حرکت کرنی ہی تھی، ہم روحوں کو بلا
رہے تھے۔ حد ہو گئی۔“ جینی نے ناراضی کا اظہار
کیا۔

”بس کرو دیکھ نہیں رہیں؟ کتنی ڈر گئی ہے؟“ علی
نے اپنی خوبصورت منگیت کے گرد اپنے بازو حائل
کرتے ہوئے کہا اور اسے دلاسا دینے لگا۔ جینی
خاموش ہو گئی اور نیل پالش سے رنگے اپنے ناخن
کتارنے لگی۔ اس کی نظروں سے ناپسندیدگی عیاں
تھی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

اچانک اس مرد کمرے میں ایک آواز کوئی جیسے
کسی نے دھیرے سے دستک دی ہو۔ میری نظریں
کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں، جینی کے چہرے پر
پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور سارہ کی کپکپاہٹ میں
اضافہ ہو گیا۔

”کوئی ہے۔“ جینی کے چہرے پر عجیب و
غریب طمانیت تھی جس نے مجھے وحشت زدہ
کر دیا۔ ”کوئی ہمارے درمیان موجود ہے۔“ اس کی
مسکراہٹ انتہائی گہری اور معنی خیز تھی۔

”بس کرو۔“ علی نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔
میں خاموش ہی کھڑا رہا۔

”کون ہے؟ اپنی شناخت کراؤ۔“ جینی آگے
بڑھی، اس کے قدم کھڑکی کی جانب اٹھ رہے تھے۔
”کون ہے؟“ اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ کھڑکی
کے ٹشے پر رکھ دیا جو انتہائی سرد تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا
وجود کھل رہا ہو۔

اچانک کوئی ٹشے زور سے کھڑکی کے ٹشے سے
ٹکرائی اور خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر
گئی۔ سارہ زور سے جینی اور بے ہوش ہو گئی۔ علی کو
اسے سنبھالنے کا موقع ہی نہیں ملا وہ سر اسیمہ دکھائی
دے رہا تھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے
لگ گیا مگر جینی وہیں کھڑی تھی۔ کھڑکی کے ایک پٹ
کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے
باہر سے اس پر پتھر دے مارا ہو۔ میری نظریں فرش پر
حرکت کر رہی تھیں۔ زمین پر ٹشے کی کرجیاں تو تھیں
لیکن کوئی پتھر یا اس قسم کی کوئی اور شے دکھائی نہیں
دے رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے کوئی انجان شخص مجھے ایک
خطرناک پیغام دینا چاہتا ہو۔ میرے بازو میں شدید
درد ہو رہا تھا۔ اچانک جینی کا چہرہ تن گیا۔ وہ مڑی اور
نیم بے ہوش سارہ کو گھورنے لگی۔

”تم نے اسے ناراض کر دیا، وہ بہت ناراض
ہے۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔ علی کی آنکھیں خوف سے
اٹل آئیں اور مجھے اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس
ہونے لگیں۔ میں شدید کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ
رات کچھ زیادہ ہی سرد تھی اور رات سے زیادہ سرد وہ
خنجر تھا جس کا دستہ میرے ہاتھ میں تھا۔

.....

”اوہ میں نے آپ کو جینی کے بارے میں بتایا
ہی نہیں انسپکٹر۔“ میں نے چوکھٹے ہوئے کہا اور
شعوری طور پر کچھ حال میں واپس آ گیا۔ انسپکٹر
خاموشی سے مجھے گھورتا رہا، اس کی پتلیاں ساکت
تھیں۔

”کیا ایک کپ کافی لمبے کی؟“ میری آواز میں
الٹا تھی۔ انسپکٹر نے سر کی حرکت سے اثبات میں
جواب دیا۔ کہیں دور مجھے کچھ حرکت محسوس ہوئی، شاید
کافی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ میں نے پھر اپنے ذہن
اور زبان کو آزاد چھوڑ دیا۔

”جینی یونیورسٹی میں سب سے الگ تھلگ رہتی
تھی اس کا سناورا رنگ بڑا ہی ٹیکھا تھا۔ عام لڑکیوں
کی طرح وہ شرماتے پر قطعی یقین نہیں رکھتی تھی۔
ہمیشہ سامنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
بات کرتی اور دوران گفتگو اس کی آنکھیں چمکتی اور
چمکتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ وہ جنیز پر لمبا گریز زہب
تن کرتی تھی۔ لباس کے معاملے میں ہمیشہ گہرے
رنگوں کا چناؤ کرتی اور زیادہ تر سیاہ رنگ کے کرتے
میں نظر آتی۔ اس کے گلے میں ایک لمبا سا مالا نما
لاکٹ پڑا رہتا جس کا آخری حصہ اس کے سینے سے
ہوتا ہوا ناف تک آتا تھا۔ بال گہرے سیاہ تھے ناخن
بڑھے ہوئے جن پر گہرے اور زیادہ تر تھکتی یا سیاہ
رنگ کی نیل پالش ہوتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر
زاویے سے بڑی ہی پراسرار معلوم ہوتی تھی۔

دیگر لڑکیاں اس سے کتراتیں تھیں۔ لڑکوں نے
بھی ابتدائی چیلد کوششوں کے بعد اس سے دوستی
کرنے کی خواہش ترک کر دی۔ دراصل اس میں کچھ
ایسا تھا جو سامنے والے کو خوف زدہ کر دیتا تھا۔ میں
بھی عام لڑکوں کی مانند شاید اس میدان میں ناکام
رہتا، تاہم خوش قسمتی سے میرا اس سے دوسرے روز
یونیورسٹی میں پھر سامنا ہوا۔ اس نے بہت ہی
دوستانہ انداز میں مجھے ”ہیلو“ کہا۔ میں نے بیچپن
ہوئے جواب دیا پھر وہ میرے نزدیک آ کر کھڑکی ہو
گئی اور موسم کی بابت گفتگو کرنے لگی۔ میں نے
صاف محسوس کی کہ دیگر لڑکے مجھے گھور رہے ہیں پاس
سے گزرنے والی لڑکیاں بھی ہم دونوں کو کٹن آنکھیں

سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے موسم کے بارے میں
بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی اور میں اپنی
گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں بٹا تھا۔

”موسم انسانی نفسیات کو بہت متاثر کرتا ہے یہ
آپ کی فحشی قوتوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتا
ہے۔“ اس نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
”ہاں تو ہے۔“ میں نے مسکرائے کی کوشش
کی۔

”یہ عمل تو ہم کے لیے بھی سازگار ہے۔“ اس
کی آنکھوں میں چمک تھی جو شاید آئینہ جینی کی مسلسل
مشق کی ذہن تھی۔
”ہاں بالکل درست۔“

”مسٹر فیض، کیا آپ میری ہر بات کے جواب
میں ہاں ہاں ہی کرتے رہیں گے؟“ وہ پرامتداد انداز
میں مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے میرے اعتماد
کو کھلایا۔ میں نے ہڑ بڑا کر ادھر ادھر کی تلاش میں
ادھر ادھر نظریں دوڑائیں پھر پاس سے گزرتے علی
اور سارہ کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

”جینی، ان سے ملیں، یہ دونوں میرے دوست
ہیں علی اور سارہ، دونوں کی معافی ہو چکی ہے۔“ جینی
ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ میں نے صاف محسوس کیا
کہ علی کی آنکھوں میں اشتیاق ہے جبکہ سارہ کچھ
پریشان دکھائی دے رہی ہے۔ وہ عام طور سے
پریشان ہی دکھائی دیتی تھی۔

”ہیلو.....“ سارہ نے ہاتھ آگے بڑھایا جس
سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے علی کی جانب ہاتھ
بڑھا دیا۔ پہلے علی جھجکا پھر اس نے بھی مسکراتے
ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ہم چاروں کے درمیان چند ساعت خاموشی
چھائی رہی پھر جینی کی بھاری اور پراسرار معلوم ہونے
والی آواز فضا میں گونئی۔

”آپ لوگوں کو جلدی نکل جانا چاہیے شاید آج تیز بارش ہو۔“ وہ علی اور سارہ سے مخاطب تھی۔

”بارش.....؟“ سارہ کی آنکھوں میں طنز کی جھلک تھی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

”ایسے امکان تو نہیں۔“

”غیر امکانی معاملات کو امکانی ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“ جینی اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”بھئی، موسم کا تو کچھ پتا نہیں چلتا نا۔“ میں نے بات سنبھالنے کے لیے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔“ علی، جینی کی پراعتماد شخصیت میں بھرپور دلچسپی لے رہا تھا۔ کچھ دیر ہم چاروں وہیں کھڑے رہے پھر مخالف سمتوں میں چل دیے۔

میں عجیب کیفیت کا شکار تھا، ایک جانب میں جینی سے گھبرایا ہوا تھا، دوسری جانب مسرور تھا کہ اس نے مجھے دوستی کے لیے چنا۔ میرا خیال ہے کہ سارہ کو جینی پسند نہیں آتی تھی جبکہ علی جینی کے بارے میں مزید جاننے کا خواہش مند تھا۔

اس روز بہت تیز بارش ہوئی۔ ہم سب کافی دیر یونیورسٹی میں پھنسے رہے۔ میں، علی اور سارہ زینے کے نیچے کھڑے تھے اور جینی کی پیشگوئی کی درستی کی بارے میں بہت خجندیگی سے بات کر رہے تھے۔ علی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”مخترمہ موسم کا حال بھی جانتی ہیں۔“

”ہاں، ویسے بہت دلچسپ ہیں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”سو تو ہیں ویسے ہیں کہاں؟ غالباً گھر چلی گئی ہوں گی۔“ علی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ دیکھو۔“ سارہ کی آواز میں ہراسمکی تھی وہ انگلی سے دور کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ ہم دونوں کی نظروں نے اس کے ہاتھ کا

تغاقب کیا اور لان میں اتر گئیں جہاں جینی بازو کھولے کھڑی بیٹھ رہی تھی۔

”انسپکٹر، وہ لمحہ حیران تھا، ہم تینوں حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر ہم نے دیکھا کہ اس کے بازو دست گئے ہیں اور اب وہ سیدھی کھڑی ہے پھر وہ آگے کی جانب بڑھنے لگی۔“

انسپکٹر اس روز تیز بارش کے ساتھ ساتھ طوفانی ہوا بھی چل رہی تھی جس کا جھکڑ ہمارے سامنے پانی کی ایک دیواری کھڑی کر دیتا تھا۔ یہ عمل تیزی سے وقوع پزیر ہو رہا تھا اور جینی کی شبیہ دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر وہ غائب ہو گئی۔ ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

.....

کافی میرے سامنے لا کر رکھ دی گئی جس کے چند گھنٹے میں اس نے اتارنے کے بعد میں خود زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگا۔

”آپ کو شاید میرا انداز عجیب معلوم ہو رہا ہو، انسپکٹر، لیکن میں مجبور ہوں حالات و واقعات جس طرز جس ترتیب سے میرے ذہن کے پردے پر منعکس ہو رہے ہیں اسی طرز اسی ترتیب پر میری زبان انہیں ادا کر رہی ہے۔“ میں نے اندھیرے میں بیٹھے انسپکٹر سے کہا جو جواب میں خاموش رہا۔

میں ہر جھٹک کر دوبارہ یادوں میں کھو گیا۔

”تو انسپکٹر، اس عجیب و غریب واقعے کے بعد چند روز تک وہ ہمیں یونیورسٹی میں دکھائی نہیں دی پھر ایک دن جب ہم کینیڈین میں بیٹھے تھے وہ ہماری ٹیبل تک آئی اور زور سے ”ہیلو“ کہا۔ ہم تینوں نے چونک کر اسے دیکھا اور ہمارے ذہن میں اس طوفانی بارش کے منظر گھومنے لگے۔

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دھیرے دھیرے ہمارے درمیان انگلیٹو شروع ہوئی۔ علی نے اس شام کا ذکر خصوصی طور پر کیا لیکن وہ بڑی خوش اسلوبی سے ٹال گئی۔ اس روز سارہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

پھر ہماری باقاعدگی سے ملاقات ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ علی اور سارہ کے سامنے عام موضوعات پر بات کرتی ہے لیکن جب صرف ہم دونوں ہوتے ہیں تو مخفی علوم کا موضوع چھیڑ دیتی ہے چونکہ مجھے بھی ان علوم میں خاصی دلچسپی تھی اس لیے ہماری گفتگوں گفتگو ہوتی۔

ایک روز اس نے مجھے شیخ نبی کی مشق کے چند اہم پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ میں نے شیخ نبی کی کبھی باقاعدہ مشق نہیں کی تھی لیکن اس کی ہدایت پر اس روز میں کافی دیر تک موم بتی کی کوکتار بایا ہوا تک کہ میری آنکھیں دکھنے لگیں پھر اس نے مجھے پناؤم پر چند کتابیں دیں جن کا میں نے بہت دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ اس کے کہنے پر میں نے آئینہ نبی کی مشق شروع کر دی۔

ایک دن میں نے مسکراتے ہوئے کہا دیا کہ مخفی علوم کے میدان میں میں اس کا مرید ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ”تو بیعت ہو جاؤ.....“ اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا۔

”آج سے تمہاری روح میری ہے اور اب تم میرے ہی احکامات پر عمل کرو گے۔“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا دیا۔ چند ساعت اس کی نظریں میرے چہرے کی ریں ان میں کچھ عجیب تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں تم تیار ہو؟“

اس کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ ”انسپکٹر.....!“ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور کپ میز پر رکھ دیا۔

”کہتے رہو، میں سن رہا ہوں۔“ دور سے آواز آئی۔

”ٹھیک ہے اب جو واقعہ میرے ذہن میں آ رہا ہے، پتا نہیں آپ کو اس میں دلچسپی ہوگی یا نہیں؟ تاہم یہ میری یادوں میں محفوظ ہے اور میں خواہش مند ہوں کہ آپ اسے سنیں۔“ یہ کہہ کر میں نے یادیں کریدنا شروع کر دیں۔

اس روز سارہ انتہائی گھبرائی ہوئی تھی، وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی، اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ ہماری ملاقات باقاعدہ ایسے ماحول میں ہوئی جو ہمیں قریب لانے میں مددگار ثابت ہوا۔

اکتوبر کی اس ششدری دوپہر میں شہر کے وسط میں واقع ایک ہوٹل کی لابی میں کھڑا تھا۔ چند منٹوں پہلے خرم سعید میرے سامنے کھڑا مابعد الطبیعیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ خرم سیمینار منعقد کرنے والی تنظیم کا سینیئر نمائندہ تھا۔ میرے سر میں کبھی کبھار شدید درد اٹھتا تھا۔ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں باقاعدگی سے دوا لے رہا تھا تاہم افاتے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی، سو میں نے ”سیلف پناؤم“ یا ”سیلف تھیسٹن“ کی تکنیک آزمانے کا فیصلہ کیا۔ خرم سے میں چند ماہ قبل اپنے ایک دوست ڈاکٹر ناصر کے کلینک میں پہلی بار ملا تھا اور اسی روز اس نے مجھے اس سیمینار کی بابت بتایا تھا۔ کبھی کبھار مجھے یوں محسوس ہوتا ہے انسپکٹر جیسے میں ڈاکٹر ناصر کے کلینک کے علاوہ کسی اور مقام پر بھی اس اساتذہ نو جوان سے مل چکا ہوں، تاہم کوشش کے باوجود اس مقام تک رسائی کی میری ذہنی کوشش کو ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ خرم

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

کے جانے کے بعد میں دیوار پر لگے پوسٹر پر غور کر رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک مانوس چہرہ میری جانب بڑھ رہا ہے۔ چونکہ ہم ایک ہی شعبے کے طالب علم تھے اس لیے ٹیلی پیسٹی پر ہونے والے اس سیمینار میں سلام دعا کا موقع ہاتھ آ گیا۔ کچ تو یہ ہے کہ اس نے پہل کی۔

اُس نے سر کے خفیف سے اشارہ سے مجھے ”ہیلو۔“ کہا۔ میں نے بھی جواب دے دیا پھر کچھ دیر بعد جینی میرے قریب آ گئی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس کی بھاری پراسرار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے پھر اس کی چبھتی ہوئی نظروں نے مجھے یقین دلوا دیا کہ وہ مجھ ہی سے بات کر رہی ہے۔

”خیریت ہے آپ؟“ میں نے تھوک نکلنے ہوئے جواب دیا۔ میری گھبراہٹ قابل فہم تھی۔ وہ ایک مشکل اور خطرناک معلوم ہونے والی لڑکی تھی جس سے ہمیشہ سردمہری کی توقع کی گئی لیکن آج وہ مسکراتے ہوئے اپنے شعبے کے ایک عام سے لڑکے سے گفتگو کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ سب میرے لیے غیر متوقع تھا۔

تعارف ہوا پھر ہم دونوں قریب رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ مکمل کربات کر رہی تھی لیکن میں احتیاط برت رہا تھا۔ جینی کے والد ایک بزنس مین تھے۔ وہ اکلوتی تھی۔ والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا سو اس نے زندگی کا بڑا حصہ تنہا گزارا۔ والد کا روبرو کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔ ایسے میں تنہائی سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے اس نے کتابوں سے دوستی کر لی۔ اس کی اصل دلچسپی مابعد الطبیعیات یعنی پیراسائیکالوجی کے موضوع میں تھی۔

پہلے اس نے ٹیلی پیسٹی اور پیناٹرم کے حوالے

سے دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا پھر ان کی مش کرنے لگی جس سے اس کی شخصیت میں تبدیلی آنے لگی۔ ”اب تو یہ علوم ہی میری زندگی کا محور ہیں۔“ جب اس نے یہ کہا تو میں حید خوف زدہ گیا پھر اس نے سوال کیا۔ ”آپ کو بھی ٹیلی پیسٹی میں دلچسپی ہے؟“

”جی ہاں لیکن میں آپ کے مانند اس کا زیادہ تجربہ نہیں رکھتا، ابھی طفل کتب ہوں۔“ میں مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں چمک بھی پھر وہ مجھ سے ہلکے چمکے انداز میں اس موضوع پر گفتگو کرتی رہی جب ہم سیمینار کے بعد ہوٹل سے باہر آئے تو رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ روایتی انداز میں۔ اس سے پوچھا کہ وہ گھر کس طرح جائے گی؟

”آپ بایک پر ہیں؟“ اس نے بڑی تکلفی سے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ میں ہلکا رہا تھا۔

”صحیح ہے تو آپ ریڈٹاور تک مجھے ڈراپ کر دیں۔“ اس نے بے فکری سے کہا اور میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بڑے آرام سے بایک بیٹھی۔ دوران سفر اس کے جسم کا بڑا حصہ میرے جم سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کے بدن سے تیز قسم کی پراسرار خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ ریڈٹاور تک کا فاصلہ چھپچھپ منٹ میں طے ہوا اور اس مختصر سے وقت میں مجھے اچھی لگنے لگی تاہم پسندیدگی میں خوف کا عنصر غالب تھا۔

.....

”بس کرو سارہ، کوئی نہیں ہے۔“ علی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں، کوئی ہے، کوئی.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

”ساری تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے دریافت کیا۔ وہ چند ساعت خالی خالی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

”تم لوگوں کو لگتا ہے کہ میں بیمار ہوں، نہیں، میں ٹھیک ہوں..... میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں، کوئی میرا بچہ کر رہا ہے۔“

”میرے خیال میں تمہیں اب گھٹیا ڈراونی فلمیں دیکھنا بند کر دینی چاہئیں۔“ علی نے برا سامنے ہاتھ ہوتے کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں علی، کل سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے..... جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔“ میں نے نہیں کیسے بتاؤں؟

”مجھے نہیں سنی یہ بکواس، تم خود کو سننا لو۔“ علی نے پیار سے اسے ڈانٹا۔ اچانک مجھے اپنی پشت پر عجیب سی حدت محسوس ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا

وہاں جینی کھڑی تھی۔

”کیا ہوا سارہ، تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے دریافت کیا۔ سارہ کی آواز بہت ہی دھیمی تھی۔

”ہوں..... بس ذرا طبیعت خراب ہے۔“

”نہیں، کوئی اور معاملہ ہے۔“ جینی نے وثوق سے کہا اور ہم تینوں چونک اٹھے۔

”مجھے بتاؤ۔“ اس نے مجھے اور علی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی توجہ کامرکز سارہ تھی۔ چند ساعت خاموشی چھا رہی تھی پھر اچانک سارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی نہ صرف میں بلکہ علی بھی گھبرا گیا۔

”کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ؟“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ سارہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ”کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے کل سے..... وہ پتا نہیں کیا ہے؟ میں بہت ڈر گئی ہوں۔“ میں اور علی حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ

تک رہے تھے جبکہ جینی سارہ کو تسلی دے رہی تھی۔

”یہ سب بکواس ہے۔“ اچانک علی نے کہا لیکن جب جینی نے اسے تیز نظروں سے گھورا تو وہ خاموش ہو گیا۔ سارہ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ جینی نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ لائبریری تک چلو وہاں مجھے سب بتانا۔“ سارہ کھڑی ہوئی اور جینی اسے سہارا دیتے ہوئے لائبریری کی طرف لے گئی۔ میں اور علی ہونٹوں کی طرح وہیں کھڑے رہ گئے۔

اس وقت میری نظر اس کالی بلی پر پڑی جو ایک کونے میں دیکے بیٹھی تھی۔ نہ جانے وہ وہاں کیا کر رہی تھی انکسپر؟

”سنو مجھے کچھ عجیب یاد آ رہا ہے،“ کیا ہوا تھا اس رات؟ ہاں یاد آیا، میری آنکھیں پھلنے لگیں پھر میرا چہرہ بگڑ گیا، مزید بگڑا پھر اس میں ایک نیا خوف ناک چہرہ ابھر آیا۔ میں نے گھبرا کر آئینے سے نظریں ہٹا لیں۔ مجھے آئینہ بینی کرتے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے اور اب مجھے آئینے میں عجیب و غریب عکس دکھائی دینے لگے تھے۔ چند ساعت میں یونیورسٹی ہاں پھر دوبارہ آئینے کی جانب توجہ مرکوز کی اور عین اسی وقت چھت پر کسی کے کودنے کی ہیبت ناک آواز سنائی دی۔ میں چونکا اور تیزی سے زینے کی جانب دوڑا۔ اب میں چھت پر تھا اور چاروں جانب نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا حالانکہ آواز انتہائی واضح تھی۔ ”کیا مجھے وہم ہوا تھا؟“ میں نے خود سے سوال کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا پھر میں ارد گرد کے مکانات کا جائزہ لینے لگا جو تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں واپس زینے کی جانب بڑھا اور خود سے کہا۔ ”یہاں کوئی نہیں، بس مجھے وہم ہو گیا تھا۔“ یہ سوچتے ہوئے میں نے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے پیچھے سے کسی نے مجھے پکڑ لیا

”جنگ تباؤں انکسٹر میری دل کی دھڑکن تیز ہو گئی“
لگا روح فنا ہونے والی ہے۔ ایک سیکنڈ کے ہزاروں
حصے میں خوف نے میری جان ہی نکال دی۔“ میں
فورا پلٹا پھر جان میں جان آئی۔ میری قیاس لو ہے
کے ذریعے کی ایک پتہری میں پھنس گئی تھی۔ میں مسکرایا
اور تو ہم پرستی پر لعنت بھیجتے ہوئے واپس اپنے کمرے
تک آ گیا جہاں آئینہ میرا منتظر تھا۔

”کیا یہ واقعہ تمہیں اہم نہیں لگتا انکسٹر؟ خیر یہ
میرے ساتھ پیش آنے والے عجیب و غریب
واقعات کا نقطہ آغاز تھا۔ ہاں اس کہانی میں اس
رات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ سنو انکسٹر وہ رات
انتہائی بھیا تک تھی۔

چھ سے نو کا شو دیکھ کر جب ہم سینما سے باہر نکلے
تو سردی کی تازہ لہر نے سڑکوں کو اپنی لپیٹ میں لے
رکھا تھا۔ فلم بہت دلچسپ تھی، مزاحیہ فلم دیکھنے کا
پروگرام علی نے ترتیب دیا تھا جو اپنی مضحکہ کی حالت
سے خاصا پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ اب سارہ
ڈراؤنی فلمیں دیکھنا ترک کرتے ہوئے ہلکی پھلکی
فلمیں دیکھنا شروع کر دے۔ اس نے مجھے اور جینی کو
بھی پیشکش کی جسے ہم نے قبول کیا۔

وہ تین گھنٹے ہم نے جیتے ہوئے پوپ کارن
کھاتے گزارے۔ جب ہم سینما سے باہر آئے اس
وقت ٹریفک خلاف توقع خاصا کم تھا ہم کپ شپ
کرتے ہوئے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہے تھے
جہاں میری اور علی کی موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔
اچانک میرے موبائل پر بچ کی ٹون بجی۔ میں نے
جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اس اثنا میں
علی سارہ اور جینی آگے بڑھ چکے تھے۔ پارکنگ ایریا
ایک چھوٹے سے پلاٹ پر مشتمل تھا جس میں داخل
ہونے کے لیے کوئی باقاعدہ دروازہ نہیں تھا، میں

سڑک والی دیوار کھلی ہوئی تھی یعنی وہ حصہ تین
دیواروں پر مشتمل تھا۔

میں نے موبائل پر آنے والے پیغام کا جواب
دیا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھائے۔ اچانک
ایک شخص تیزی سے پارکنگ ایریا سے باہر نکلا اور ہوا
کی رفتار سے میرے پاس سے گزر گیا۔ اس کا چہرہ
دیکھتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ شاید میں نے اسے پہلے
بھی کہیں دیکھا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں مڑا اور
ششدر رہ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں
میں بچ کھد رہا ہوں انکسٹر!

”یہ آدمی کون تھا؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔
”اسے میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ کہاں؟ ابھی چند
ہی روز تو ہوئے اسے میں..... اور پھر خوف کی سرد
لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ”خدا یا.....! یہ تو وہی چہرہ
تھا جو آئینہ بنی کے دوران مجھے دکھائی دیتا ہے۔“ میں
کانپ گیا۔

”فیضی.....!“ اچانک ایک اجنبی آواز میرے
کانوں سے نکلائی۔ میں مڑا جینی میرے پیچھے کھڑی
تھی۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے اجنبی آواز
میں سوال کیا۔ میں غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا
رہا جو بہت غیر مانوس لگ رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں
لگا جیسے منظر دھندلا رہا ہو پھر مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی
تیزی سے میرے قریب سے گزرا ہوا بالکل ہوا کے
مانند۔ ”خدا یا.....! وہی چہرہ۔“ میرے تو روگٹے
کھڑے ہو گئے تھے۔

”فیضی.....!“ کسی نے اچانک پکارا۔ میں
نے سر جھکا جینی میرے سامنے کھڑی حیرت سے
مجھے تک رہی تھی۔

”کیا ہو گیا؟“ اس کی آنکھوں میں تعجب تھا جو
کبھی کبھار ہی اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں داخل

ہو پاتا تھا۔

”کچھ نہیں“ کچھ بھی تو نہیں۔“ میں نے
مسکراتے کی کوشش کی۔ ”بس ایک ایس ایس ایم ایس کا
دوباب دے رہا تھا۔“ میرے اس جملے سے جینی کے
چہرے کا رنگ بد لگنے لگا۔

”کس ایس ایس ایم ایس کا جواب دے رہے
تھے؟“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر سوال کیا۔

”ارے موبائل ایس ایس ایم ایس.....“ میں نے
جیب میں ہاتھ ڈالا اور میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔
وہ رات طویل اور بھیا تک تھی انکسٹر میری
جیب میں موبائل فون نہیں تھا۔

میں نے دیکھا جینی عجیب نظروں سے مجھے گھور
رہی ہے اور اس کا ایک ہاتھ میں میرا موبائل فون
تھا۔

وہ لمحہ ناقابل یقین ناقابل بیان تھا میں سمجھ نہیں
پا رہا تھا کہ کس شے کس منظر پر یقین کروں؟

”یہ تم نے مجھے دیا تھا ناں فون کرنے کے
لیے۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اس دوران اس کی
نظریں میرے چہرے پر لگی رہیں۔

”ہاں ہاں دیا تو تھا۔“ مجھے یاد آیا کہ سینما سے
باہر آنے کے بعد میں نے اسے اپنا موبائل فون
دے دیا تھا۔ ہم دونوں چند ساعت وہیں کھڑے
رہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن خاموش رہی۔ میں
فائل جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے سو خاموش رہنے
میں عافیت جانی۔

”چلیں؟“ اس نے کہا۔ میں چونکا جیسے نیند
سے جاگا ہوں پھر پارکنگ ایریا میں داخل ہو گیا۔

.....

”انکسٹر کیا تم مجھے سن رہے ہو؟“ میں نے
الہامی میں بیٹھے دھندلے وجود سے سوال کیا۔
دوباب اندر۔

”شاید تم سو گئے ہو یا سونے کی اداکاری کر
رہے ہو؟“ میں نے کہا پھر اپنی کہانی شروع کی۔

اس دوپہر ڈاکٹر ناصر خاموشی سے مجھے تنگ رہا۔
”کب تک گھورتے رہو گے؟“ میں نے اکتا کر
سوال کیا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا پھر رائٹنگ پیڈ پر
جھک گیا۔ چند ساعت بعد ادویہ کی فہرست مجھے تھا
دی۔

”دو دن یہ میڈیسن لو پھر مجھ سے ملو یا درہے دو
دن۔“

”دوست“ تم بہت سنجیدہ لگ رہے ہو۔“ میں
نے مسکراہٹ کے پردے میں اپنا خوف چھپانے کی
کوشش کی تھی۔

”تو تمہارے خیال میں اگر میرے عزیز
دوست کو عجیب و غریب چہرے دکھائی دیں وہ وقت
میں تمیز کرنے کی بنیادی انسانی قابلیت کھو دے تو
مجھے سنجیدہ ہونے کے بجائے جشن منانا چاہیے۔“
اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

”چلو چلو سنجیدہ ہو لو رنجیدہ ہونے سے تو بہتر
ہے۔“ میں نے مصنوعی قوت پر لگایا جس سے اس کے
چہرے کا تناؤ بھی کم ہو گیا۔ اچانک ایک درمیانی عمر
کی نرس اندر داخل ہوئی۔

”ڈاکٹر ناصر امیر جینی ہے۔“ اس نے پیش
در انداز میں کہا اور ناصر اٹھ گیا۔

”تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں جانا مت۔“

”ہاں ہاں مجھے کہاں جانا ہے۔“ میں نے بازو
اٹھا کر سر کے پیچھے رکھ لیے اور کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔
ناصر اٹھ کر چاچکا تھا اور اب میں سنجیدگی سے حالات
پر غور کر رہا تھا۔

”انکسٹر معاملہ کچھ یوں ہے کہ گزشتہ چند روز
سے مجھے مسلسل کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا
تھا۔ کبھی کبھار مجھے ایسے چہرے دکھائی دینے لگتے

جن کے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں انہیں پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہوں، تاہم کہاں یہ بتانا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا کیونکہ چند ہفتوں سے مجھے شدت سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری یادداشت بکھرتی جا رہی ہے۔ مجھے اس بدبو کی بھی بہت فکر تھی جو اچانک میرے ہفتوں میں گھس جاتی اور ایسا اکثر ان مقامات پر ہوتا جہاں اس کی توقع نہیں ہوتی مثلاً ایک بڑے سے پارک میں ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں یا لائبریری میں جہاں اور بھی لوگ بیٹھے ہوتے، تاہم وہ سب اس حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے۔

بے شک ناصر کی پریشانی قابل فہم تھی، میں خود بھی پریشان تھا، تاہم میں نے اسے جیسی یا آئینہ بنی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، نہ جانے کیوں؟ میں نے خود کو یہ کہہ کر بہلا لیا تھا کہ ان معاملات کا تعلق کسی طور میرے موجودہ حالات سے نہیں۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اپنے بالوں میں کسی کی سرد انگلیاں حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوئیں اور میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی، میں مڑا اور حیرت و وحشت کا خبیث جھکا مجھ سے پوری شدت سے نکرایا۔

وہی نرس جو چند منٹ قبل ڈاکٹر ناصر کو ایمر جنسی وارڈ میں بلوانے آئی تھی، اس وقت میری پشت پر کھڑی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں اور وہ عمل توہم کے زیر اثر لگ رہی تھی۔

”آپ؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے لب داہوئے۔

”تم اس سے محبت کرتے ہو نا؟“

”کس سے؟“ میں بری طرح چونکا۔

”اسی سے جس کے حصول کے لیے تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔“ کفن سے مشابہہ

سفید لباس میں لمبوس نرس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ ایسے ادا ہوئے جیسے وہ انسان کے بجائے کوئی تشین ہو۔ ”انپکٹر“ میرے حواس محسوس کی جانب بڑھ رہے تھے۔

”کس..... کس کی بات کر رہی ہو تم؟“ میرا الجھ ترش تھا جو میرے خوف کی عکاسی کر رہا تھا۔

”سنو.....“ اچانک وہ مجھ پر جھک گئی اور اس کی سانس میرے چہرے سے ٹکرانے لگی۔ ”تمہیں اسے راستے سے ہٹانا ہوگا، اسے قتل کر دو.....“ سچ کہوں انپکٹر، میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے پرے دھکیل سکوں۔ میرے دل میں وہاں سے بھاگ جانے کی خواہش پوری شدت سے پھل رہی تھی۔

”کس..... کسے قتل کر دو؟“ میں نے تھوک نکلے ہوئے اس بدروح سے دریافت کیا۔

”کس سے باتیں کر رہے ہو فیضی؟“ اچانک مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھمائی، ناصر میرے پیچھے کھڑا عجیب سی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”وہ..... میں.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے کفن سے مشابہہ نرس کی جانب اشارہ کرنے کی خوف زدہ خواہش کے تحت انگلی اٹھائی لیکن وحشت میرا مقدر بنی۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ ناصر تیزی سے آگے بڑھا، اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا،

میں انتہائی خوف زدہ تھا اور سکتے کی کیفیت میں تھا۔ اس نے فوراً ایک دوا میرے حلق میں انڈر لی پھر ایک انجکشن لگایا پھر مجھے کاؤچ پر لٹا دیا۔ ”انپکٹر، اس روز

میں کافی دیر اسپتال میں رہا۔ واپسی میں ناصر مجھے گھر تک چھوڑنے آیا۔

”دوا ضرور لینا۔“ اس نے گولیوں کے تین پیکٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔“ میں نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”کوئی مسئلہ ہو تو مجھے فون کر لینا۔“ یہ کہتے ہوئے نگر بندی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

میرے ساتھ عجیب و غریب واقعات اس تیزی سے پیش آرہے تھے انپکٹر کے میں وقت کا تعین کرنے کی فطری صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا اور ایک دن جیسی نے ہم تینوں کے سامنے ایک عجیب و غریب تجویز پیش کی۔

”ہمیں روح بلانے کا تجربہ کرنا چاہیے۔“

”روح بلوانا..... کیا بکواس ہے؟“ علی نے برا سامنے بتاتے ہوئے کہا۔

”یہ فقط ایک کھیل ہے ڈیزر علی، تمہیں ڈرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔“ جیسی کی آواز میں شوخی تھی۔

”میں ڈرنے نہیں رہا۔“ علی کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”تو اس کھیل میں میرا ساتھ دو۔“ جیسی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور علی نے چند ساعت سوچنے کے بعد اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اور تم فیضی؟“ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں بھی ساتھ ہوں۔“ میں نے علی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہماری دیکھا دیکھی سارہ بھی اس عمل میں شامل ہو گئی۔ اب سارہ کا نرم گداز ہاتھ میرے

ہاتھ کی پشت پر تھا۔ ہم نے دوسرے دن جیسی کے گھر نلے کا پروگرام

عجیب دیا۔

.....

آہ..... وہ دن بھی عجیب تھا انپکٹر.....!

اس روز پروگرام ترتیب دینے کے بعد سارہ اور

علی ہم سے الگ ہو گئے۔ اب میں اور جیسی رہ گئے۔ ہم دونوں کینٹین کے ایک خاموش گوشے میں جا بیٹھے۔ ہمارے سامنے چائے کے کپ دھرے تھے۔

”میں تمہارے لیے ایک تھلا لائی ہوں۔“ جیسی نے یہ کہتے ہوئے کفٹ پیپر میں لپٹا ایک چھوٹا سا ڈبہ میری جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”گھر جا کر دیکھنا، ابھی اسے بیک میں رکھ لو۔“

جیسی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے یقین ہے، تم حیران رہ جاؤ گے۔“ میں نے کاندھے اچکائے

اور وہ ڈبہ بیک میں رکھ لیا۔ چند ساعت خاموشی قائم رہی۔ اس دوران صرف چائے کے کپ اٹھائے

چائے اور دو میز پر رکھے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اچانک جیسی نے ایک بے ٹکا سوال کیا۔

”فیضی، کبھی تم نے سوچا ہے کہ انسان اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کس حد تک جاسکتا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ وہ چند ساعت خاموش رہی پھر دور کی

نکتے کو گھورتے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا انسان اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے کسی کو قتل کر سکتا ہے؟“

”انپکٹر، اس کا سوال سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اسپتال میں

بیٹھا ہوں اور کفن سے مشابہہ لباس پہنے ایک نرس کا گرم سانس میرے چہرے سے ٹکر رہا ہے۔

”کیا تم کسی کو قتل کر سکتے ہو؟“ جیسی براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور عجیب سی روشنی میری آنکھوں سے ہوتی ہوئی بدن میں اتر رہی تھی۔ وقت جیسے رک سا گیا تھا۔

”فیضی.....! اسے قتل کر دو۔“ جیسی نے یہ کہا اور مجھے لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ دھوئیں میں تبدیل

.....

ہو رہی ہو اور یہ دھواں آنکھوں کے رستے میرے جسم میں اتر رہا ہو۔

کینٹین میں کام کرنے والے لڑکے کی کرخت آواز مجھے واپس دنیا میں لے آئی۔ ”سموئے“ صاحب.....! اس نے بڑے ہی بیھوش انداز میں میز پر سموے کی پلیٹ رکھی تھی جس میں صرف ایک ادھ جلا سموہ تھا۔

میں نے حال میں واپس آتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹے دو سموے کہے تھے ناں؟“ میں خود کو نارل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دو؟“ چھوٹے کی آنکھوں کی حیرت تھی۔ ”صاحب! آپ نے اپنے لیے ایک ہی سموہ منگوا لیا تھا؟“

”ارے بھئی! ہم دو ہیں۔“ میرا جلد ادھورا ہی رہ گیا انپکڑ کیونکہ سامنے کی کرسی خالی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں۔ میں نے میز پر نظریں دوڑائیں وہاں صرف ایک چائے کا کپ تھا جو میرے ہی سامنے رکھا تھا۔

میری حالت ناقابل بیان تھی۔ میں نے پرس سے پیسے نکال کر میز پر رکھے اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

”صاحب! بھائی پیسے تو لیے جاؤ؟“ چھوٹے نے آواز لگائی تھی لیکن میں نے اُن کی طرف سے نظر نہ اٹھایا۔

اب میں اپنی ہائیک اسٹارٹ کر رہا تھا۔ یونیورسٹی پر شام اتر چکی تھی اور خلاف توقع خاصی دیر لگئی تھی۔ اچانک مجھے چھوٹے کی آواز غیر متوقع طور پر انتہائی قریب سنائی دی۔ ”صاحب! بھائی!“ میں مڑا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا سناٹا منہ چڑا رہا تھا۔ میں کانپتے ہوئے ہائیک کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”اسے قتل کر دو.....“ ایک آواز میری سماعتوں

سے ٹکرائی لیکن میں نے مڑ کر دیکھنے کے بجائے ہائیک دوڑادی۔ کچھ کھوں انپکڑ پورے رستے عجیب و غریب آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں، کچھ کر میں بستر میں گھس گیا۔

میرا بدن تپ رہا تھا۔ اسی اثنا میں موبائل پر میں نے کانپتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی، دوسری طرف ڈاکٹر ناصر تھا۔

”فیضی.....! تم کہاں ہو؟“ اس کی آواز میرے جھانپاں میں۔

”میں.....“ کچھ تو یہ ہے کہ میں جواب دینے سے قاصر تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے جموٹ کا سہارا لیا۔

”تم اتنے دن سے کہاں ہو پاپا اسپتال بھی نہیں آئے؟“ اس کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

”میں..... آیا تو تھا..... پرسوں.....“ مجھے اس کی بات سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

”ایک ہفتہ ہو گیا ہے تم دوا لے رہے ناں؟ اور میرا فون کیوں نہیں اٹھاتے؟“ اس کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

”دوا..... وہ ہاں..... وہ تو.....“ میں بھٹکایا۔

”میں نے سارہ اور علی سے بھی بات کی ہے، تم بھی تمہارے بارے میں بہت پریشان ہیں۔ تم کو کر رہے ہو فیضی؟“ اس نے سوال داغا اور میرا پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”علی! میں تمہیں بعد میں فون کرتا ہوں۔“ میرا بھٹکل کہہ پایا اور فون بند کر دیا۔

اور بھلا میں کر بھی کیا سکتا تھا انپکڑ؟ میرے حواس پوری طرح معطل ہو گئے تھے۔ وہ دوسری طرف سے ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ اس رات مجھے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی رہیں اور میرے

میں گر پایا کہ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں؟

”انپکڑ! تمہیں میری کہانی عجیب لگ رہی ہو.....“ میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے سامنے

سنا جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ شاید اس سراغ رساں نے مجھے نہ ٹوکنے کے ساتھ ساتھ خاموش رہنے کا بھی

کر رکھا تھا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور یادوں کے

لی موڑ پر پہنچ گیا۔ اب میں کہہ رہا تھا۔

”انپکڑ! اس سرد تاریک رات جیسی بہت غصے

”تم نے اسے ناراض کر دیا؟“ اس نے با آواز

کہا۔ علی سکتے ہیں تھا جبکہ میں خاموش سوچ بورڈ

پاس کھڑا تھا۔

”وہ بہت غصے میں ہے۔“ جیسی کا لہجہ درست

ہا تھا۔ سارہ پوری طرح بے ہوش ہو چکی تھی اور

بلانے کا کھیل ایک ایسے کی شکل اختیار کر گیا

اور میں نے دیکھا جیسی کا چہرہ غصے کی شدت سے

گیا ہے۔ علی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو تک

تھا۔ بے ہوش سارہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر

خندے فرش پر بکھر چکی تھی۔ اس حالت میں بھی

ایک کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ میری نظر اس

کداز ہاتھوں کی جانب اٹھ گئی جنہیں کچھ وقت قبل

ایک روز پہلے میں نے چھوٹا تھا۔ وہ ہاتھ سفید

تھے۔ گوکہ میں خوف سے کانپ رہا تھا لیکن

دل میں ان ہاتھوں کو چونے کی قہقہہ خواہش

پہلے لگی اور یہ پہلا موقع نہیں تھا جب اپنے عزیز

کی منگیت کے ہاتھ چونے کی خواہش میرے

میں جاگی ہو۔

انپکڑ وہ دن گرفت میں نہ آنے والے واقعات

تھا۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ جیب

میں ہائیک اسٹارٹ فون مسلسل بج رہا ہے۔ دفعتاً مجھے

اپنے ہاتھ میں کسی انتہائی سرد شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر اپنے ہاتھ کی

جانب دیکھا۔ کیا تم میرا یقین کرو گے انپکڑ! وہاں

ایک خنجر تھا؟

خوف سے میری آنکھیں ابل پڑیں انپکڑ!

میرے شعور کا دروازہ بند ہوتا جا رہا تھا۔

”اسے قتل کر دو.....“ میرے کان میں سرگوشی

ہوئی۔ خوف سے میرے معدے میں سرسراہٹ

ہونے لگی۔ کفن سے سفید لباس میں بلبوس نرس

میرے پہلو میں کھڑی تھی۔

”صاحب! بھائی!“ چھوٹے نے دائیں جانب

سے میرا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے مجھے متوجہ کیا۔ اس

کے ہاتھ میں ایک گھٹ بکس تھا۔ اس سرد کمرے میں

آکسیجن کی کمی کی غیر شکل اختیار کر گئی تھی۔

”فیضی.....! کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے

آواز کی سمت دیکھا، دو شعلے اگلی آنکھیں مجھ پر کئی

تھیں۔

”فیضی.....! اسے قتل کر دو.....“ شاید وہ جیسی

کی آواز یا شاید کسی اور کی! میں سمجھ نہیں سکا۔ مجھ پر

کچھ کی طاری تھی اور پیروں پر کھڑا رہنا اب مزید ممکن

نہیں رہا تھا۔ اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

”اسے قتل کر دو.....! اسے قتل کر دو.....“ آواز

دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر کسی نے کہا۔

”تمہاری روح میری ہے اب تم میرے ہی

احکامات پر عمل کرو گے۔“ میں عمل تویم کے ذریعہ

آگے بڑھا اور علی کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ ہاں

انپکڑ! میں نے ایسا ہی کیا۔

اب میں سرد فرش پر بیٹھا تھا، ٹھنڈ میرے جسم

میں داخل ہو رہی تھی اور میرے اعضا ٹھنڈ ہوتے جا

رہے تھے۔ بے ہوش سارہ میری گود میں تھی اور

ہائیں ہاتھ میں تھا جسے خنجر سے خون ٹپک رہا تھا۔

”بس یہی میری کہانی ہے، بس اب میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے کچھ نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنا سر تھام لیا جو درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کمرے میں گزشتہ کئی گھنٹے سے تنہا بیٹھا ہوں اور انسپکٹر کی موجودگی فقط میرے خیال کی پیداوار ہے۔ وحشت ناک غنودگی نے مجھے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

انسپکٹر رضانے گرم کڑوی کافی کا گھونٹ بھر اور سامنے بیٹھے ڈاکٹر ناصر کو دیکھا جو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ”وہ کتنے عرصے سے زیر علاج تھا؟“ ناصر نے گہرا سانس لیا اور حال میں واپس آ گیا۔ ”فیض ڈیڑھ ہفتے پہلے مجھے ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے ہیں میں نے اسے کچھ ادویہ دی تھیں۔“ ”کس قسم کے واقعات؟“ انسپکٹر نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ناصر چند ساعت خاموش رہا پھر اس کے لب واہوئے۔

”یہ معاملہ بے حد پیچیدہ ہے۔ فیض اکلوتا ہے۔ اس کی والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کو کاروباری مصروفیات پریشان رکھتی ہیں۔ ایسے میں وہ کتابوں میں گم ہو گیا اور پیراسائیکالوجی میں دلچسپی لینے لگا۔“

”پیراسائیکالوجی یعنی ما بعد الطبیعیات؟“ انسپکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”ہوں.....“ ناصر نے پھر بات شروع کی۔ ”وہ ہمیشہ سب سے الگ تھلگ رہا، بس کتابوں میں گم رہتا۔ میں اسکول اور کالج کے زمانے میں اس کا واحد دوست تھا پھر میں میڈیکل کالج میں چلا گیا اور وہ یونیورسٹی۔ اس دوران وہ تقریباً پانچ ماہ اسپتال میں زیر علاج بھی رہا۔“

”کہاں نفسیاتی اسپتال میں؟“ انسپکٹر نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے وہ پاگل نہیں ہے۔ ایک حادثے میں اس کے سر پر چوٹ آ گئی تھی جس کی وجہ سے ایک سال تک اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔“ ”مقتول علی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”علی، فیض کا یونیورسٹی فیلو اور اس کا قریبی دوست تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے بعد علی ہی اس کا دوسرا دوست تھا۔“ ”اور سارہ؟“ انسپکٹر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”ساری، علی کی منگیت تھی اور فیض کو بھی جانتی تھی۔ میری بھی ان دونوں سے کئی بار ملاقات ہوئی۔“

”میری اطلاعات کے مطابق وہ کئی برس سے باقاعدگی سے آپ سے مل رہا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ صرف ڈیڑھ ہفتے قبل آپ نے اس کا علاج شروع کیا ہو؟ وہ ہر دو دن بعد آپ سے ملتا تھا، کیا یہ سچ نہیں ہے؟“ انسپکٹر اب ڈاکٹر ناصر کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”یہ سچ ہے لیکن وہ گزشتہ ایک ہفتے سے مجھ سے نہیں ملا۔“ ناصر نے کہا۔

”کیا یہ بھی سچ نہیں کہ وہ باقاعدگی سے آپ کو فون کیا کرتا تھا؟ آپ کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہوتا تھا؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”یہ سچ ہے۔“ ناصر متذبذب نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر نے سپرد ویت میز پر گھماتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”عجیب بات ہے ڈاکٹر، تمہارا ایک دوست یعنی

فیض تمہارے دوسرے دوست یعنی مقتول علی اور اس کی منگیت کو اپنے گھر مدعو کرتا ہے۔ ان میں سے ایک یعنی فیض، علی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک ایسے خنجر سے جو ہند روز قبل ایک پارسل کی صورت اسے بذریعہ ایک ملا ہوتا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں اس نے اس کیوں کیا ہوگا؟“ انسپکٹر کی آنکھوں میں چمک گئی۔

”شاید رقابت کی وجہ سے۔“ ناصر نے بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”اوہ تو تمہارا خیال ہے کہ فیض اپنے دوست کی منگیت سے محبت کرتا تھا؟“

”شاید؟“ ناصر نے کانڈھے اچکائے۔

”اس نے خون آلودہ خنجر سے دیوار پر ایک پیغام لکھا تھا“ آپ جانتے ہیں اس نے اپنے دوست یعنی علی کے خون سے اپنے کمرے کی دیوار پر کیا لکھا تھا؟“

”نہیں، میں نہیں جانتا۔“

”اس نے لکھا“ میں اس کے گھٹنے میں پھنس چکا ہوں، مجھے قتل کرنا ہی ہوگا.....“

”اچھا.....“ ناصر نے خود کو تارمل رکھا۔

”کیا آپ جینی کو جانتے ہیں؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”ہاں اس نے ذکر کیا تھا، شاید اس کی کلاس فیلو تھی۔“

”اچھا، عجیب بات ہے۔“ انسپکٹر نے آگے بڑھ کر کہنیاں میز پر ٹکالیں اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر، جینی نام کی کوئی لڑکی کبھی

کی ہی نہیں۔ میں یونیورسٹی ریکارڈ چیک کر چکا ہوں، کوئی ایسا شخص اس کے خیال کی پیداوار ہے۔ کیا تم جانتے

ہو؟“ ”اقتال نے خنجر اپنے دوست کے سینے میں اتارنے والی اس کی نوک سے اپنے بازو پر لکھا تھا۔ جینی

وہ کہتا ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا آپ اس عجیب و غریب پراسرار جملے کا مطلب بتا سکتے ہیں ڈاکٹر؟“ انسپکٹر کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ ڈاکٹر ناصر نے پہلو بدلا۔

”غور کریں، آپ تو ڈاکٹر ہیں گوکہ میرا شعبہ تفتیش ہے لیکن میں نفسیاتی پہلوؤں پر خاص غور کرتا ہوں۔ نفسیات میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ کیا یہ خیال عجیب نہیں ہے کہ وہ جذبہ رقابت کے تحت اپنے عزیز دوست کو قتل کر دیتا ہے؟ کیا جذبہ رفاقت؟ وہ خود ایک خیالی لڑکی کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے، اس نے اپنے مقتول دوست کی منگیت میں کوئی دلچسپی نہیں لی پھر آخر قتل کا سبب کیا ہے؟ یہ تو بہت عجیب ہے ڈاکٹر؟“ انسپکٹر نے طنزیہ قبضہ لگایا۔ ناصر خاموش رہا۔ انسپکٹر نے پھر بات شروع کی۔

”وہ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرنے کا دعوے دار ہے جو موجود ہی نہیں رہتی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے کوئی اور شخص یہ یقین دلا رہا ہے کہ وہ جینی سے محبت کرتا ہے۔ کیا اس کے دونوں پیغامات دلچسپ نہیں؟ پہلا پیغام۔ جینی، میں اس کے گھٹنے میں پھنس چکا ہوں، مجھے قتل کرنا ہی ہوگا۔ اور دوسرا۔ جینی، وہ کہتا ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ڈاکٹر، یہ شخص کون ہے جس کے بارے میں دونوں پیغامات میں خفیف سا اشارہ ہے؟“

”آپ اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“ ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔

”کاش، یہ ممکن ہوتا لیکن وہ انتہائی مہلک ادویہ کے زیر اثر تھا جنہوں نے اس واقعے کے فوراً بعد اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے ایک عجیب و غریب کہانی

سنانے کا موقع ضرور ملا لیکن وہ کہانی بھی لاحقہ حاصل تھی۔ ماہرین کے مطابق وہ اپنی یادداشت اور حواس بڑی حد تک کھو چکا ہے۔ مجھے بتاؤ ڈاکٹر وہ شخص کون ہے؟

”میں نہیں جانتا۔“ ناصر نے کانڈھے اچکائے۔ انسپکٹر چند ساعت خاموش رہا پھر کافی کا آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھ دیا۔

”سنو ڈاکٹر تمہارے دوست کے گھر میں کاغذات جلائے جانے کے کئی عجیب و غریب نشانات ملے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ کیا وہ خود سے ایسا کر رہا تھا یا کوئی اس سے یہ سب کروا رہا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ ناصر پریشان تھا۔

”میں جہاں لوں گا کہ آپ میری مدد کریں ڈاکٹر“ اس کے ساتھی طلبا اور اس کے والد کے مطابق وہ گزشتہ چند ماہ سے عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ جلدی ہوئے کاغذات کی راکھ سے ایک ادھ جلا پڑہ بھی ملا ہے جس پر کسی کا حلیہ درج ہے۔ سننا چاہیں گے اس پر کیا لکھا ہے؟“

”ضرور۔“ ڈاکٹر نے مصنوعی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انسپکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سنیں اس پر لکھا ہے رنگ سانولہ پر اعتماد چمکتی ہوئی آنکھیں، گہرے رنگ کے بلوسات ایک لمبا سالا کٹ بڑھے ہوئے کتھی ناخن کیا آپ کے خیال میں یہ جتنی نامی کردار کا حلیہ ہے؟“

”شاید۔“ ناصر نے کہا۔

ڈاک خانہ کے ریکارڈز کے مطابق اسے باقاعدہ سے مختلف تپوں سے خط ملتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ انہیں ضائع کر دیا کرتا تھا۔ کیا آپ کو عمل سے دلچسپی ہے ڈاکٹر؟“ انسپکٹر کی آواز میں گہرا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ناصر نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر نے اس لفظ کو خاصا کر ادا کیا۔ ”کیا آپ خرم سعید نامی ایک ٹیلی اور پٹنا ٹرم کے ماہر کے ساتھ علاج کے غیر طریقوں پر تحقیق نہیں کر رہے تھے؟“

”وہ ایک این جی او کا پروگرام تھا بس۔“ ڈاکٹر نے پہلو بدلا۔ ”اسپتال کی ایک نرس کے مطابق فیض کی سب سے باقاعدگی سے آپ کے دفتر کے چکر لگا رہا تھا۔ خرم سعید کا بیان لیا جا چکا ہے جس کے مطابق آپ نے فیض سے اس کی ملاقات کروائی تھی اور بعد اس کا کیس بھی اس سے ڈسکس کیا تھا۔ آپ کہیں کہ وہ صرف ڈیڑھ ہفتے قبل علاج کے لیے آپ کے پاس آیا تھا۔“

”دیکھیں۔“ ناصر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”وہ میرا دوست تھا وہ باقاعدگی سے مجھ سے ملتا تھا لیکن علاج کا سلسلہ ڈیڑھ ہفتے پہلے ہی شروع تھا۔ جہاں تک خرم سعید کا سوال ہے اس ملاقات اسپتال میں شروع ہونے والے پراجیکٹ کے سلسلے میں ہوئی تھی بس۔“

”کیا آپ نے اسے کوئی دوا دی تھی؟“ انہوں نے چند رنگین گولیاں ناصر کے سامنے رکھ دیں۔ ”یہی وہ گولیاں ہیں؟“ چند لمحے غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

”نہیں اور میرے خیال میں یہ ایلو پیتھ میڈیسن نہیں ہیں یہ دیسی ساختہ ہیں۔“

”ماہرین کے مطابق یہ نہ صرف ٹیلی ہیں بلکہ لہریلی بھی ہیں۔ سنا ہے آپ کے والد حکمت ہاتھ ہیں؟“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ ناصر دھاڑا۔

”جتنی مت ڈاکٹر۔۔۔۔۔!“ انسپکٹر نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ ”غور سے سنئے اس نے علی کو قتل کرنے سے قبل آپ کو کال کی تھی؟“

”ہاں لیکن میری اس سے بات نہیں ہو سکی تھی میں فون ریسیو نہیں کر سکا تھا۔“ ناصر نے ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں کر سکے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے؟“

”انسپکٹر آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”سنیں ڈاکٹر۔۔۔۔۔!“ انسپکٹر مسکرا رہا تھا۔ ”کتھی

عجیب بات ہے جتنی کا حلیہ اس لڑکی کی پیٹنگ سے بہت ملتا ہے جو آپ کے کلینک میں آویزاں ہے۔“ ناصر بری طرح چونکا۔

”ڈاکٹر میری تفتیش جاری ہے آپ شہر چھوڑ کر مت جائیے گا۔“ انسپکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ناصر نے گہرا سانس لیا۔

.....

عدالت نے مجھے دماغی مریض قرار دیتے ہوئے پاگل خانے بھیج دیا تھا جہاں ایک سال میرا علاج جاری رہا۔ شاید میں چند برس مزید پاگل خانے میں رہتا لیکن پھر میرے رئیس والد مجھے وہاں سے نکال لائے اور مجھے مزید علاج کے لیے لندن بھیج دیا جہاں کا پرفضا ماحول بحالی صحت میں خاصا معاون ثابت ہوا۔ ایک خوشگوار شام جب میں ایک پارک میں بیٹھا تھا کسی نے میری آنکھوں کو اپنے دم گداز ہاتھوں سے ڈھک لیا تھا۔

”تم آگئیں بڑا انتظار کروایا؟“ میں مکمل یقین کے ساتھ بولا تھا۔ وہ کلکلاتے ہوئے میرے

سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اس خوشگوار شام وہ بہت ہی دلکش لگ رہی تھی۔

”میں نے سوچا جہاں اتنے ترپے ہو توڑ اور ترب لو۔“ سارہ کی شوخ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پھلانے لگی تھی۔

”تم نے یہ کر دکھایا فیض؟“

”ہم نے۔۔۔۔۔ ہم نے یہ کر دکھایا۔“ میں مسکرایا تھا۔ ”یہ ہماری مشترکہ کامیابی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا حصول فقط اسی طرح ممکن تھا بس ڈاکٹر ناصر کا افسوس ہے۔ کیا خبر ہے اس کی؟“

”اس پر کیس چل رہا ہے شاید واضح ثبوت نہ ہونے کے باعث وہ جج جائے اور تمہیں زیادہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں مجھے اس اذیت سے نجات دلانے کا فقط یہی ایک طریقہ تھا۔“ سارہ نے گہرا سانس لیا تھا۔

”کیا تم نہیں جانتے؟“ میں علی سے کس قدر نفرت کرتی تھی اس کے ساتھ ایک لمحہ بھی مشکل سے گزرتا تھا۔ گھر والوں کے دباؤ پر مجھے اس سے منگنی کرنی پڑی تھی ورنہ۔۔۔۔۔

”اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا رہنے دو۔“ میں نے بازو اس کے گرد حائل کر لیا تھا۔ ”خوش قسمتی سے انسپکٹر ابھی پراسرار کہانیوں میں دلچسپی تھی اسے یقین دلانا خاصا آسان رہا تھا۔“ اس نے اپنا سر میرے کانڈھے پر رکھ دیا۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ؟“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”ارے میرا باب ایک امیر کبیر آدمی ہے اور مجھ سے بہت محبت کرتا ہے بس اب ہم ہیں اور یہ زندگی ہے۔“ اور اب زندگی کا ایک خوبصورت سفر جاری ہے۔

شہید کی کہانی | ہمارے وطن کا دفاع کرنے والے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوج

منزہ سہام مرزا

شہید کی کہانی

علامہ اقبال کی پرواز خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشے والے شہیدوں کے بارے میں سوج بنی ایک نیا دلگداز سلسلہ

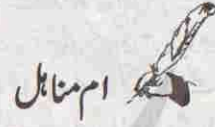
میں 1965ء کی جنگ کا ایک گمنام شہید ہوں۔ اپنے پاک وطن کے لیے اپنی جان قربان کی ہر سپاہی طرح مجھے بھی اپنے وطن سے عشق تھا اس کی طرف اٹھنے والی ہری نظر کو کچلنے کی آرزو تھی۔ میرے وطن کی عزت میری جان سے بہت اہم تھی، محاذ جنگ پر جانے سے قبل اللہ سے شہادت کی دعا کی۔ وقت رخصت ہوڑھے باپ سے دعائیں لیں اور ان سے عہد لیا کہ وہ صرف یہ دعا کریں کہ یا تو شہادت کا رتبہ پاؤں یا پھر غازی بن لوں۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب خاموش تھے میری خیمی فاطمہ جو صرف دو ماہ کی تھی اس کی کودھی تھی۔ میرا شیر افضل گلی کے کنڑنک میرے پیچھے بھاگا تھا، میں نے آنکھوں میں آئے پانی کو ہاتھوں سے رگڑا کیونکہ میری پاک سرزمین مجھے پکار رہی تھی۔ شیر افضل کو بھیج کر پیار کیا اور بناڑ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اپنا اپنے وطن پر قربان کر کے بہت خوش ہوں کہتے ہیں تاکہ شہید بھی مرانہیں کرتے تو میں بھی آسمان کی وسعت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ دکھوں نے دل شق کیا تو خوشیوں نے سکون عطا کیا۔ بہت دقت بیت گیا میری بھی بڑی ہو گئی جب گھر سے نکلا تھا تب ماں کی کود میں تھی اور شیر افضل دوڑھالی سال کا رہا ہوگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ پہلے اسکول اور پھر کالج گیا اور پھر اسی کالج میں پروفیسر ہو کر ماں کا سہارا بن گیا۔ شیر افضل کی بڑی نیک بخت عورت ہے۔ ساری زندگی میرے بنا گزاردی صرف اور صرف میرے بچوں کی خاطر۔ اس پر فخر ہے۔ میری گڑیا اب دو گزریوں کی ماں ہے۔ یہ سارا وقت ان لوگوں نے میرے بغیر اور میں نے ان بغیر گزارا کروہ تہانہ تھے انہیں اپنوں کا ساتھ حاصل رہا، چچی دھوب ان کھلانے میں ناکام رہی کیونکہ سنا سنا موجود تھا میری بیوی کو دیکھ کر عزت و احترام سے جھکنے والی نظریں مجھے ہمیشہ بہت عزیز رہیں۔ میرے بچوں سر پر دست شفقت رکھنے والے ہاتھ مجھے بہت پیارے رہے۔ میں سب کچھ دیکھتا رہا، محسوس کرتا رہا دل اطمینان اترتا رہا کیونکہ شہید بھی مرانہیں کرتے۔ میں ان کے آس پاس ہی رہا جب جب وطن عزیز کو کسی مشا

میں دیکھا تڑپ تڑپ گیا کہ ایک بار اور زندگی ملے اور میں پھر اپنے وطن پر قربان ہو جاؤں۔ پھر ایک بڑی ناک رات آئی۔ دریا پھر گیا۔ پانی کناروں سے چھلک پڑا۔ بے خبر سوئے ہوئے لوگ اس بے قابو ہولناک دریا کی نذر ہو گئے۔ مال و متاع برباد ہو گیا۔ اپنوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ہائے! اپنوں نے کادھ وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس تکلیف سے گزرا ہو، میرا دل غم سے بھر گیا۔ یا اللہ! مجھے ایک موقع اور دے میں ان خانماں برباد لوگوں کو بچا سکوں۔ ارے یہ سسکیاں کس کی ہیں! تو میری گڑیا جیسی ننھی سی بیٹی ہے جو بلک بلک کر رو رہی ہے۔ شاید اپنے بابا کو ڈھونڈ رہی ہے۔ میری گڑیا بھی مجھے نہ پا کر ایسے ہی روئی ہوگی۔ ارے یہ تو میرے شیر افضل جیسا ہے جو اپنی ماں کا پلو پکڑے گردن گردن پانی میں ڈوبا کنارہ تلاش کر رہا ہے۔ لی بہت زور آور ہے یہ ننھا شیر افضل کیسے اپنی ماں کو بچا پائے گا۔ میں بے چین ہوں، میں کیوں یہ سب محسوس کر رہا ہوں۔ آخر وہ ہاتھ کہاں ہیں جو آگے بڑھ کر ان ڈوبے ہوؤں کو تھام سکتے ہیں۔ اوہ پیارے کہاں ہیں کسی گڑیا کے آنسو پونچھ سکتے ہیں۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟ مجھے ایک بار اور زندگی عطا فرماتا کہ میں اپنے ہم وطنوں کی مدد کر سکوں۔

ارے یہ کون ہے جو پانی میں کود پڑا؟ یہ کون ہے جو موذی سانپوں کو ہاتھوں سے جھٹکتا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ غامی و ردی میں ملیں جو ان ہے! یا اللہ! تیرا شکر ہے اب سب ٹھیک ہو جائے گا، ننھی گڑیا اب نہیں روئے گی۔ شیر افضل کنارے تک ضرور پہنچے گا۔ یہ انسان کے روپ میں فرشتہ کس دلیں کا ہے؟ یہ جان کی بازی ہارنے والا کون ہے؟ ارے یہ تو میں ہوں۔ میں بھی تو ایسا ہی تھا۔ اپنی گڑیا اور شیر افضل کو تنہا کر کے بہت ماری گڑیاؤں اور شیر افضل کو بچانے والا۔ اپنی نیک بخت کو بیوی کی چادر اوڑھائی، بے شمار بہنوں کے سروں پر اور سلامت رکھنے والا گمنام سپاہی جسے نہ ہندوں سے صلے کی امید نہ انعام کی طلب جو صرف اپنے فرض کو عزیز سمجھتا ہے جو صرف اپنے وطن کی خاطر جان دینا جانتا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ میرے وطن کو کوئی سیلاب کوئی زلزلہ کوئی مشکل نقصان نہیں پہنچا سکتی اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ جس وطن کے بیٹے اپنی جان دینا جانتے وہاں ہاں ہر دن روشن اور ہر صبح چمکی اور تابناک ہوتی ہے۔ !!!

شہید وطن





میں جس ڈنگر چٹھی

نرسین کھت ہزاروں کا خیال
نہ کوئی آس، نہ امید، آرزو، نہ فریب
اتر گئی ہے مرے دل سے زندگی جیسے

مردوں سے کھیلنے والی اس عورت کی روداد جو خود کھلونا بن گئی تھی



حنا اور صبا دو الگ نام ہیں مگر مفہوم تقریباً ایک جیسے ہیں۔ حنا کے معنی ہیں مہندی جو پتھر پہ پینے کے بعد رنگ لاتی ہے اور جس جگہ لگ جائے تو جگہ چھوڑنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہے اور تھوڑے دن رہنے کے بعد ہلکی ہو کر ختم ہو جاتی ہے اب یہ رچی ہوئی مہندی کسی کی زندگی میں رنگ بھر دیتی ہے تو کسی کی زندگی کو رنگوں سے محروم کر دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ایک دفعہ اجڑنے کے بعد میری زندگی میں جو خوشیاں آئیں وہ بھی غم سے بھر پور تھیں مگر میں نے قسمت کا لکھا قبول کر لیا کیونکہ قدرت نے مجھے میرے کیسے کی سزا دی تھی۔

صبا کے معنی ہیں ”ہوا“ جو نظر نہیں آتی، صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ ہوا نہیں چلتی ہے تو بھی اپنا اثر دکھاتی ہے اور چلتی ہے تو بھی۔ جب ضرورت سے زیادہ چلتی ہے تو ایسی آندھی طوفان کی طرح کہ اپنے ساتھ کتنی چیزوں کو اڑا لے جاتی ہے اور نہیں چلتی ہے تو ”جس“ کی صورت میں بے چین کرتی ہے۔ لہذا صبا بھی ہلکی ہلکی، خوشگوار دھیمی دھیمی چلتی ہوئی اچھی لگتی ہے اس سے کم زیادہ ہو تو اپنی اہمیت کھودیتی ہے۔

میرا نام حنا صدیقی اور میری جڑواں بہن صبا صدیقی ہم دونوں بہنوں میں پندرہ منٹ کا فرق تھا۔ ہماری پیدائش کا دن، مہینہ، تاریخ، سال، وقت نام کے معنی یہاں تک کہ قسمت بھی ایک جیسی تھی۔ اسکول کالج سب جگہ ہمارا ساتھ ساتھ رہا اگر میں اپنی کہانی سناؤں تو وہ ہم دونوں کی زندگی کی ہی ہوگی کیونکہ نام کا اثر ہم دونوں بہنوں پر بہت زیادہ ہوا تھا۔ میں نے بھی حالات کی چکی میں پسنے کے بعد جو خوشیاں بائیں وہ بھی ادھوری اور صبا کی زندگی میں آگئی ہو ایسی آئی جو سب کچھ اڑا کر لے گئی۔ صبا کا ہونا آیا اور چلا گیا۔ حنا تھوڑے دن رچی اور ختم۔

یعنی دونوں کے وجود کا عرصہ انتہائی مختصر ہوتا ہے۔ ہمارا جنم دل والوں کے شہر دہلی کے ایک غریب گھرانے میں ہوا لہذا دل کے معاملے میں ہم بہت دل پھینک ثابت ہوئے ماں ہماری سلائی کا کام جانتی تھیں۔ وہ ریڈی میٹ کپڑے سکتی تھیں۔ ان کپڑوں کو بابو اس زمانے میں ہندوستان کے رواج کے مطابق باپ کو مسلمان گھرانوں میں زیادہ تر بابو کہا جاتا تھا لہذا ہم لوگ بھی اپنے باپ کو بابو کہتے تھے۔ بازار میں جا کر بیچتے تھے جو دن بھر کی آمدنی ہوتی تھی۔ اس سے شام میں چولہا جلتا تھا۔ ہم دونوں سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن ذرا بڑی ہوئیں تو وہ بھی امی کے ساتھ سلائی میں ہاتھ بٹانے لگیں۔ اس طرح عزت کے ساتھ گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس کسپر کی حالت میں بھی بابو نے ہم بہن بھائیوں کو اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم دلوائی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے خاندان بھر میں کسی سے پیچھے رہیں۔ ہمارے ماں باپ کی محنت کی بدولت ہم سب نے اچھی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں نہ موبائل تھے نہ ٹیلی فون اتنا عام ہوا تھا۔ انٹرنیٹ کا تو خیر تصور ہی نہیں تھا۔ ٹیلی ویژن بھی اتنا عام نہیں تھا۔ امیر گھرانوں میں ہی یہ سہولیات کم تھیں۔ ہم جیسے لوگ تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن محبت اور گناہ اس زمانے میں بھی ہوتے تھے۔ اس وقت خط و کتابت محبت کا ذریعہ تھے۔ محبت کے معاملے میں غی نہیں نسل تو صرف بدنام ہے۔ ہم پرانے لوگوں نے نئی نسل کو زیادہ تصور وار بھر دیا ہے حالانکہ گناہ تو ہر دور میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ البتہ صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ ہر دور میں گناہ کے طریقے اسی دور کے حساب سے ہوتے رہے ہیں۔ پہلے خط و کتابت بھر ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور اب موبائل اور انٹرنیٹ جیسی جدید ٹیکنالوجی۔

ہم دونوں بہنوں کا مزاج بھی کچھ رنگین قسم کا تھا۔ بس انیس بیس کا فرق تھا۔ میں کچھ زیادہ رنگین طبیعت کی مالک تھی اور صبا کچھ کم تھی۔ بچپن سے ہی مجھے جلس مخالف میں بہت کشش محسوس ہوتی تھی۔ خاندان میں جب کسی کزن وغیرہ کی شادی ہوتی تو میں اپنی شادی کے خواب ضرور دیکھا کرتی۔ تصور میں خود کو دلہن کے روپ میں دیکھتی تھی۔ چپکے چپکے بڑوں کی باتیں سن کر تھی تو میرے دل میں بھی شادی کے ارمان جاگنے لگتے جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی میری خواہش مزید بڑھتی گئی جوان ہونے کے بعد تو میرے اندر جلس مخالف کی کشش جو بن کی طرح جوش مارتی رہتی۔ اسکول کالج کے زمانے میں، میں نے کتنے لڑکوں سے دوستی کی اور دل بھر جانے پر چھوڑ بھی دیا۔ کنوارے مرد تو کیا شادی شدہ کو بھی میں نے اپنی محبت کے جال میں خوب پھنسا یا جس کی وجہ سے ان لڑکیوں کی ازدواجی زندگی بھی خراب ہوئی۔ (شاید ان ہی لڑکیوں کی آہ مجھے لگ گئی) ان میں سے کچھ تو میرے کزن تھے اور کچھ محلے پڑوس کے ہوا کرتے تھے۔

یہ 1980ء کا دور تھا۔ ان دنوں میں میٹرک میں تھی۔ میرے ایک کزن کی شادی ہوئی۔ شادی والے دن جب دلہن رخصت ہو کر گھر آئی تو مجھے شرارت سوچھی میں نے نئی نوپلی بھائی کو ٹائٹ ڈریس پہننے کے لیے کہا بھائی شرمائی لپائی ڈریس لے کر کمرے میں بنے واش روم میں چلی گئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ شرارہ سوٹ اتار کر مجھے پکڑا دیں اور آرام سے change کریں۔ ان سے شرارہ سوٹ لے کر میں نے باہر سے ہاتھ روم کی کنڈی لگائی اور بھابی سے کہا۔ ”بغیر آواز نکالے ہاتھ روم میں رہیں۔“ بھابی اس آفت کے لیے تیار نہیں تھیں۔ سسرال میں پہلے ہی دن انہیں ہاتھ روم میں

بند کر دیا گیا۔ اس زمانے میں نیا نیا منج ہاتھ روم چلا تھا جو کزن نے بڑے پیار سے اپنے کمرے میں بنوایا تھا، اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اسی ہاتھ روم میں اس کی نئی نوپلی دلہن کو بند کر دیا جائے گا۔ بہر حال میں نے جلدی جلدی شرارہ زیب تن کیا اور کزن کے انتظار میں دروازے پر کھڑی ہو گئی، جونہی وہ سارے کزنوں کی موجودگی میں آتا دکھائی دیا، میں نے روم کا دروازہ بھیڑا اور آکر بیٹھ پر بیٹھ گئی، ساتھ میں لمبا سا گھونگٹ بھی نکال لیا۔

اس وقت سارے کزنز میری غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے آوازیں بھی دے رہے تھے۔ جب میں نہیں آئی تو وہ لوگ کزن کو دروازے تک چھوڑ کر چلے گئے۔ کزن نے اندر آکر جونہی مجھ سے محبت کی باتیں شروع کیں، میں نے تہمتہ مار کر گھونگٹ الٹ دیا جس پر وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس بات پر بعد میں کچھ لوگوں نے مجھے لعن طعن کی۔ کچھ نے اسے مذاق کے طور پر لیا اور کچھ میرا بچپنا خیال کرتے رہے مگر سچ ہے مجھے اس مذاق میں بڑا مزہ آیا تھا۔ اس کے بعد بھی میرے کسی کزن لڑکے یا لڑکی کی شادی ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ حرکت ضرور کرتی۔ کچھ لوگ میری اس حرکت کو برا گردانتے مگر مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کزن کی شادی کے بعد ہمارے امتحان شروع ہو گئے اور ہم مکمل دلجوئی کے ساتھ پیپر کی تیاری میں لگ گئے۔

میٹرک کارڈلٹ آنے کے بعد ہم دونوں بینش فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن کی تیاری کر رہے تھے۔ اس وقت ہماری عمریں تقریباً 17-16 سال تھیں۔ فارم جمع کرانے کے لیے ہمیں روزانہ کالج کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ کبھی فیس کا مسئلہ کبھی سلسل کا، کبھی کبھی۔

اس روز بھی مارکس شیٹ کی فوٹو کاپی جمع کرا کر

ہم واپس آرہے تھے کہ ایک لڑکا ہمارے پیچھے پیچھے ہماری گلی تک آگیا۔ ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کو پھینک دینے لگیں۔

”صبا یہ لڑکا تیرے پیچھے آیا ہے۔“
”نہیں تیرے پیچھے آیا ہے، میرا تو بھائی ہے۔“ صبا بولی۔

یوں کئی مذاق کرتے ہوئے ہم گھر آگئے۔ اس کے بعد تو یہ اکثر ہونے لگا جب بھی ہم کالج جانے کے لیے نکلتے وہ لڑکا مخصوص جگہ پر کھڑا ہوتا۔ ہمارے پیچھے پیچھے کالج تک آتا اور چھٹی ٹائم میں کالج سے گھر تک آتا۔ یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ ہم بھی ایک دوسرے پر فخر کرتے۔

میں کہتی۔ ”میرا بھائی تیرے پیچھے آتا ہے۔“
”میرا بھائی تیرا دیوانہ ہے۔“ صبا کا جواب ہوتا۔
تاہم ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے پیچھے آتا ہے اور اس کا کیا مقصد ہے؟ کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔

اس دن صبا کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ میں اکیلی ہی کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی اور یہ سوچ کر نکلی تھی کہ اگر اس لڑکے نے مجھے اکیلا دیکھ کر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو سبق سکھا دوں گی۔ راستے میں ایک جگہ جہاں قدرے سناٹا تھا، وہ اچانک کہیں سے ظاہر ہوا اور اس نے محبت بھرا جملہ میری طرف اچھالا اور میری شان میں تعہدے پڑھتا ہوا میرے قریب آگیا۔ میں تو اسی انتظار میں تھی۔ جھپٹکے سے پیچھے مڑی اور ”چٹا“ سے ایسا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا کہ طبیعت صاف ہو گئی ہوگی۔ پتھر کھا کر وہ ایسا روفو چکر ہوا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا پھر اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

دوسرے دن صبا کی طبیعت صحیح ہو گئی تو وہ بھی

ساتھ میں کالج گئی۔ راستے میں اس لڑکے کو نہ پا کر بولی۔ ”آج وہ لڑکا نظر نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے بہانہ کر دیا کہ شاید اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہوگا۔ اس نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اسی طرح تقریباً دو تین مہینے گزر گئے۔ ایک دن کالج جاتے ہوئے ایک بچے نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھما دیا۔

”آئی، وہ سامنے والے انکل نے دیا ہے۔“ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک دکان کے سامنے وہی لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس وقت جانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ بری نہیں لگی۔ اتفاق سے صبا اس روز میرے ہمراہ نہیں تھی میں نے وہ پرچہ لے کر رجسٹر میں رکھ لیا۔ کالج آکر گراؤنڈ میں الگ تھلک قدرے سناٹا جگہ کا انتخاب کر کے میں وہاں بیٹھ گئی اور پرچہ کو کھول کر پڑھا کیونکہ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا لکھا تھا۔

”جان دل!“

آپ کو کس نام سے مخاطب کروں؟ میں تو آپ کا نام تک نہیں جانتا، اس دن آپ کو پہلی دفعہ دیکھ کر دل میں جو لپٹل ہوئی تو آپ کو دل دے بیٹھا۔ بہت دنوں سے آپ سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا مگر ہمت نہ ہو سکی۔ نہ جانے آپ اور آپ کی بہن کیا سوچیں۔ یقیناً وہ آپ کی بہن یا پھر سہیلی ہوں گی۔ ویسے شکل سے تو بہن لگتی ہیں۔ وہ آپ کی کیا ہیں یہ ضرور بتائیے گا۔ اس دن مجھے احساس ہوا آپ واقعی ایک باہمت اور دلیر لڑکی ہیں۔ ایسی لڑکیاں میرا آئیڈل ہیں۔ شاید آپ میرے جذبات کو نہ سمجھ سکیں مگر میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آپ صرف چاہے جانے کے قابل ہیں جس دن میری پہلی نظر آپ پر پڑی تھی اسی دن مجھے آپ سے پیار ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں پہلی نظر کا پیار پہلا اور آخری ہوتا

میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

آپ کی محبت کی طالب
حنا صدیقی

وہ میرے خط کے ہی انتظار میں تھا فوراً ایک اور محبت نامہ لکھ دیا پھر انہی محبت ناموں کے ذریعے ہماری محبت پر دان چڑھنے لگی۔ خط میں جب بھی میں منصور سے رشتہ کے لیے بات کرتی تو وہ ٹال دیتا۔

”ابھی جلدی کیا ہے، تم کم از کم انٹر کو کر لو پھر رشتہ بھی آجائے گا۔“ میں کہتی کہ صرف رشتہ پکا ہو جائے شادی بعد کی بات ہے تو وہ کہتا کہ جان منصور مجھے تم سے زیادہ جلدی ہے مگر ابھی تم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو، پڑھائی کے دوران میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس کی یہی بات تو میری نظر میں اس کا مقام مزید بلند کر دیتی۔

صبا بھی ان دنوں محبت کے حسین سنے دیکھنے لگی تھی۔ اسے ہمارے چچا زاد سے پیار ہو گیا تھا۔ ان دنوں کی کہانی بھی ہماری طرح چل رہی تھی مگر محبت کے معاملے میں ہم دونوں ہمیشہ ہی بد نصیب ثابت ہوئیں۔ نہ مجھے کسی مرد کا چچا پیار مل سکا نہ ہی صبا کو۔ ہمارے پیار ہم سے دل بہلاتے رہے لیکن کسی سے کیا گلہ کریں۔ ہمیں ہمارے جرم کی سزا ہی ملی تھی کیونکہ ہم بھی تو اب تک لڑکوں سے صرف دل بہلاتے رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا جس سے ہم نے دل لگایا اس نے ہم سے دل بہلایا اور جس سے ہم نے دل بہلایا اس نے ہم سے دل لگایا، یوں حساب برابر رہا۔

بہر حال میری اور منصور کی محبت چلتی رہی۔ ان دو سالوں میں ہم یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ انٹر کے امتحان کے بعد منصور نے وعدے کے مطابق اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجا۔ ای، بابو نے

ہے تو میرا بھی یہ پہلا اور آخری پیار ہے۔ میں راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے والا غنڈہ، بد معاش نہیں ہوں۔ پڑھا لکھا، برسر روزگار شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ میری آپ سے اتنا اس ہے کہ مجھے کلی کا لوفر، لفنگا، آوارہ، بد معاش مت سمجھیے گا جو کچھ میرے دل میں تھا سچائی کے ساتھ آپ کو بتا دوں گا۔ آپ کی مرضی کہ آپ میرے بارے میں کیا رائے رکھیں۔ ہاں اگر آپ میرے جذبات کے سچے لفظوں پر یقین رکھتی ہیں اور مجھ سے محبت کر سکتی ہیں تو جواب ضرور دیجیے گا اور اگر آپ کو اعتراض ہے تو پھر کسی آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔“

منصور احمد

خط پڑھ کر میرے دل میں ہلچل مچ گئی اور اس کے بارے میں میرے خیالات یکسر بدل گئے۔ یکا یک لگا جیسے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے مجھ سے خود محبت کا اظہار کیا تھا ورنہ تو ہر لڑکے کو میں ہی ستاتی اور پھنساتی رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی اسے جوابی محبت نامہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس کے لیے مجھے صبا کو اعتماد میں لینا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کو ساری بات بتادی اور اس نے میرا ساتھ دینے کی حامی بھر لی تب میں نے اس کے نام خط لکھا۔

”آنکھوں کے ذریعے دل میں اتر جانے والے

سابقہ رویے پر میں آپ سے معافی کی طلب گار ہوں۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں آپ کو کیا سمجھ رہی تھی اور آپ کیا نکلے، آپ کی باتوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ میں آپ کی محبت کی طلب گار ہو گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے آپ شاید میرے لیے ہی بنے ہیں۔ میں نے صبا کو آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ صبا میری بہن ہے اس کی موجودگی

ابھی لوگ دیکھتے ہوئے ہاں کر دی ان ہی دنوں صبا کے لیے چچا زاد کا رشتہ آ گیا۔ گھر کے لڑکے کا رشتہ تھا اسی لیے دونوں کے لیے ہاں ہو گئی یوں ہماری شادی کا دن بھی ایک ہی ہوا پھر ہماری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں اپنی شادی کے لیے گن گن کر دن کاٹ رہی تھی۔ وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے بہت بے چینی سے انتظار تھا۔ 19 مارچ 1984ء کا دن تھا جب میں رخصت ہو کر منصور کے گھر آئی۔ ان چار سالوں میں، میں نے منصور کے ساتھ زندگی بنانے کے لیے ڈیروں خواب دیکھے تھے۔ تمام رسومات سے فارغ ہونے کے بعد نندوں وغیرہ نے مجھے جلد عر دی میں پہنچا دیا۔ میں لمبا گھونکھٹ نکالے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی منصور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے شرم و حیا کو برقرار رکھتے ہوئے توڑا سا سرا اور جھکا لیا۔ انہوں نے گھونکھٹ اٹا تو میں نے بڑے پیار سے ان کی جانب دیکھا مگر یکا یک چٹان کی آواز سے کمرہ کوخ اٹھا اور میں اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ منصور کی آنکھوں میں دنیا بھر کی نازت موجود تھی۔

”اس چھپر کو تم میری طرف سے اپنی منہ دکھائی سمجھو یا اس چھپر کا بدلہ جو تم نے مجھے مارا تھا۔ تم کیا سمجھتی تھیں؟ میں تم پر مر رہا ہوں؟ اونہہ۔۔۔۔۔ تم جیسی آوارہ، بد چلن عورت کو میں کبھی پیار کر ہی نہیں سکتا جس روز تم نے ذرا سی بات پر مجھے پھٹ مارا تھا اور میری بے عزتی کی تھی اسی وقت میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس چھپر کا بدلہ ضرور لوں گا اور اسی دے کی آگ میں جلتے ہوئے میں نے چار سال تک تم سے پیار کا ناک رچایا۔ ان چار سالوں میں تمہارے متعلق میں نے تمام معلومات حاصل

کر لیں کہ تم اسکول، کالج کے زمانے میں کیا کیا گل کھلاتی رہی ہو اور تمہاری گھریلو زندگی میں تمہارے کیا چلن ہیں۔ تم ہی نہیں، تمہاری بہن کے متعلق بھی مجھے تمام معلومات حاصل ہیں اگر تم نے میری مرضی کے خلاف جانے کی کوشش کی تو تمہاری ہی نہیں تمہاری بہن کی بھی ازدواجی زندگی برباد ہو جائے گی اور تمہارے ماں باپ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ میں چاہوں تو صبح تمہیں طلاق کا تحفہ دے کر تمہارے ماں باپ کے گھر بھیج سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تمہیں اتنا تڑپاؤں گا جتنا میں تڑپا ہوں۔ صرف طلاق دینے سے میرا بدلہ پورا نہیں ہوگا۔ آئندہ اپنی اوقات میں رہنا، مجھے نہ تمہارے جسم کی ضرورت ہے نہ محبت کی۔ مہرین میری محبت ہی نہیں زندگی بھی ہے اور بیوی ہونے کا حق بھی میں اسے ہی دوں گا۔ تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ جب دل بھر جائے تو بتا دینا، میں تمہیں کسی دارالامان میں جمع کر دوں گا مگر۔۔۔۔۔ طلاق نہیں دوں گا۔“ چھپر کے بعد ان کی باتیں میرے دل پر نشتر کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی منصور میرے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی ان کے دل پر تو راج کرنے والی کوئی اور ہی لڑکی ہے۔

پھر وہ الماری کی طرف بڑھے اور ایک ڈبیہ نکال کر میری طرف حقارت سے پھینکتے ہوئے بولے۔ ”یہ اپنے میکے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے بہن لو مگر میری محبت کا نذرانہ نہ سمجھنا۔“ دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں سے پھسل گئے۔ جس دن کا مجھے برسوں سے انتظار تھا وہ آیا بھی ایسے کہ میرے دل کے سارے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔ اس کے بعد وہ تکیے لے کر کمرے میں بچھے کارپٹ پر آرام سے سو گئے اور میں تمام رات جیسے

کانٹوں پر تڑپتی رہی۔ سہاگ کی وہ رات میری زندگی کی بدترین رات بن گئی تھی۔

منصور نے بھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی اگر کسی میں ان کا دل جیتنے کی کوشش کرنی یا ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار سے منانے کی کوشش کرتی تو لات مار کر مجھے پرے دھکیل دیتے۔ گالیاں دینے اور مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ مجھ پر طنز کے نشتر چلاتے کہ اپنے گندے وجود کو میرے جسم سے بچ مت کر، یہ کی عزت دار عورت کے لیے ہے۔ تجھے تو ہاتھ لگاتے ہوئے مجھے سمن آتی ہے۔ کبھی انہوں نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ مارتے وقت بھی لاتوں سے کام لیتے تھے۔ اتنی محبت اور پیار جتانے والے انسان کا اصل روپ دیکھ کر میں حیران رہ جاتی تھی۔ اس نے صرف مجھ سے بدلہ لینے کے لیے محبت کا ناک تک کیا تھا۔ میں ہی نادان تھی جو منصور کے ارادوں کو نہ سمجھ سکی اور ان کی جھوٹی محبت کے جھانے میں آ گئی۔ منصور ہی نہیں مجھ سے تو ساس، سر، نند، جھٹانی، دیورانی سمیت گھر کا کوئی بندہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا حالانکہ میرے بچنے، جھٹانی کا بہت خیال رکھتے۔ دیور بھی دیورانی کے آگے بچھے جاتے تھے۔ ساس، نندیں بھی ان کا بہت خیال رکھتیں اور عزت کرتیں۔ میں ان کا حوالہ دیتی تو منصور میرے کانوں میں اپنی نفرت کا زہر گھول دیتے۔

”وہ عورتیں تیری طرح بدکار اور بدچلن نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے جسم کو وائے شوہر کے کسی کے حوالے نہیں کیا۔ یہ سن کر میں تڑپ جاتی میرے پیٹ پر کی وہ اتنی اذیت ناک سزا دے رہے تھے۔ جانے کیسے میری زندگی کے خفیہ گوشوں سے وہ واقف ہو گئے تھے۔

سسرال میں میری حیثیت جانوروں سے بھی

بدتر تھی۔ گھر کے سارے افراد کھانا کھا لیتے۔ میں بھوک رہ جاتی، کوئی مجھ سے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھتا۔ بھوکہ رہ رہ کر میری حالت خراب رہنے لگی تھی۔ سارا دن میں کام میں لگی رہتی۔ سارے گھر کا بوجھ اکیلے مجھ پر تھا۔ اس پر بھی کسی کو مجھ پر ترس نہ آتا۔ کھانے پینے کا تمام سامان ساس اپنے کمرے میں رکھتی تھی۔ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے، بچا کھچا جو ہوتا وہ میرے آگے کتوں کی طرح ڈال دیا جاتا اور میں اسی کو نعمت جان کر خدا کا شکر کر کے کھا لیتی۔ اس آس پر کہ کوئی منصور کو مجھ پر رحم آئے گا۔ اسی طرح آٹھ نو مہینے گزر گئے۔ ایک دن بھیا مجھ سے ملنے چلے آئے۔ میں بھیا کے لیے چائے بنانے کچن میں گئی۔ چائے بنانے پر ساس نے وہ ہنگامہ کیا کہ بھیا بھی پریشان ہو گئے۔ وہ مجھے ساتھ چلنے کو کہنے لگے مگر میں منصور کی اجازت کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ لہذا بھیا اکیلے ہی واپس چلے گئے اور امی بابو کو ساری بات بتادی۔

دوسرے دن امی بابو گھر آئے اور منصور سے اجازت لے کر کچھ دنوں کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بابو نے گھر آ کر مجھ سے تفصیل پوچھی۔ پہلے تو میں ٹال مٹول کرتی رہی مگر پھر امی، بابو اور بھائیوں کا پیار بھرا اصرار دیکھ کر میں نے رو رو کر ساری پینا بتادی۔ دوسرے دن بھیا اور بابو نے جا کر ان لوگوں سے بات کی۔ منصور نے بھیا اور بابو سے میرے متعلق جو زہر اگلا اسے امی کی زبانی سن کر میرے کان سننا گئے۔ امی نے بتایا کہ منصور تمہیں طلاق دینا چاہتے ہیں۔

میں اپنا گھر بگاڑنا نہیں چاہتی تھی، امی سے بولی۔ ”مجھے واپس بھجوادو۔ میں کسی طرح بھی انہیں منالوں گی۔“ بابو تو مجھے بھیجے پر راضی نہیں تھے مگر میں نے رو رو کر بابو سے کہا کہ آپ ایک دفعہ ان سے صل

کی کوشش کر کے دیکھیں وہ مان جائیں گے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں اب بھی ایک خواہش ہی تھی کہ شاید منصور کے دل میں میرے لیے محبت کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ میری التجائیں اور رونا بلکنا دیکھ کر بابو مجھے لے کر منصور کے پاس گئے اور منصور سے صلح کی بات کی شاید وہ اپنی ان کی مزید تسکین کرنا چاہتے تھے یا ان کا بدلہ پورا نہیں ہوا تھا اسی لیے کچھ خرچے دکھا کر صلح کے لیے راضی ہو گئے۔ میں بھی خوش تھی۔ چلو میرا گھر تو بے جا میری کوششیں کبھی تو رنگ لائیں گی۔ ان دنوں میں روٹی تھی اور نقدیر مجھ پر ہنسی تھی۔ گھر آنے کے بعد پھر وہی روٹین شروع ہو گئی۔ میری حیثیت گھر والوں کی منصور کی نظر میں بھی نوکرانی کی طرح تھی۔ صبح سے رات ہو جاتی، میں کام میں جتنی رہتی مگر کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ مجھے کسی کا غم نہیں تھا۔ بس منصور کی بے رخی مارے ڈالتی تھی۔

اسی اذیت میں سال بھر بیت گیا۔ نہ میں میکے جا سکی نہ وہاں سے کوئی آیا۔ اسی دوران ہماری شادی کی دوسری سالگرہ آ گئی۔ سالگرہ والے دن میں نے جہیز کے جوڑوں میں سے ایک اچھا سوٹ نکال کر پہنا جو منصور کا پسندیدہ کپڑا تھا۔ ہلکا میک اپ بھی کیا، یہ سوچ کر شاید منصور کی نظر مجھ پر پڑے تو مجھے محبت کی نظر سے دیکھیں شاید ان کے رویے میں یکک آجائے۔ میں ان کی محبت کی ایک نظر کے لیے تڑپتی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک نظر دیکھا بھی اور ذلت کے کنوئیں میں دھکا بھی دے دیا۔ اپنی زبان کے جو نشتر مجھ پر چلائے اس سے کہ میری روح تک کانپ گئی مجھے جس طرح کی گالیوں اور طعنے سے نوازا تو گھر لگا بھی میری سالگرہ کا تحفہ ہے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ میں بھی خاموشی مہر کیے جا رہی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں تھا جب

میں نے بیٹھ کر اپنی قسمت پر آنسو نہ بہائے ہوں۔ دن تو کام کاج میں گزر جاتا مگر رات مجھ پر قیامت سے کم نہ گزرتی۔

ایک دن محل کی ایک عورت ہمارے گھر آئی۔ اس کی بیٹی میری بہن کے سسرال کے قریب شادی ہو کر گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ مجھے اور بہن کو جانتی تھی۔ اس نے میری یہ حالت دیکھی تو جا کر بہن کو ساری بات بتائی۔ بہن نے امی کو بتایا امی اور بھیا جس وقت میرے گھر آئے تو میرا حلیہ ایسا تھا کسی نوکرانی کا بھی کیا ہوگا۔ امی نے میری ساس سے اس بارے میں بات کی تو ساس نے میرے سامنے ہی امی کی بے عزتی کی اور انہیں بے پناہ ذلیل کیا۔ مجھ سے امی کی ذلت برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے ساس سے کہا کہ آپ میری ماں سے اس لہجے میں بات نہیں کریں۔ منصور کھڑے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ میرے اتکا کہنے کی دیر بھی وہ میری پٹیا پکڑ کر کھینچتے ہوئے صحن میں لائے اور گھر سے باہر دھکا دے دیا۔

”ماں کی اتنی فکر ہے تو وہیں چلی جا۔“ اس وقت بھیا کا بھی منصور سے جھڑپا ہوا۔ منصور نے بھیا کے سامنے میرے کردار کی دھجیاں اڑا دیں جو باتیں انہوں نے کہیں اسے کوئی بھی بھائی برداشت نہیں کر سکتا لہذا بھیا مجھے گھر لے آئے۔ جس وقت میں سسرال کی دہلیز پار کر کے آئی تو میری یہ حالت تھی کہ میرے تن پر میلے کپڑے، پچھلی ہوئی چادر اور میں ننگے پیر تھی کیونکہ منصور نے مجھے میرے کمرے تک بھی جانے نہیں دیا تھا۔

گھر آ کر بابو نے چچا اور ماموں وغیرہ کے سامنے میرا مسئلہ رکھا۔ انہوں نے منصور کو کھڑا کر کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کو کہا۔ چنانچہ بابو سے بھیا کے ذریعے منصور کو پیغام بھجوایا۔ دو دن بعد منصور

اپنے ماں باپ، بھائی، بھائی کے ساتھ گھر آئے اور سب کے سامنے میری زندگی کا ہر باب کھول دیا۔ اس وقت دوھیال کے سب بزرگ موجود تھے۔ میرے خاندان والوں نے صلہ صفائی کی کوشش کی مگر منصور مجھے رکھنا تو درکنار میری شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ لہذا بات طلاق پر آ کر ٹھہر گئی۔ یہ سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔

وہ نومبر 1987ء کا جانے کون سا دن اور تاریخ تھی، اتنا مجھے یاد نہیں یاد ہے تو بس اتنا اس دن مجھے میری زندگی کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا میں سزائے موت کی قیدی ہوں اور کٹھرے میں کھڑی فیصلہ سننے کی منتظر ہوں۔ کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر گئی ہوتی۔

ظہر کی نماز کے بعد منصور اپنے گواہوں اور گھر والوں کی موجودگی میں میرے گھر آئے۔ اس روز صبح سے ہی میرا روبرو کر برا حال تھا۔ اس وقت میرے دل سے بس یہی دعا نکل رہی تھی۔ ”یا اللہ! کبھی کسی دشمن کی بیٹی پر بھی ایسا وقت نہ پڑے۔“

طلاق دینے سے پہلے منظور نے میرے دامن پر جو کچھ اچھالی اور میری عزت کی جو دھیماں اڑائیں، اسے سن کر تو مجھے مر جانا چاہیے تھا۔ میں بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس وقت گھر میں پورا خاندان موجود تھا۔ منصور تو میری زندگی کی کتاب کا ہر وہ باب لوگوں کو سناتے رہے جس کا لفظ لفظ میرے کالے کرتوتوں سے لکھا ہوا تھا۔ یہی کرتوت میری زندگی کی سب سے بڑی کا لک بن گئے۔

جن لوگوں کی موجودگی میں منصور نے تین سال پہلے مجھے تین لفظوں کے ساتھ قبول کیا تھا، آج ان ہی کی موجودگی میں طلاق کے تین لفظ کہہ کر ہمارے رشتے ختم کر دیے اور میرا حق مہر بھی میرے منہ پر مار دیا۔ حق مہر تھا ہی کتنا، صرف 2,000 ہزار روپے۔

میں کے نوٹ کی ایک گندی انہوں نے میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”یہ لے اپنا حق مہر۔“ اور گھر سے نکل گئے۔ اس وقت گھر میں جانے کتنے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کسی نے مجھے کٹر کے اندر دھکا دے دیا ہو اور اس کی گندگی سے میرا وجود ناپاک ہو گیا ہو۔

عدت کے دو مہینے میرے اوپر بہت سخت گزرے۔ جو کوئی میری دلجوئی کے لیے آتا، چاہے وہ خاندان کا ہو یا محلے کا مجھے لگتا، یہ لوگ میرا مذاق اڑانے آتے ہیں۔ میں انہیں گالیاں دیتی۔ کبھی بے تحاشا روئے لگتی۔ یوں روز بہ روز میں نفسیاتی ہونی چلی گئی۔ اپنے آپ سے باتیں کرنا، بیٹھے بیٹھے کھوجانا لوگ میری دلجوئی کرنے آتے اور انہیں بے نقط سنا میری عادت سی بنتی جا رہی تھی۔ میری حالت دیکھتے ہوئے بابو نے مجھے کسی محنت بخش مقام پر لے جانے کی ٹھانی تاکہ میرے ذہن کو سکون ملے لہذا میری عدت کے بعد بابو نے نئی تال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ نئی تال میں بابو کی بیٹی رہتی تھیں۔

وہ سالوں پہلے ایک دو بار دلی آئی تھیں۔ اس وقت میں چھوٹی سی تھی۔ ان کے بچے میرے ہم عمر تھے۔ جس وقت وہ دلی آئی تھیں، ہم لوگ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ نئی تال جا کر مجھے سیر و تفریح کا موقع ملا۔ میں بہت حد تک منصور کی بے وفائی کو بھول گئی۔ نئی تال میں، میں چھ سات مہینے رہی، ان دنوں میں نے خوب انجوائے کیا۔ ان کا ایک بیٹا مجھ سے تقریباً ایک یا دو سال چھوٹا ہوگا۔ بچپن سے مجھے جنس مخالف میں جو کشش محسوس ہوتی تھی، وہ اب تک دلی ہوئی چنگاری کی طرح میرے اندر موجود تھی۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں میں مراسم بڑھے اور محبت کے کھیل میں جے تو وہ راکھ کی چنگاری شعلہ بن گئی۔ اتنا بڑا حادثہ ہو جانے کے باوجود میں پھر ویسی ہی ہو گئی حالانکہ جو

حالات میرے ساتھ پیش آئے تھے، اس کے بعد تو مجھے ان راہوں پر چلتے ہوئے شرم اور خوف آتا چاہیے تھا لیکن نہ مجھے اپنے رشتے کا لحاظ تھا نہ ماں باپ کی عزت کا میں تو تھی ہی مرد کے قرب کی بھوکی تین سال منصور کے ساتھ رہنے کے باوجود انہوں نے بھی مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا لہذا میں نے اپنا سب کچھ خاور کو سونپ دیا۔ مجھے اس کی شبیہ گفتگو اور ہاتھوں کے لمس میں محاسن محسوس ہوتی۔ ایک عرصے سے میں جس چیز کو ترسی ہوئی تھی، وہ سب میں نے خاور سے وصول کر لی یہ جانتے ہوئے بھی یہ سب کچھ نہا جائز ہے۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، ہمارا نام نہاد عشق بھی چھپانہ رہ سکا۔ خاور کے امی الوکو ہی نہیں تخیال، دوھیال ہر جگہ باتیں بننے لگیں۔ مجھ پر لعن طعن ہونے لگی بابو کے کانوں تک یہ باتیں پہنچی تو انہوں نے واپس مجھے دلی بلایا لہذا چھ سات مہینے رہ کر میں دلی آ گئی۔ چلتے وقت خاور کی حالت ایسی تھی کہ کچ کچ کا عاشق لگ رہا تھا۔ دلی آ کر میں ان تمام باتوں کو بھول گئی اور زندگی کے تین سال یونہی گزر گئے۔ اس دوران وقت گزاری کے لیے میں نے ایک نئی اسکول میں جاب کر لی جو کہ ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ اسکول جو ان کر کے تو میں خاور کو بالکل ہی بھول گئی مگر اپنی روش نہیں بھولی تھی۔ اب میں کسی نئے نمرد کی تلاش میں تھی۔

گھر اور اسکول کے راستے میں دودھ، دہی کی ایک دکان پڑتی تھی۔ وہ دودھ والا ہر روز بہت محبت سے مجھے دیکھا کرتا تھا۔ میں بھی اس سے نظر ملا کر گزر جاتی۔ ایک دن اس نے مجھے ایک محبت نامہ لکھ دیا جسے پڑھ کر میں پھر محبت کی نئی روش پر چل نکلی۔ جاب کرتے ہوئے مجھے تین سال ہو گئے تھے اور تقریباً ڈیڑھ سال محبت کی راہوں پر چلتے ہوئے کہ

محلے میں پھر باتیں بننے لگیں جو بھائیوں اور بابو تک بھی پہنچی۔ امی نے مجھ سے اس متعلق پوچھا۔ میں نے تمام بات کچ کچ ای کو بتادی۔ امی نے کہا کہ اس سے کوئی شرافت سے رشتہ بیچے ورنہ اس معاملے کو ختم کرے۔ مجھے بھی امی نے بہت برا بھلا کہا۔ میں نے اس متعلق عبدالملک سے بات کی۔ اس نے میرے گھر رشتہ بیچ دیا۔ امی بابو نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے تین ماہ کے اندر اندر ہماری شادی کر دی۔ یوں میں طلاق کے چوتھے سال میں دوبارہ دلہن بنی اور سہاگ کا جوڑا پہنا۔

شادی کے سال بھر کے اندر ہی میں ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ ماں بن کر میری نئی زندگی کی شروعات ہوئی۔ بیٹی کو کچھ کر مجھے بے تحاشا رونایا اور رورو کر اپنے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور دعا کی کہ اے اللہ! میری بیٹی کا نصیب مجھ جیسا نہ ہو۔

میں ہر وقت اللہ سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ میرے ماضی کا پر جھاواں کبھی میری بیٹی پر نہ پڑے یا کبھی اس کے سامنے اس کی ماں کا ماضی عیاں نہ ہو ورنہ وہ شرمندگی میں برداشت نہ کر پاؤں گی۔

عبدالملک یوں تو بہت اچھی عادتوں کے مالک ہیں مگر کبھی کبھی اپنے رویے سے اپنی مردانگی دکھا دیتے ہیں اور میں یہ سوچتے ہوئے مہر کر لیتی ہوں کہ مجھ کرم جلی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ عبدالملک کو میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ پتہ ہے۔ جس وقت مجھے طلاق ہوئی تھی اس وقت تماشاخیوں میں عبدالملک بھی موجود تھے۔

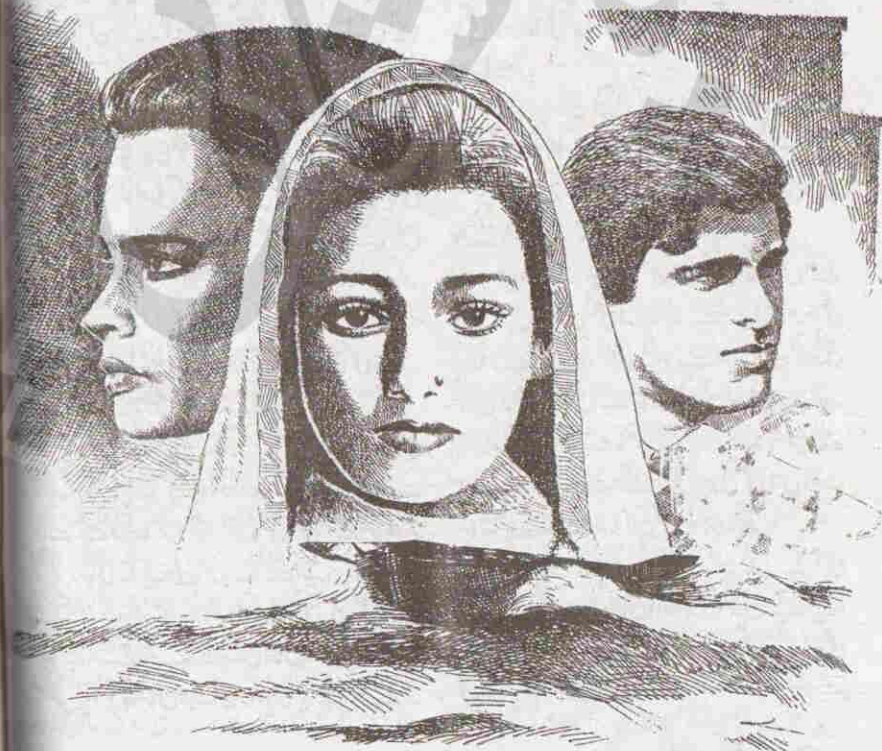
آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کتنی تباہی بچائی اور کتنا کی طرح کیسے کیسے، کہاں کہاں رنگ چھوڑے اور ان رنگوں کا میری زندگی پر کیا اثر ہوا ہے۔

غزالہ شاہین عبدالقیوم

سیاہیاں نہیں ہے

محسن نقوی کا خیال
محسن یہ فصل گل بھی قیامت تھی، ٹل گئی
اب دیکھنا پڑے گا پھر اگلے برس عذاب

آرزوئیں خوشیوں، خوابوں کو بہا کر لے جانے والے عذاب اب سے پھوٹی ایک جاں نسل کہانی



وطن عزیز میں سیلاب سے آنے والی آفتوں اور تباہی کی داستانیں رنج و الم کی صورت ہر اس چہرے سے عیاں ہے جو اس کا شکار ہوئے۔ سیلاب سے متاثر ہونے والا ہر شخص ایک کہانی ہے، دکھوں کی ایک ایسی داستان ہے جو اس کے دل میں پوشیدہ ہے، آنسوؤں کا وہ سمندر ہے جو اس کی ذات میں موجزن ہے۔

میری کولیک ربیعہ نے رمضان کے مبارک مہینے میں حیدرآباد کے اُن اسکولوں کا دورہ کیا جو ریلیف کمیٹیوں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اس نے کھانے پینے کی اشیاء عید کے لیے ملبوسات وغیرہ کے ساتھ ان مجبور لوگوں کی مدد کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ اس کام میں وہ خاصی پر جوش نظر آتی تھی۔ ایک دن میں نے بھی ربیعہ کے ساتھ ان ریلیف کمیٹیوں میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ربیعہ خوش ہو گئی اور آف ٹائم کے بعد مجھے اپنے ساتھ ایک کمپ میں لے گئی جہاں سیلاب سے متاثرہ افراد کی خاصی تعداد تھی۔ ربیعہ اور میرے ہاتھ میں کھانے پینے کی اشیاء تھیں۔ ہم نے ایک وائرکولر بھی اٹھا رکھا تھا۔ وائرکولر دیکھتے ہی پیاس سے بے حال لوگ اس کی طرف دوپٹے وار لپکے۔ ہم نے کولروں میں رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ ہر کمرے میں ضرورت مند لوگ موجود تھے۔ یہاں کچھ دیر پہلے بھی کوئی امدادی سامان پہنچ چکا تھا جو ابھی بھی لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ہم نے اس کمپ کے تقریباً سارے کمروں میں جا کر عید کے نئے سوٹ متاثرین میں تقسیم کیے۔ ربیعہ نے شلو اور قمیص کے مختلف سائز کے سوٹ لے رکھے تھے جو اسٹاف کی طرف سے اسے امداد کے لیے ملے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے متاثرین کے لیے ضروری اشیاء بھی خریدی تھیں۔ لوگ لپک لپک کر چریں لینا چاہتے تھے، تاہم کمپ کے انچارج

نے نظم و ضبط قائم کر رکھا تھا۔ اسی تقسیم کے دوران میری نظر کو نے میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون پر پڑی جس کے چہرے سے کرب نمایاں تھا۔ خاتون کے ساتھ دو نوجوان خوبصورت لڑکیاں بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ یہ تینوں کھانے پینے کا کوئی سامان لینے ہمارے پاس نہیں آئی تھیں۔ اُن کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا تھا۔ میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی اُن کے پاس پہنچ گئی۔ انہیں سلام کیا۔ خاتون نے محض گردن کے اشارے سے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے مجھ دیکھنے لگیں۔

”آپ لوگ قطار میں ان سب کے ساتھ کیوں نہیں کھڑے ہوئے؟“

میرے سوال پر دو موٹے آنسو خاتون کی آنکھوں سے نکل کر دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

”بی بی!.....! ہمیں موت کا انتظار ہے.....“

خاتون کی درد بھری آواز سے میری روح تک لرز اٹھی۔

”کیوں؟ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ اس کی تمنا کرنا گناہ ہے۔“ میں نے بے اختیار کہا۔ وہ

خاتون اور لڑکیاں کسی اچھے گھرانے کی مہذب، تعلیم یافتہ لگ رہی تھیں۔

”جب زندگی، موت سے بدتر ہو جائے تو دل موت کی تمنا ہی کرتا ہے۔“

”ہمت سے کام لیجئے انسان اچھے برے حالات کا شکار ہوتا رہتا ہے۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ان کے تواتر سے بہتے آنسو میرے دل کو بہائے لیے جا رہے تھے۔ کچھ دیر رو کر وہ خاموش ہو گئیں تو میں نے بہت

مشکل سے تینوں کو کھلایا پلایا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس آ گئی۔ وہ سارا دن اور ساری رات میری بے کلی میں گزری۔ رہ رہ کر اس خاتون اور

اس دنیا کا پورا نظام شیطان کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اگر شیطان نہ رہے تو کوئی انسان نہ رہے۔ سب فرشتے ہو جائیں۔ ہمیں انسان رہنے کے لیے شیطان چاہئے۔ وہ نہ ہوتا تو دو مولویوں اور دو عظمیوں کے بچے بھوکے مر جاتے کہ یہی تو ان کا ذریعہ روزگار ہے۔ شیطان نہ ہو تو وہ کس کے خلاف تقریریں کریں۔ یہ سارے حسن کے بازار رقص و موسیقی کی محفلیں اسی کے دم قدم سے تو ہیں۔ یہی نہیں عبادت گاہیں بھی اسی سے پناہ مانگنے کے لیے ہیں۔ وہ نہ ہوتا تو کوئی سیاست داں اور شاعر نہ ہوتا۔ عورت کا تو کوئی کام ہی نہ رہ جاتا۔ شیطان سب سے اچھا فرشتہ تھا مگر برابرت بنا جب وہ بول بڑا اسی لیے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جو بھی وہ بولنے لگتے ہیں ماں باپ کہتے ہیں یہ شیطان ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر یونس بٹ کے مضمون ”شیطان“ سے اقتباس

انتخاب: علی حسن چوک اعظم

اسے امریکہ جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، رقم اچھی خاصی تھی کیونکہ وہ اپنی پوری فیملی سمیت شفٹ ہو رہا تھا، اس نے تین سے رقم ادھار مانگی، رقم بہت زیادہ تھی۔ تین نے بڑے بھائی سے حویلی کے حصے کی رقم لے کر دوست کی مدد کر دی تھی۔ دوست امریکہ جا کر تین کو رقم لوٹا نہ پایا بلکہ اس نے کوئی خیر خرچ نہ ہی یوں تین احمد حویلی کے حصے سے ہاتھ دو بیٹھے تھے۔ تین احمد سمیت چاروں بھائیوں کا حویلی میں حصہ تھا، سب کے پورشن الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ تین احمد کے پورشن کو بیچ دیا گیا تھا۔ تین کا خیال تھا کہ دوست جیسے ہی رقم بھیجے گا وہ الگ گھر لے لیں گے۔ یہ سب سن کے میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ میں بالکل بے سہارا اور بے یار و مددگار تھی۔ اب میری کچھ میں آیا تھا کہ تین اپنے گھر والوں سے کیوں دبتے تھے۔ آصف بھابھی نے حویلی کے سارے کاغذات بھی مجھے دکھا دیئے تھے۔ اس وقت ٹماہری سیلاب سے کہیں زیادہ سیلاب میری آنکھوں میں تھا، دل تھا کہ شدت غم سے پھٹا جاتا تھا، زندگی کسی عذاب سے کم نہ لگتی تھی۔ میں ان بچیوں کو لے کر کہاں جاتی، کس سے فریاد کرتی؟ سیلاب سے بھٹتے ہوئے خطرے کے پیش نظر حویلی کے مکین

جاتے تھے، جب ہی میری جیٹانی نے ہمیں گھر سے چلے جانے کا بے رحم حکم صادر کر دیا تھا۔ ہم کہاں جاتے، کوئی بھی تو ٹھکانہ نہ تھا۔ میں اور تین بہت پریشان تھے۔ حویلی نماں گھر پر میری جیٹانی قبضہ کرنا چاہتی تھیں۔ میرے دکھ میں اس روز مزید اضافہ ہو گیا جب ڈنٹی پریشانی کے سبب ڈرائیو کر کرتے ہوئے تین احمد کی گاڑی سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرک سے ٹکرائی۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے حالانکہ گاڑی میں ان کے ساتھ ان کے دوست محمود رضا بھی تھے مگر وہ معجزانہ طور پر بچ گئے۔ انہیں معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ تین احمد کے انتقال کے بعد میری جیٹانی نے حویلی میں میرا رہنا دوبارہ کر دیا تھا۔ میں عدت میں تھی اور دہرے غم کا شکار تھی پھر ملک میں سیلاب کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ ہمارے علاقے کو بھی سیلاب سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ ایک تو سیلاب کی بگڑتی ہوئی صورت حال دوسرے جیٹانی کے گھر سے نکالنے کی دھمکیاں، میں بہت پریشان تھی۔ انہی دنوں میری عدت کے دن بھی پورے ہوئے۔ ہماری حویلی قدیم طرز کی تھی لیکن مضبوط تھی۔ تین احمد کے دنیا سے چلے جانے کے بعد مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میکے میں صرف ایک بھائی تھا جو خود غربت کی پکی میں پس رہا تھا۔ میں میکے جا کر بھائی، بھابھی اور ان کے تین بچوں پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے جیٹانی جنہیں میں آصف بھابھی کہا کرتی تھی کے ہاتھ جوڑے پاؤں پکڑے اور ان سے کہا کہ آخر تین کا بھی تو حویلی میں حصہ ہوگا، اس کے عوض ہی مجھے رہنے دیں۔ حصے کا نام سن کر آصف بھابھی آگ بگولہ ہو گئیں اور ایک حقیقت سے پردہ اٹھایا جس کے مطابق تین اپنا حصہ میری شادی سے پہلے لے چکے تھے۔ دراصل ان کا کوئی دوست امریکہ جا رہا تھا

لڑکیوں کا چہرہ نظروں کے سامنے آتا رہا۔ اگلے دن میں نے چھٹی کی درخواست اسکول میں بھیج دی اور خود ریسہ کو بتائے بغیر اس خاتون سے ملنے کے لیے کیمپ آگئی۔ خاتون نے اپنی دکھ بھری کہانی یوں سنائی۔ ”میرا نام ساجدہ ہے۔ میرے شوہر تین احمد دو سال پہلے ایک حادثے میں مارے گئے۔ میری ان کے ساتھ کو میرج تھی لہذا تین کے گھر والوں نے مجھے کبھی بہو تسلیم نہیں کیا البتہ تین احمد ہمیشہ مجھے صبر کی تلقین کرتے تھے۔ میں سسرال میں دوسرے نمبر کی بھوتھی۔ میری شادی کے بعد دونوں غیر شادی شدہ مندوں اور بڑی بھابھی نے گھر کا ہر کام مجھ پر ڈال دیا۔ میں سارا دن کلوہو کے تیل کی طرح کام کرتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود گھر والوں کے طعنوں کی بوجھاڑ مجھ پر جاری رہتی۔ مجھے بدچلن، آوارہ بے غیرت کے القاب سے نوازا جاتا تھا۔ شادی کے دو سال بعد میری کوبہری ہوئی اور کاشف کی پیدائش نے میرے سارے غم دور کر دیئے۔ ہم دونوں میاں بیوی، کاشف کی آمد سے بہت مسرور تھے۔ ہماری خوش سسرال والوں کو ایک آنکھ نہ بھائی وہ بدستور مجھ میں کڑے نکالتے رہے لیکن میں خاموشی سے کام میں جتی رہتی۔ اگلے سال نازیہ اور شازیہ کی صورت میں دو بیٹیاں ہماری زندگی میں داخل ہو گئیں۔ یہ جڑواں بچیاں تین کی آنکھوں کا تارہ تھیں۔ وقت اسی طرح نکلیں اور راحیوں کے ساتھ گزرتا رہا اور میرے بچے جوانی کی سرحدوں کو چھونے لگے۔ بیٹا پندرہ سال کا اور لڑکیاں چودہ سال کی ہو گئی تھیں۔ دونوں بیٹیوں نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ ان کی خوبصورتی اور حسن کی وجہ سے میری جیٹانی ہم سے اور زیادہ چٹنے لگی تھیں کیونکہ ان کی بیٹیوں کے رشتے میری بیٹیوں کی موجودگی میں نہیں ہو پارہے تھے۔ آنے والے لوگ نازیہ اور شازیہ کو پسند کر

رفاقت جاوید قاضی

ایک عجیب پریم لکھا

گل حید کا خیال
تاریکی شب حد سے گزر جاتی ہے لیکن
امید کا شعلہ ہے کہ مدہم نہیں ہوتا

صنم خانے میں پروان چڑھنے والی ایک داسی کی کہانی، اس نے خدا کو پہچان لیا تھا



”سانپ..... سانپ.....“ کی صدا بلند ہوئی تھی۔
ادھر کا شرف پر بے ہوشی طاری تھی کسی نوجوان نے
جلدی سے ایک کپڑا اس کے ہاتھ پر مضبوطی سے
باندھا تھا لیکن ہائے قسمت..... میرا کا شرف بچ نہ
سکا..... وہ مر گیا۔ مجھے تو جیسے غم سننے کی عادت ہو گئی
تھی۔ اس وقت ایک سکتے کی سی کیفیت مجھ پر طاری
تھی۔ نازیہ شاز یہ بری طرح رو رہی تھیں۔ جانے
کب مجھے ہوش آیا تھا۔ صبح آ جا لالچیل چکا تھا لیکن
میرے اندر کے اندھیرے بڑھ گئے تھے۔ کا شرف کی
تدفین ہو گئی اور میں زندہ تھی۔

کاش ہمیں آصف بھابھی گھر لے جاتیں تو
کا شرف یوں نہ مرنے پھر خیال آتا۔ ”نہیں“ کا شرف کی
موت اسی طرح لکھی گئی تھی، مختلف خاندان اس
کمپ میں آباد تھے۔ سب کی دکھ بھری داستانیں کلیجے
میں آگ بھردیا کرتی تھیں۔

ایک دن جب تمام متاثرین دو دن سے بھوکے
تھے شور ہوا کہ کھانا آچکا ہے۔ لو۔ میری دونوں
بیٹیاں کھانا لینے چلی گئیں۔ سائن اور روٹی تھی۔ بہت
وقت گزر گیا تھا لہذا ہم تینوں ہی کھانے پر ٹوٹ
پڑے۔ کھانا بہت لذیذ تھا لہذا ضرورت سے زیادہ
ہی کھا گئے۔ کھانے کے کچھ دیر بعد ایسی نیند آئی کہ
ہوش ہی نہ رہا۔ جانے کتنا وقت سوئے تھے؟ جب
آکھ کھلی تو ایک اور قیامت موجود تھی کمپ کی جوان
لڑکیاں غائب تھیں۔ دراصل یہ کھانا کسی رئیس
زادے کی طرف سے آیا تھا۔ کھانے میں بے ہوشی
کی دوا شامل تھی۔ کھانے کے بعد جب سب بے
ہوش ہو گئے تو رئیس زادے کے آدمی کمپ سے
لڑکیوں کو لے گئے۔ کچھ دیر بعد سب کی جوان بیٹیاں
اپنی عزت لٹا کر واپس کمپ پہنچ دی گئیں۔ لڑکیوں
پر سکتہ سا طاری تھا۔ وحشیوں نے ان کے ساتھ
زیادتی کی انتہا کر دی تھی۔ نازیہ شاز یہ بھی اسی ظلم کا
شکار ہوئی تھیں۔ میں نے وہ کمپ چھوڑ دیا اور تھکیں



نیو دہلی میں واقع پاکستانی ایمبیسی میں میرے شوہر احمد علی کی پہلی بار پوسٹنگ ہوئی تھی۔ میں اور میرے تین بچے بھی دہلی میں شوہر کے ہمراہ تھے۔ اُن دنوں دہلی کی پر رونق شاموں، بجگانی راتوں اور ٹکڑی اچلی صبحوں میں ہم خاصے مصروف رہتے تھے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے میل جول نے ماحول بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ ایک دوسرے کے کلچر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا سب کا بہترین مشغلہ تھا۔ عیدین، قربات اور پاکستان ڈے کے موقع پر ایمبیسی اپنے رسم و رواج کو مد نظر رکھ کر بے حد دلچسپ اور دل آویز پروگرام تشکیل دے کر سب کو اپنے کلچر سے روشناس کرانے میں بہترین کردار ادا کرتی تھی۔ اس وقت ایک میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ میرے شوہر کو جب بھی دو چار چھپاں ملتیں وہ یہ نہری موقع ہاتھ سے نہ نکلنے دیتے اور فیملی کو لے کر ہندوستان کے تاریخی مقامات کی سیر و سیاحت کے لیے نکل جاتے تھے۔ وہاں مسلمانوں کی ثقافت اور تہذیب کے آثار کو دیکھ کر یہ ملک اپنا اپنا سماں لگتا تھا۔ اس بار دیرہ دون کے پروگرام میں ہم دونوں کی پسندیدگی کا خاصا دخل تھا کیونکہ احمد اور میرے والد صاحبان نے دیرہ دون کے اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی اور احمد کے والد نے تو دیرہ دون آری اکیڈمی سے گریجویشن بھی کیا تھا۔ یوں یہ جذبہ شوق ہمیں دیرہ دون لے آیا تھا۔ جگہ بے حد پرسکون اور خوبصورت تھی، ٹھنڈے علاقوں کے رہنے والے لوگ بھی دھیمے مزاج کے واقع ہوئے تھے۔ خاطر مدارات اور دلجوئی میں بے مثال لگے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ میسوری روانہ ہو گئے۔ میسوری مری کی چھوٹی اور ناتواں سی بہن لگی۔ مری کو تو انگریزوں نے ”پہاڑوں کی ملکہ“ کا خطاب دیا تھا مگر میسوری میں وہ بات نہ بھی اسی کے

بغل میں اسلام آباد کی طرح دیرہ دون تھا۔ میسوری پہاڑوں میں ایک ہی طویل شاہراہ تھی جس کے دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی کھانے پینے اور تھکے تحائف کی بے حد دستی دکانیں تھیں جو رات گئے تک کھلی رہتی تھیں اور سیر و سیاحت کے شوقین وہاں کی یادوں سے وابستہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ خریداری ضرور کیا کرتے تھے۔ اس سڑک پر گھوڑ سوار بھی تھے۔ پیدل چلنے والے مرد، عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔ اس سڑک پر بھیڑ ہونے کی وجہ سے کاروں کی آمد و رفت پر پابندی لگادی گئی تھی۔ سب ہی من موہی اور خوش و خرم چہرے پر نگلنے مسکان سجائے زندگی کی دوڑ دھوپ سے نکل کر یہاں خاصے ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ رات کے قیام کے لیے چھوٹے کمروں والے بڑے بڑے ہوٹل موجود تھے۔ ہم نے بھی ازراہ مجبوری ایک رات گزارنے کا تہیہ کر لیا مگر وہ ایسی جگہ تھی کہ رات بھر لوگوں کے قہقہوں، ہنسی مذاق اور اسٹیریو کے اپنی بھر پور والی شوریدہ سرگانون اور بے ڈھنگی موسیقی کی آواز نے رات کے سکون و آرام کو نکل لیا تھا۔ وقتاً فوقتاً دور سے ڈھول اور بانسری کی آواز بھی آنے لگتی۔ یوں ہماری شب آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔ جو نئی صبح ہوئی ہم نے فوراً ہوٹل چھوڑ دیا۔ صبح بیداری کے اثرات ہم دونوں کے چہروں پر ثبت ہو چکے تھے۔ دیرہ دون پہنچ کر ہم نے رات ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں پر ہونے والی موسیقی کی محفل سے خوب لطف اندوز ہوئے اور اگلی صبح دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔

بچے کچھلی سیٹ پر ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ آسمان پر آفتاب پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بڑھتا ہوا درجہ حرارت دیرہ دون سے دور سے دور ہو جانے کی تصدیق کر رہا تھا۔ ہمارا سفر خوش گپیوں میں کٹ رہا تھا۔ ایک جگہ احمد نے گاڑی

سڑک کے بائیں طرف روک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آس پاس بہت چھوٹی اور نیچی پہاڑیوں کے درمیان ایک خستہ حال گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کی نمایاں خصوصیت اس کا مندر تھا جو اپنی شان و شوکت کی گواہی دے رہا تھا۔ گاؤں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر خاصی نیچی جگہ پر پانی کا ایک چھپر نظر آ رہا تھا جو شاید مرگٹ تھا، وہاں دو تازہ چٹائیں آگ کے سپرد کی گئی تھیں اسی لیے وہاں دھوئیں سے فضا دھندلا رہی تھی۔ میں نے ایسے المناک نظارے محض انڈین فلموں میں ہی دیکھے تھے آج حقیقت میں دیکھ رہی تھی۔ احمد نے گاڑی گاؤں کی جانب جانے والی جگہ تنگ اور ناہموار سڑک پر موڑ لی۔ آس پاس کے بے رونق درختوں اور خاردار جھاڑیوں سے محسوس سی ٹپک رہی تھی۔ ذرہ ذرہ گاؤں والوں کی غربت اور کسمپرسی کی داستان پیش کر رہا تھا۔ ہم دھوئیں کے اڑتے بادلوں کی سمت رواں دواں تھے۔ جتنی سڑک کے اختتام پر پہنچ کر گاڑی رک گئی کیونکہ سامنے اڑتی ہوئی ریت کے دھندلے منظر کے پار شمشان گھاٹ موجود تھا جس کے کنارے دو چٹائیں جل رہی تھیں۔ پانی پر پیلے رنگ کے تازے اور باسی پھول تیرتے ہوئے اداسی کا سماں پیش کر رہے تھے۔ کناروں پر جی ہری ہری کالی پانی کی گندگی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔ دو عورتیں بلاؤز کے بغیر میلی کچلی ساڑی اپنے لاغر اور کمزور جسم پر لپیٹے چھپر کے کنارے بیٹھی چٹیل کی میز می میڑھی کالی شدہ گاکروں میں چلو سے پانی تھار کر ڈال رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں نیم دراز نوعمر عاشق دنیا جہاں سے بے خبر بوس و کنار میں مگن تھے۔ میں نے کراہیت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک دیوانہ سا جوان لڑکا ہٹا پھرتا کرتے ہوئے کھڑا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس نے زندگی میں پا جاسے کا نام تک نہ سنا ہو۔ وہ ہر آتی جاتی لڑکی یا

عورت حتیٰ کہ چھوٹی بچی کے رو برو کرتے اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور قہقہے لگانے لگتا۔ عورتیں اسے گھونہ اور پھٹر رسید کر کے آگے بڑھ جاتیں جبکہ لڑکیاں منہ چھپا کر کھسکھس کر کرتی گز جاتیں۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر یاگل اور جوانی سامرود دینا سے بے نیاز خود سے باتیں کرنے اور کسی کھیر مسئلے کو سلجھانے میں مصروف تھا۔

میں اس عجیب نظارے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ میری نظر ایک نیم برہنہ لڑکی پر پڑی اور پھر نگاہ اسی پر ٹھہر کر رہ گئی۔ اس کی سیاہ سوئی ہوئی چڑی نے وجود کی ہڈیوں کو ڈھانپ کر اسے ایک ڈھانچے کی صورت دے دی تھی۔ اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق اور بے مراد آنکھیں اسے مردہ قرار دینے کو بے تاب تھیں۔

چھاتی کا جوہن اور ابھار اس کی بھری جوانی میں بھی کمزوری اور ضعف کو نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی ابھری ہوئی پٹیلیوں کے درمیان کمر سے لگے ہوئے پیٹ پر ناف سے نیچے فٹ بال کے حجم جتنی رسوئی کو دیکھ کر میں تڑپ اٹھی تھی۔ چھپر کے آس پاس پھیلی ہوئی پتی ریت کو وہ انہماک سے خود پر ڈال کر ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے کسی کو ڈھونڈتی۔ اس کے پاس سے ہر گزرنے والا اس کے لاغر و جود کو پاؤں سے ٹھوکر لگاتا مٹھی بھر ریت اس کے گھونسلے سیاہ بالوں میں ڈال کر خطرہ گالی دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ عورت کی اس بے حرمتی پر میں شرمندگی اور غصے سے بے کل ہو گئی۔ گاؤں کے عقب میں واقع یہ چھپر اور اس کے آس پاس کا تمام علاقہ یہاں کے ہر نئے کام چور ہذا حرام اور چری کینوں کی تفریق گاہ بنی ہوئی تھی۔ وہ عورت تھابت کے باوجود اپنے وجود کو کھینچتی ہوئی میرے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوئی اور مجھے قہر آلود آنکھوں سے ٹھوکتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولی۔

”حرام جادی..... تمناشہ دیکھنے کو آگئی ہے۔“

پھر ریت کی مٹھی بھر کر اس نے گاڑی پر پھینکی۔ میری

پوجا کرنے کو آوت ہے اری میں ناری جات کتو بدعادت ہوں۔ میری مائتاری کے روپ میں ناکن ہوئے میری جیندگی کو ڈس گئی۔ مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر اس منحوس مندر کی دیوداسی بن گئی۔ میرے اس نحوست مارے جسم کی اس گاؤں میں ہر ایک نے کھوب دجیاں اڑائیں۔ ”وہ بالوں کو بار بار کھجا کر آنکھوں کو لیتی اور اپنی مختصر داستان بے ہودہ اور نحس گالیوں سمیت میری سماعت میں اڑیل رہی تھی۔ اس اثناء میں گاڑی کے آس پاس بچوں نے محاصرہ کر لیا تھا جسے چار پرہیوں والی اس انوکھی اور نرالی شے کو وہ پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ اس عورت کی یہ حالت دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر جھنجھکی۔

”احمد یہاں سے نکلیں میں مر جاؤں گی احمد“ انسان اتنا بے حس اور درندہ ہو سکتا ہے میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ ابھی تک اسٹون ایچ میں رہ رہے ہیں جہاں زندہ رہنے کے لیے ہر طرح کی درستی تھی اور خود غرضی جائز ہے۔ عورت ذات کی یہ بے حرمتی اور ذلالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ ”خدا کا شکر تھا کہ ہمارے بچے ابھی تک بڑے ہوئے تھے ورنہ وہ زندگی کے اس بھیاں تک اور گھٹاؤ نے روپ کو کبھی فراموش نہ کر پاتے۔ احمد نے گاڑی بمشکل ریورس کی اور میں روڈ پر آ کر روک دی۔

میں نے متوشن نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ ”احمد“ وہ کیا منظر تھا مگر جو بھی تھا بہت ہی شرمناک تھا مگر اس خیم برہنہ جوان لڑکی کی ناگفتہ بہ حالت اس کی زبان سے نکلنے والی کثافت اور اس کی آنکھوں کی نفرت میرے وجود کی نس نس میں برائیت کر گئی ہے۔ وہ مکمل طور پر ہوش میں تھی۔ پتہ نہیں وہ اس حالت تک کیسے اور کیوں پہنچی؟ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں احمد میرا ساتھ دیجیے پلیز۔“

”توبہ کرو نامزد وہ لوگ تمہیں اٹھا کر چھینر میں پھینک دیں گے اور تالیاں بجا کر اپنی فتح مندی کا اظہار کریں گے۔ جہالت اور غربت نے انہیں بے حس کر رکھا ہے۔“ احمد نے بھینگی سے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اسی وقت میری نظر سامنے لگی میری جج نکل گئی۔ وہ برہنہ بڈوں کا ڈھانچہ اپنے ناتواں وجود کو اپاہجوں کی طرح گھینٹا ہماری گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کسی پھل بھری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ نامور اسٹریٹ کی وجہ سے اس کے بدن کے کئی حصوں پر جگہ جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں جن سے سیاہ خون رس رہا تھا۔ اس نے بے بسی اور لاچارگی سے مجھے دیکھا۔ اب وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے نیم دراڑ تھی۔

”اور شیطان کو یاد کرو اب حاضر ہو جانے پر خوف زدہ کیوں ہو؟“ احمد نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ”میں خوفزدہ نہیں ہوں احمد مجھے انسان کی درندگی پر روننا آ رہا ہے۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکوں۔“ میں رندھے ہوئے لہجے میں بولی اور گاڑی سے اتر کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ سورج کی تپتی اور تیز دھوپ میں پل بھر کو رونا بھی محال تھا۔ نبھانے اس مظلوم نے کتنے موسموں کے نشیب و فراز اس ریت میں بسر کیے ہوں گے؟ میری نظروں میں لگاؤ اور اپنائیت دیکھ کر اس نے حوصلہ پکڑا۔

”اگر پرانی دلی جا رہی ہو تو میرا ایک پیغام لیتی جاؤ میرے بلال کے لیے۔“ وہ ثقاہت سے لاجت بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں جس کے پیار میں خاک ہو گئی وہ کہاں کھو گیا؟ اب تو انتظار نے جنونی ہی بنا دیا ہے۔“ اس کا لہجہ جتنی رد و کد سے ہمکنار تھا۔ ”بلال کون؟“ میں نے قدرے متعجب لہجے میں پوچھا۔

”وہ میرا بچہ نہیں تھا مگر میرے دل و دماغ نے

اسے اپنا بچہ مان لیا تھا۔ اسے جا کر بتاؤ تمہاری راہ بلال آخری سانس تک انہی جھاڑیوں میں بیٹھی ہماری راہ تک رہی ہے جہاں تم نے مجھ سے آشیانہ بنانے کا عہد کیا تھا۔“

”تم مسلمان ہو؟“ میں اس کا نام سن کر سر سے پاؤں تک لرز گئی تھی۔

”ہاں ہندو سے مسلمان ہونے تک کے سفر میں یہ حال ہو گیا۔“ وہ رقت انگیزی سے بولی۔ ”میرے ساتھ چلو گی؟“ میں نے نہایت دلجوئی اور نرمی سے کہا۔

”میں.....؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”ہاں میں دہلی میں رہتی ہوں تم میرے ساتھ پلو ہم مل کر بلال کو ڈھونڈ نکالیں گے مگر ہمیں اپنی لام داستان مجھے سنانی ہوگی۔“ میں نے اپنے ہیک سے کپڑے نکال کر اسے پہنائے اور اس کی خیم برہنگی اور کی پھر کھانا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کھانے پر ایسے ٹوٹی جیسے جنم جنم کی بھوک ہو کھانے کے بعد پچھلی سیٹ کے پچھلے حصے میں جہاں سامان بھرا ہوا تھا سامان کو آگے پیچھے سیٹوں کے نیچے ایلو جیسٹ کرنے کے بعد اس کو وہاں لٹا دیا گیا اور ہم لوگ دہلی کے مشہور و معروف گنگارام ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

.....

شانتی دیوی آٹھ سال کی تھی جب اس کی ماں ہاسٹوں کے چھوٹے سے گاؤں کے پوتر مندر میں خدمت گزاری کے لیے اسے سوئپ گئی تھی۔ اس کی ساتویں بیٹی تھی۔ اپنی غربت اور بھوک سے تنگ آ کر ایک ماں کی مائت نے اپنے دل کے تمام گلروں کو اسے جدا کر کے مندروں کی دایاں بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہندو مذہب میں یہ عمل نہایت قابلِ اہم گردانا جاتا ہے۔ جوانی کی حدود پار کرنے

کے بعد یہی دیوداسی مندر کے مذہبی پیشوا پنڈت جی کے بعد پورے گاؤں کے مردوں کی دین مول جائیداد بن جاتی ہے جس پر ہر ایک برابر کا حق ہوتا ہے۔ اس کے نان نفقے کی تمام تر ذمہ داری مندر کے بجٹ سے پوری کی جاتی ہے۔ شانتی دیوی کے لیے یہ انہونی یا انوکھی بات نہ تھی۔ وہ تو اسی مذہب اور اسی معاشرے کی پروردہ لڑکی تھی۔ سانولے رنگ کی دھان پان سی یہ لڑکی بناؤ سنگھار کے بعد تپتی پرکشش لگتی تھی کہ ہر جوان ادھیڑ یا بوڑھے مرد کی اس پر نظریں ٹھہر جاتی تھیں اور وہ بھی ان سب کو اشاروں سے کھٹکتی کاناچ بنایا کرتی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ یکدم اس کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ وہ راہ عشق کی مسافر بن گئی۔ ہر ایک نے لاکھ سمجھایا مگر اس کے اعصاب پر عشق اس بری طرح مسلط ہو گیا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ انچادھرم اپنی ذات پات کو اپنے عشق پر ثار کرنے پر تکی ہوئی تھی۔ بلال نامی بھولا بھٹکا نوجوان پرانی دلی سے اس گاؤں میں پہنچا تھا۔ مندر کے آشرم میں سستانے گیا تو اس نے لڑکے کو گاؤں والوں نے اسے وہاں رکھنے کی اجازت نہ دی کیونکہ وہ مسلمان تھا۔ شانتی دیوی نے نہایت رحم دلانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا اور بے حد سر پرستانہ انداز میں اس کی روداد سن رہی تھی۔ وہ ایک یتیم لڑکا تھا در در کی شوگرین بھوک تک اس کا مقدر بن چکا تھا۔ شانتی دیوی نے اسے سڑک کے پار والے چھوٹے سے گاؤں کی ایک مسجد کا ٹھکانہ بتایا کہ رات وہاں گزار کر واپس پرانی دلی چلا جائے۔ بلال نے اسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اسے جج جج کی دیوی لگ رہی تھی۔

بلال نے مسجد کی صفائی ستھرائی کا کام پکڑ لیا۔ وہ چند دن یہاں قیام کر کے میسوری کسی ہوٹل میں حیرہ

کیری کے کام پر جانا چاہتا تھا۔ ایک روز وہ سب سے چوری چھپے شانتی کا شکریہ ادا کرنے پہنچ گیا۔ گھنٹوں شانتی اس سے باتیں کرتی رہی اور وہ خاموش منتارہا پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ یہ ہر روز کا ملاپ کب تک راز میں رہتا، مندر میں پھل چنگی کہ ایک مسلمان جوان کے مذہبی اصولوں کے پیش نظر شور قرار دیا گیا تھا، وہ ان کی داسی سے ملنے آتا ہے۔ وہ اپنے مذہب کی اس توہین اور ہنک پر تڑپ اٹھے تھے۔ اس غلطی اور گناہ کی پہلی سزاوار شانتی دیوی تھی۔ مندر کے پروہت نے اسے جلا مندر کرنے کی سزا سنائی کہ بلال کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تو شانتی نے پنڈت جی کے سامنے بلال سے عشق کا اظہار کر دیا، تاہم کنیش جی کے سامنے قسم اٹھائی کہ بلال سے اس کے جسمانی تعلقات نہیں رہے تو اس کی سزا میں قدرے کمی کر دی گئی۔ اس کے مندر سے باہر نکلنے پر سخت پابندی لگ گئی۔ دوسری طرف مولانا جی کو ڈرا دھک کر بلال کو مسجد سے نکلوا دیا گیا اور یوں وہ مندر اور گاؤں کی ملکیت شانتی داسی پر اپنے ہر طرح کے اصول لاگو کرنے لگے۔ ایک مسلمان ان کی ملکیت کا حصہ دار بننے کی گستاخی کیونکر کر سکتا تھا؟ وہ تو بلال کو اس سے بڑی سزا دینا چاہتے تھے مگر مولانا جی اور دوسرے لوگوں نے مل کر اس مسئلے کا حل اس کی جان بخشی کی صورت میں نکالا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اسے واپسی دلی جانا ہے۔

بلال جانے سے پہلے ایک رات چوری چھپے کسی طرح مندر تک آیا اور شانتی کو چھپڑ کے کنارے ملنے کا بول کر چلا گیا۔ آکاش پر ہلکے ہلکے بادلوں کے کھڑے بخور گردش تھے۔ بادلوں کی اوٹ سے آنکھ پھولی کھیلنے چودھویں کے چاند کا جمال عروج پر تھا۔ بلال جہاز یوں میں بیٹھا بے قراری سے شانتی کا

انتظار کر رہا تھا، انتظار کا ایک ایک لمحہ اس پر صدیاں بن کر گزر رہا تھا۔ آخر اس کا انتظار ختم ہوا اور سبھی سبھی سی شانتی اس کے پاس آگئی۔ اس لمبی، چھپی روشنی میں گرد و پیش کی فضا دیدار یار سے جموم اٹھی۔ چند لمحوں تک دونوں گرد و پیش سے بے نیاز ایک دوسرے کی بانہوں میں گم رہے پھر شانتی چھوٹی موٹی کی تیل کی مانند شرما کر الگ ہو گئی اور بلال کے شانے پر سر رکھے آنسو بہانے لگی۔

”شانتی“ کبھی کبھار تمہیں ملنے آ جایا کروں گا؟ میں اپنی محسن اور ہمدرد کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟“ ”میں تمہارے بغیر جیون نہیں پتا سکتی بلال! مجھے اپنا کلمہ پڑھا دو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری دلہن بن کر جیون بھر تمہارے لیے سولہ سنگھار کرنا چاہتی ہوں۔ بلال.....! مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں نے محبت کی جو کو تم سے لگائی ہے اسے بھانڈ دینا۔ مجھے اپنے من میں چھپاؤ اپنا نام دے کر مجھے جتنی بناؤ۔ ہم دونوں مل کر ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔ ہماری محبت اس گھر کو زمانے کے طوفانوں سے محفوظ رکھے گی۔ میں تمہاری داسی بن کر جیون پتا دوں گی۔ میرے پاس اس گاؤں کے تمام برہمن اور گھسٹری اپنی باسی بستیوں سے جان چھڑا کر پوجا کرنے کو آتے ہیں، ان کے لیے میری حیثیت دیوی کی نہیں، کھلونے کی ہے انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے لیکن اب میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں مجھے اپنا پتی چاہیے جو تمہارے جیسی پوتر آتما رکھتا ہو۔“ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

”یہ کیسے ممکن ہے شانتی؟ ہماری ذات، برادری، ہمارا دین، ہمارا برہمن پن، سب کچھ الگ الگ ہے؟“ ”مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ مجھے تمہارا دین اسلام بہت پوتر لگتا ہے۔ میں جانتی ہوں آج تک کسی مسجد میں لاوارث لڑکی کی مجبوری کا فائدہ

میرا سے ذلیل نہیں کیا گیا۔“

”تمہیں میرے مذہب کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں اس لیے تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ کون سا مذہب پوتر اور عظیم ہے؟“ بلال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بڑی سڑک کے اُس پار ایک مسجد ہے۔ وہاں مولانا جی کے پاس میں کبھی کبھار چوری چھپے کر ان سے اسلام کی تعلیم لیتی رہتی ہوں۔ اُن کی تعلیم اور درس پر میں پورا دھواں رکھتی ہوں۔ تم سے پہلے ہی میں نے تمہارے دین کو اپنانے کا خواب دیکھا تھا۔ میرا خواب پورا کر دو مجھے اس گندگی نکال لو، پاپ کے اس گڑھے سے مجھے تم ہی نکال دو بلال.....! غلامت کی اس دلدل کو ہمارا مذہب پوتر کہتا ہے۔“

”میرے ساتھ تمہارا جیون کھن ہو جائے گا۔ تم میرا جاؤ گی شانتی.....“ بلال نے اسے سمجھانے کا انداز میں کہا۔

”تو کیا ہوا؟ کم از کم اس دھرتی پر میرا گھر میرا تو ہوگا۔ تمہارے ساتھ میں ہر مصیبت کو پھیل لوں گا۔“ اس نے بلال کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بلال نے اس کی ثابت قدمی دیکھتے ہوئے اس کے اُٹھنے پر اسے لگا لیے پھر اس نے اسے گلہ مایا اور اب وہ شانتی سے زاہدہ بن چکی تھی۔

”اب میں یہاں نہیں رکوں گا واپس دلی جا کر تمہارے لیے گھر کا انتظام کروں گا پھر سامنے والی مسجد میں کلاچ پڑھوا کر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرا خواب پورا ہو گیا۔“ وہ خوشی سے آنسو بہاتی اس سے لپٹ گئی۔

”آج سے تمہارا یہ جسم میری امانت ہے، اب اس میں خیانت کی رتی بھر گنجائش نہیں رہی کیونکہ تم اپنا مال ہو۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی بلال، مگر یہ سب

بھید ہی رہے کیونکہ اگر اس بارے میں کسی کو بھی خبر ہو گئی تو مجھے مندر سے نکلتا پڑے گا کیونکہ ان کے مطابق میں ناپاک اور غلط ہو کر ان کی پوتر پوجا گاہ میں ایک لمحہ نہیں گزار سکتی۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ بلال نے اسے گلے لگایا اور واپس دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک نئی سوچ کے ساتھ وہ اپنی راہ پر گامزن خوشی سے سرشار لنگھتا ہوا جا رہا تھا۔ آج اسے یقین ہو گیا کہ عورت چاہے کسی مندر کی داسی ہو یا کوٹھے کی طوائف اس کے اندر فطری شرم و حیا اور عزت نفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ایک ہندو لاوارث لڑکی کو مسلمان بنانے کی خوشی اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی۔

”اری“ تجھے ہم یونہی روٹی نہ دیوں گے، یہ مت بھولیو تو دیو داسی ہے اس مندر کی پچھلے بیس سال سے۔ تجھے کھلا پلا کر جوان کیا اور پھر تجھے مہمان بنا کر عجت بخشی، کپڑے لٹے کی کمی آنے دی نہ چھاپ مندری کی اپنی جتدی کو کھراب کرنے پر کیوں تل گئی ہے؟ میری بات یاد رکھو یہ پر دیسی کبھی واپس نہ آویں۔ بھول جا اس مسئلے کو۔ نجانے کیا کیا سبب باغ دکھا کر تیرا دماغ کھراب کر گیا سالہا، وہ کیا آشا دلا کے گیا ہے؟ جہاں میں بھی تو سنوں۔“ مندر کا پنڈت غصے سے چیخ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے سامنے بیٹھی تھی قریب ہی ایک چوٹی اور برہمن کھڑے اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہے تھے۔

”سالی بولتی کیوں نہیں؟ لگتا ہے تیری جہان وہ ساتھ ہی لے گیا ہے مگر میں تجھ سے اٹھوا کر چھوڑوں گا کہ وہ تیرا یا رسلا تجھے کیا کہہ کر گیا ہے؟“ اس نے شانتی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”رائے بول؟ نہیں تو تیرے یار کے کھڑے کروا دوں گا۔ دلی کون سا دور ہے۔“

اس درجہ مری جان کو آزار رہا تھا
وحشت سے میں دیوار پہ سر مار رہا تھا

اُس نے میری قسمت میں خسارہ ہی لکھا ہے
جیتا ہی نہیں میں تو فقط ہار رہا تھا

اب یوں ہے تیری یاد ستانے لگی مجھ کو
اب تک تو تری یاد سے سرشار رہا تھا

گزارا ہے مرے پاس سے انجان سائین کر
لگتا ہی نہیں یہ کبھی دلدار رہا تھا

کردار پہ اپنے تو ندامت نہ تھی ان کو!
موضوع بحث کل مرا کردار رہا تھا

پھینکا ہے اُسے عالم وحشت میں پرے پھر
ہاتھوں میں مرے شام کا اخبار رہا تھا

ہاں جس نے لگوائے تھے بیڑے کو سو درے
وہ بھی تو مری قوم کا سردار رہا تھا

اندھ سے تو نکھرا ہوا اک شخص ہوں محسن
بس یہ کہ سلامت مرا چندار رہا تھا

محسن سلیم

کھنی جھاڑیوں میں چھپ جاتی۔ محبوب کے انتظار میں وہ ہر طرح کے خوف سے بے نیاز تھی مگر اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوگئی، بخار کے نتائج ناف پر رسولی بن کر نمایاں ہو گئے۔ چند ہفتوں میں رسولی کا سائز فٹ بال کے برابر ہو گیا۔ تھابت اور کمزوری سے چلنا پھرنا تو درکنار اس کا بیٹھنا محال ہو گیا۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ جب لوگوں نے اسے جھاڑیوں سے نکال کر ریت پر لٹایا تو وہ اپنے نیم پر ہنہ جسم پر ریت ڈال کر ستر پوشی کی کوشش کرنے لگی مگر انوس، کسی کو بھی اس مظلوم پر ترس نہ آیا۔ وہ اپنے دھرم سے پھرنے کی سزا بھگت رہی تھی۔ اسے عبرت کا نشان بنا دیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے اذیت پہنچاتے اور اسے پوجا کا نام دیتے۔۔۔۔۔

اور وہ پرسکون آواز میں کہتی، ”دیکھو بلال! میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ اب تم اپنا وعدہ نبھانے آ جاؤ۔“

نوسلم زائدہ کی کہانی نے میری روح تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ عورت ذات کی اس تذیل پر میرے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ہسپتال کے بیڈ پر پڑی اس زندہ لاش میں جینے کی اگر کوئی امیگ تھی تو بس یہی کہ وہ اپنے محبوب کا دیدار کرنا چاہتی تھی اور ایک دن اس کا انتظار بھی ختم ہوا جب بلال اسے ڈھونڈتا ہوا اچانک ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ بلال کو دیکھ کر ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ آپریشن سے محض چند گھنٹے پہلے بلال اس سے آ ملا تھا۔ کچھ دیر بعد زائدہ کو رسولی کی سرجری کے لیے آپریشن تھیر میں لے جایا گیا تو بلال سراپا دعابن گیا تھا۔ ان پریمیوں کے سچے پریم کو دیکھ کر میرے دل کے نہاں خانے سے بھی دعا نکلی تھی کہ خدا ان کی آزمائش کے دن ختم کر کے انہیں خوشیوں سے نوازے۔

”گاؤں میں ڈونڈی پڑا دو کہ شانتی دیوی نے اپنا دھرم بدل لیا ہے۔ اگر کسی نے اسے گھر میں پناہ دینے کی یا کسی قسم کی مدد کرنے کی گستاخی کی تو اسے بھی اس گاؤں سے دربر ہونا پڑے گا۔ یہ مندر کا فیصلہ ہے ہمارے دھرم کا فیصلہ ہے اس سے دیا کرنے والے کو بھی سجالے گی۔“ پنڈت چندر لال اشتعال سے گرج رہا تھا۔ جنون میں اس کے منہ سے جھاگ ابل رہے تھے۔

”مجھ پر دیا کرو پنڈت۔“ وہ التجا بھرے لہجے میں بولی مگر ان شیطانوں نے اس پر جیسے حملہ کر دیا۔ جوتی نے اس کی ساڑھی کو اس بے دردی سے کھینچا کہ وہ ہل بھر میں اس کے وجود سے الگ ہو گئی۔ بلاؤز پر ایک مضبوط گرفت اس کے آخری ستر کو بھی تار تار کر گئی ساتھ ہی گھونے اور لالٹوں کی بھرمار سے وہ ادھ موٹی سی زمین پر ڈھے گئی تاہم اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اٹھی اور شمشان گھاٹ کی طرف بھاگی اور ان ہی جھاڑیوں میں چھپ گئی جہاں کلمہ شہادت پڑھ کر اس نے اسلام کی روشنی حاصل کی تھی۔ اس وقت اس بے خانماں کو یہ کلمہ کی نعمت سے کم نہ لگی۔ آج راما سنج کے بجائے اس کی زبان پر کلمہ تھا۔ اسے پر ماتما سے بھلے کی توقع تھی۔ ایک مہینہ پہلے مولانا جی کے انتقال سے اس کے سر سے پدرانہ شفقت بھرا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ نئے مولانا جی کم ہمت اور بزدل تھے لہذا ان میں اتنا دم ختم نہ تھا کہ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکیں اور ایک مندر کی دیوداسی کو پناہ دے سکیں۔ وہ بے بسی سے ان جھاڑیوں میں ہی چھپ کر بلال کا انتظار کرنے لگی۔ انہی جھاڑیوں میں اس نے واپس آنے کا عہد کیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ باہر نکلتی کوڑے سے سوکھی روٹی کے ککڑے تلاش کر کے پیٹ کی آگ کو شہد کر تی، چمپے کے غلیظ اور بدبودار پانی سے سوکھی زبان کو تر کرنے کی کوشش کرتی اور واپس

”پنڈت جی! یہ کام آپ کو نہ سچ ہے ہم پر چھوڑ دیں۔ اس دو ٹکے کی چوکر ی نے ہم سب کو نچا کر رکھ دیا ہے اب ہم اس کو نچا دیں گے کیا یاد کرے گی۔ برہمنوں سے دعا بازی اور فریب بڑا مہنگا پڑے گا اسے۔“ جوتی نے اس کے قریب چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میری بنتی تو سن لو پنڈت جی! میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہر وقت کے بخار نے مجھ کو مجبور کر دیا ہے مجھ میں اب سب کی کھد مت گزاری کی ہمت نہیں رہی۔ آپ کی اور داسی کو پال لیوں۔“ وہ تھابت سے بولی۔

”مسلمے کا بچہ جنے گی تو طبیعت ٹھکانے آ جاوت ہے؟“ ایک نے کراہیت سے کہا۔

”مجھ پر ایسی تہمت نہ لگائیں۔ میں نے بلال سے نہیں بلکہ اس کی شرافت سے پیار کیا ہے۔“

”تو سیدھا کہہ دے تو نے اس کا دھرم اکھتیار کر لیا ہے؟“ پنڈت زور سے گرجا۔

”بول۔۔۔۔۔؟ مجھے لگے ہے وہ تجھے یہاں سے بھگا لے جاوے گا۔ بتا، ہمیں کیا پھاندہ ہوا تجھ لاوارث کو پناہ دینے کا؟ اب میری کھوپڑی میں کچھ آدے کہ پر بھات ہوتے ہی پر چھوٹی پر سر ٹیکے تو ایٹور سے کون سی پرارتنا کرتی ہے۔ میں تیری جندگی کی جوت گل کر دوں گا۔۔۔۔۔ اس مسئلے کے لیے میں راکشس بننے سے بھی باج نہ آؤں۔۔۔۔۔ دیکھتا ہوں پر بھوتے سے سنگ چلے ہے کہ میرا ساتھ دیوے ہے؟“ پنڈت زہر اگل رہا تھا۔ اسی سے ڈاکیا پھٹی پکڑے چوکھٹ پر کھڑا ہاتھ باندھے پر تکیا مانگ رہا تھا۔ شانتی تیزی سے اٹھی اور اس کے ہاتھ سے چٹنی لے کر بغل میں چھپالی۔

”اے رائے۔۔۔۔۔ چٹنی دے دے مجھے۔“ پنڈت نے اسے دو گھونٹے لگا کر چٹنی حاصل کر لی۔ ڈاکیے نے پڑھ کر سنائی۔ شانتی کا راز کھل گیا۔

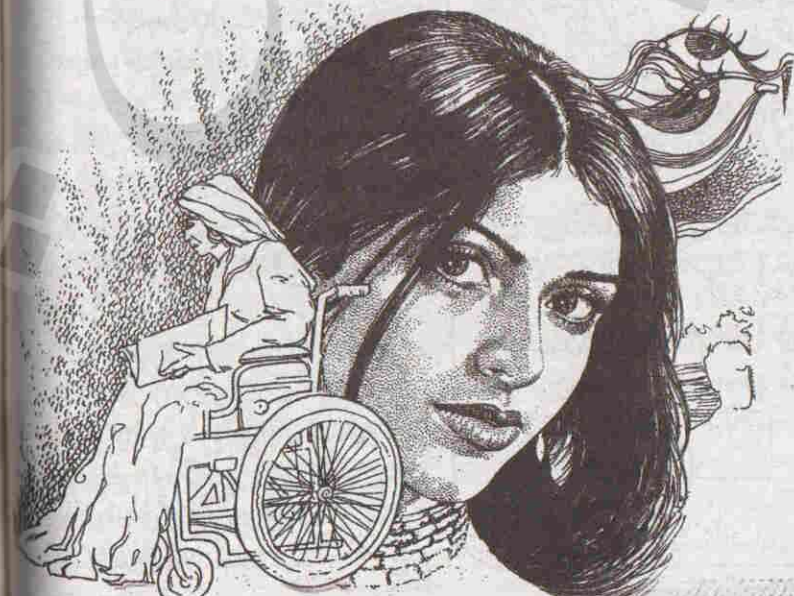
دعا سے بددعا تک

گناہ آفرین کا خیال

آساں تو نہ تھا ایسا صحرا سے گزر جانا
کانٹوں کو بھی چما ہے دامن بھی بچایا ہے

ایک بہت حسین عورت کا قصہ خاص جس کا بخت بدصورت تھا

اپنا ٹکٹ لینے کے باوجود اے اوکلیٹک ناظم آباد میں طویل اور تھکا دینے والا انتظار جاری تھا۔ میں یہاں اپنی ساس کو دکھانے کے لیے آئی تھی۔ وہ وکیل چیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی تھیں تبھی ایک بھرے بھرے جسم، گوری رنگت، بھورے دراز بالوں والی



اُس چہرے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ بار بار اٹھا کے اسے دیکھنے کے باوجود میری آنکھیں پر نہیں ہو پا رہی تھیں۔ وہ چہرہ انتہائی حسین ہونے کے باوجود فریش نہ تھا۔ خدا جانے کیوں میرا دل ان خاتون سے تعارف کو تڑپا جا رہا تھا، سو میں اپنی ساس کی وہیل چیئر گھسٹیں، ان خاتون کے برابر جا بیٹی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی آنکھیں کھولی تھیں اور میرے سے مسکرائی تھیں، یوں تعارف کی سیڑھی پر پہلا قدم خود انہوں نے رکھ لیا تھا۔

”کہاں رہتی ہیں، کیا کرتی ہیں، کیا نام ہے؟“ بنیادی سوالات سے بات چیت کا آغاز ہو چلا تھا اور جب انہیں پتہ چلا تھا کہ میں کھیتی ہوں تو وہ بہت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگی تھیں اور پھر اچانک ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”میری کہانی لکھو گی؟“ تو جیسے من کی کلی کھل اٹھی تھی۔ اب مجھے احساس ہوا میں اُن خاتون کی طرف کیوں کھنچی چلی آئی تھی شاید اُن کا چہرہ کہانی سنانے اور میرے کان سننے کو بے تاب تھے۔

مکافات عمل سے گزرتی، دُعا اور بددعا سے بڑی یہ کہانی کئی نشستوں میں مکمل ہوئی ہے یا شاید ابھی جاری ہے یہ کہانی آپ اُن خاتون کی زبانی سنیں۔

”میں بہت حسین تھی۔ احمر نے مجھے شادی کی ایک تقریب میں دیکھ کر پسند کر لیا اور والدین پر بے حد باؤ ڈال کر میرا رشتہ مانگنے بھیجا اور یہ شادی ہو گئی۔ اُس وقت میں انٹر میں آئی تھی، اس سے آپ میری کم عمری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرے لیے آنے والا احمر کا رشتہ کوئی پہلا رشتہ نہ تھا جو میرے لیے آیا لیکن والدین کے دل کو یہ رشتہ اچھا لگا اور انہوں نے حامی بھری۔ احمر شکل و صورت کا

بھی اچھا نہیں تھا، ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر بھی فائز تھا۔

میں بظاہر متنی خوبصورت اور حسین تھی، تقدیر اتنی ہی بدصورت رہی۔ مجھے یاد ہے، کالج لائف کی ابتدا میں ہاتھوں کی لکیروں کا علم جاننے والی ایک لڑکی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔ ”خوبصورت ہاتھوں میں بدصورت لکیر.....“ جسے میں نے سر جھٹک کر نظر انداز کر دیا تھا۔ احمر عورتوں کا رسیا اور پرانا جواری تھا تمام تنخواہ عورت اور جوئے پر خرچ ہو جاتی تھی۔ ساس اپنے بیٹے کے گنوں سے واقف تھیں لہذا ایک مہینے بعد ہی ہمیں الگ کر دیا تھا۔ وہ جب تک ساتھ رہیں، طے دیتی رہیں کہ احمر نے تمہیں کہاں دیکھ کر پسند کیا تھا؟ تم اس سے کہاں ملتی تھیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ خیر، میری گھریلو زندگی بہت مشکل گزری اور اسی دوران پہلے ایک بیٹے کی مایں بنی اور جب میرے دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو جوئے کی رقم کے تنازعے پر احمر کو کسی نے قتل کر دیا۔

اس کے بعد ایک الگ طویل داستان ہے۔ قصہ کو تاہ والدین مجھے دونوں بیٹیوں سمیت اپنے گھر لے آئے۔ والدہ نے میری ہمت بندھائی۔ بچے خود سنبھالے اور میں نے تعلیمی سلسلے کو پھر سے جوڑا اور یوں گریجویشن کر لی پھر میں نوکری کی تلاش میں ماری ماری پھری، نوکری تو نہ ملی، نہ مل گیا۔

ہوا یوں کہ میں اپنے والد کے دوست انکل فہیم کے توسط سے جس پرائیویٹ ادارے میں نوکری کے لیے گئی، اس ادارے کے مالک جاوید مرزا مجھ پر لٹو ہو گئے اور پھر انہی انکل کے توسط سے جاوید مرزا نے میری والدہ کو شادی کا پیغام بھیجا۔ فہیم انکل نے اس رشتے کے حوالے سے یہی بتایا کہ انکل کا بیٹا جاوید مرزا کی فرم میں ملازم ہے۔ جاوید مرزا اچھی شہرت رکھنے والے ایک ہمدرد انسان کے طور پر مشہور

ہے اس سے زیادہ انکل اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

اس رشتے کی بابت جب مجھے علم ہوا تو میں نے والدہ سے صاف انکار کر دیا کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گی میں اپنے چھ اور سات سال کے بیٹوں کو نکاح خود پال لوں گی۔ والدہ نے جاوید مرزا کو صاف انکار کر دیا لیکن جاوید مرزا نے ہماری چوکھٹ نہ چھوڑی اُس نے ہمارے گھر اپنی آمد و رفت جاری رکھی اور ہوشیاری سے بچوں کو اپنے قریب کر لیا۔ بچے اسے دیکھتے ہی انکل انکل کی رٹ لگا دیتے۔ وہ ان کے لیے کھلونے اور دیگر اشیاء لے کر آتا۔ میں اور والدہ جتنی سے منع کرتے تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔

اس دوران والدہ کا انتقال ہو گیا۔ امی نے کہا کہ وہ میرے دونوں بھائیوں کی شادی ایک ساتھ کریں گی اور جب بھائیاں گھر میں آئیں گی تو میں اُن کی آنکھوں میں کھلونے لہذا انہوں نے میرے لیے ایک بار پھر رشتے کی تنگ و دو شروع کر دی۔ اس مرحلے میں میری ایک دوست میرے لیے اپنے انکل کا رشتہ لائی جنہوں نے اولاد نہ ہونے کے سبب بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس رشتے کے حوالے سے جب ہر طرح معاملات طے ہو گئے تب انہوں نے یہ شرط رکھی کہ میرے بچے میری والدہ پالیں گی البتہ خرچہ وہ اٹھائیں گے۔ میں بچوں سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی لہذا یہ بات ختم ہو گئی۔ اس صورت حال کا جب جاوید مرزا کو علم ہوا تب اس نے امی سے میرا ہاتھ دوبارہ مانگا اور کہا کہ ”مجھے آپ کی بیٹی بھاگنی ہے مجھے اس کے بچوں پر ترس آتا ہے کہ وہ بہن باپ کے یتیم ہیں۔“ وہ والدہ کے دل میں جگہ بنائی چکا تھا مگر خدا جانے کیوں مجھے نہیں بھاتا تھا حالانکہ ہمیشہ انتہا کی شرافت کا مظاہرہ کرتا تھا۔

امی نے اس رشتے کے لیے مجھے زبردستی راضی کر دیا کہ ”وہ تمہیں پسند کرتا ہے پھولوں میں رکھے گا تمہارے بچوں کو باپ کا پیار بھی دے گا۔“ میرا نکاح بہت سادگی سے ہوا۔ ہم دونوں جاتے ہی جاوید مرزا نے تہائی میں یہ کہہ کر امی ششدر کر دیا کہ فی الحال میں امی کے پاس رہوں گی وہ گھر کا بندوبست کر کے مجھے رخصت کرے گا۔

امی بھونچکی اسے تک رہی تھیں کہ اس نے نکاح سے قبل ہمیں ایسی کوئی شرط نہیں بتائی تھی۔ امی استفسار پر وہ بولا۔ ”میں نے آپ کو پہلے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میری والدہ رشتے کے لیے تیار نہ تھیں۔ خیر میں موقع ملنے ہی انہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

ہمارے حلق میں چھوٹے بچے پکی تھی لہذا انکو اور لنگھا دونوں ناممکن تھے۔ امی کو چپ سادھ بن پڑی۔ میں اب ماں ہی کے گھر رہنے لگی اور کڑھتی رہی کہ جب ہمیں رہنا تھا تب گلے میں اس ڈھول کو لٹکانے کی کیا تنگ تھی؟ اور پھر آہستہ آہستہ اُس نے چولا بدلا اور میرے بیٹوں سے اس کا رویہ بدلنے لگا۔ وہ کھانے پینے کا بہت شوقین تھا، بھر بھر کے چیزیں لاتا اور دن رات مجھ سے پکوانا امی لاکھ منع کرتیں ایک نہ سنتا اور پھر ایسی ہی زندگی دوران میں جب میں اس کی بیٹی کی ماں بنی تو ایک رات اچانک وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں جا کر یہ عقدہ کھلا کہ اُس گھر میں اس کی بیوی اور چار بچے پہلے سے ہی موجود ہیں۔ میں بہت روٹی پھینک کر رونے سے حالات بدلنے لگے میں نے میرے حالات بدلے۔

اپنے گھر لا کر تو وہ مجھ سے بالکل لاپرواہ ہو گیا تھا۔ دن رات اپنی بیوی کے چوچلوں میں

منانے میں لگا رہتا۔ مجھ پر ایک نئی افتاد یہ آئی کہ ساس اور سوت دونوں مل کر مجھ سے لڑتیں۔ دیتیں ذلیل کرتیں باقاعدہ مجھے بازاری کرت کہا جاتا کہ میں نے ان کا شوہر اور بیٹا چھینا۔ میں رات دن اپنے حالات کی درنگی کے لیے دُعا میں کرتی، کڑھتی اور سوچتی کہ جاوید مرزا نے بس میرے حسن سے شادی کی تھی، مجھ سے نہیں۔

اُس گھر میں میری وجہ سے جاوید مرزا اور اس کی بیوی میں لڑائی جھگڑے روز کا معمول تھے وہ روٹھ کر کہنے لگتی تب یہ اسے منالیتا، اس کی جھوٹی چچی باتوں پر مجھے دھنک کے رکھ دیتا۔ ہمارے ہاں تو امی کسی مرد نے بیوی کو گالی تنک نہ دی تھی یہاں یہ لڑائی گالیوں کے ساتھ مار مار کر میرا جسم اوجھڑ دیتا۔ میں شرم میں یہ سب ماں سے چھپاتی رہی اور پھر امی کی شکایتوں سے تنگ آ کر اس نے میرے دونوں بچوں کو میری ماں کے حوالے کر دیا کہ ہم انہیں لیں رکھ سکتے۔ وہ بچوں پر ظلم بھی بہت کرتا تھا لہذا میں نے انہیں پالنے کی حامی بھر لی۔ اب میں سوچتی کہ اس دعا باز سے تو وہ صاف کو شخص اچھا تھا جس نے مل کر کہہ دیا تھا کہ بچے والدہ پالیں خرچہ میں

اُدھر میرے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ماں کو میرے بچے کھلتے تھے۔ میری ماں نے بہت مشکل سے اُن دونوں کی پرورش کی تھی۔ اور جاوید مرزا سے مجھے دو لڑکیاں ہوئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے کمال ہوشیاری میرے بیٹوں کو اپنی بیٹیوں سے جو مجھ سے ہوئی تھیں دور رکھا۔ اس نے اس بات کو پسند کر لیا کہ میرے بچے مجھ سے ملنے اس کے گھر آئیں۔ میں ہی کبھی کبھار امی کے گھر جا کر اُن سے

دکھ

دکھ تو چھپا کر رکھنے کے لیے ہوتے ہیں مقدس مہینوں کی طرح مقدس عبادتوں کی طرح دل کے سب سے اونچے طاق پر کہ کوئی بھی دیکھ نہ سکے کوئی محسوس بھی نہ کر سکے یہاں تک کہ اپنی آنکھ بھی

اجالا عادل

مل لیتی تھی۔

آئے دن کی سوت کی شکایتیں ساس کے طعنے، شوہر کا رویہ، بچوں سے دوری نے مجھے نیم دیوانہ کر دیا تھا بس اب تو گھر تھا، گھر کے سارے کام اور وہاں رہنے والوں کی دن رات خدمت میری حالت دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ میں ایک بڑھی لکھی لڑکی ہوں اچھی خاصی ماسیوں سے مشابہ ہوئی تھی۔ اسی طرح زندگی بسر کرتے وقت کافی آگے کو سرکا۔ سوت کے لڑکے جوان ہو گئے تھے اب مکمل طور پر گھر پر اُس کا راج اور قبضہ تھا شوہر اور ساس دونوں کی بائیں اب مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھیں۔ ساس خود ایک امیر عورت تھیں ان کی کافی جائیداد روپیہ پیسہ تھا وہ مجھے حقارت سے دیکھ کر منہ موڑ لیتیں۔ سوت جس طرح چابی بھرتی وہ اُسی کے اشاروں پر ناچتیں مجھے کہتیں۔ ”تم نے میرے بیٹے کو اپنی اداؤں سے قابو کیا ہے تم ایک بد کردار عورت ہو۔“

میری سوت کے تین بیٹے کمار ہے تھے اس نے ان کا پیسہ خرچ کرنے کے بجائے بینک میں ڈالنا شروع کیا تھا۔ وہ گھر کے خرچے میں ان کی ایک پائی بھی خرچ نہیں کرتی تھی اور پھر اچانک اسی بات پر ایک روز شوہر اور سوت میں گھمسان کا رن پڑا۔

سید ابو محمد آزاد

تقدیر کے سحر

رہنمائی کا خیال

گھونسلے کے قریب اک چڑیا
سوچ میں ہے، یہ کیا ہوا سب کچھ

تقدیر کے سامنے انسان کچھ نہیں، اس خیال کو جاگر کرتی ایک منفرد کہانی

رفاقت حسین پولیس کمشنر ہونے کے باوجود اپنی ذات میں بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ صوم و صلوة کے پابند اور جسم حسن اخلاق تھے البتہ مجرموں کے لیے فواد سے زیادہ سخت تھے بالکل اسی طرح جیسے اقبال نے فرمایا۔
ہو حلقہ یاران تو یہ ریشم کی طرح نرم

’دارالامان‘ نامی کوٹھی پنڈہ شہر کی بہت مشہور کوٹھی تھی۔ اس کی کشادگی اور خوبصورتی تو اپنی جگہ اس کے ملین بھی بہت ملنسار انسان پرور لوگ تھے۔ محکمہ پولیس کے لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا عام پران کے متعلق یہ تاثر ہے کہ پولیس والے بہت ظالم اور راشی ہوتے ہیں لیکن مذکورہ کوٹھی کے مالک

ساس اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی تھیں۔ انہیں میرے بدلے لینے کا خوف تھا کہ اب وہ مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہوں گی لیکن بیٹی انہیں کب تک سنبھالتی سمجھا بھجا کر میرے پاس بھیج دیا۔ وہ مکمل معذور تھیں نہ چل سکتی تھیں نہ پھر سکتی تھیں انہوں نے بستر ہی کو اپنا گھر بنا لیا۔ اب جب میری خدمت کی انہیں قدر ہوئی، تب اُن کا رویہ میرے ساتھ اچھا ہو گیا یا شاید یہ موقع شناسی تھی۔ اس دوران میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے دونوں بیٹے جوان ہوئے بہت اچھے روزگار سے وابستہ ہونے کے بعد وہیں میرے بھائیوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔

.....

آج میری ساس کی تین لڑکیوں اور دو مادوں کا انتقال ہو چکا ہے مگر ساس کی روح اپنے جسم کو چھوڑنے کو تیار نہیں، ہڈیوں کا ڈانچہ بن چکی ہیں۔ ساس کو دی بددعا کا آج میں خود جھیل رہی ہوں، یہ اتنی ضعیف ہو چکی ہیں اور زندہ ہیں۔ ان کی طویل زندگی کے سبب میں اپنی زندگی سے بے زار اور عاجز آ چکی ہوں دوسری طرف جاوید مرزا بھی بیماریوں کی پوٹلی بن چکے ہیں جبکہ میرے دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں اور کچھ عین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جاوید مرزا کو چھوڑ کر ان کے پاس آ جاؤں مگر میں سوچتی ہوں، ساس اور سر کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی بھی شادی کر دی ہے۔ وہ اپنے بھائیوں سے ملتی ہیں۔ بہر حال اب میں دو بیماریوں کی تیارواری کرتے کرتے زندگی کی بازی ہارنے چلی ہوں۔ قارئین سے اتنا س ہے کہ وہ میرے لیے صبر جمین اور سکون کی دعا کریں خواہ وہ مجھے مرنے کے بعد ہی کیوں نہ نصیب ہو۔



جاوید مرزا نے حسب عادت پہلی بیوی کو مارنا شروع کیا۔ ابھی یہ مار پیٹ شروع ہی ہوئی تھی کہ سوت کے جوان لڑکوں نے باپ کو دھنک کے رکھ دیا۔ جاوید مرزا نے ایک طلاق دے کر سوت کو بچوں سمیت گھر سے نکال دیا۔ یہ ساری صورت حال دیکھ کر ساس صاحبہ نے حسب عادت فوراً ہی مجھے کوٹنے دینے کہ ”خدا کرے تو مرنے جائے.....“ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میرے منہ سے نکلا۔

”آمین.....! آمین! خدا کرے میں تو مر جاؤں اور آپ کے سب مر جائیں مگر آپ زندہ رہیں اور موت کو ترس جائیں موت مانگیں اور موت آپ کو نہ آئے.....“

میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر ہوا یوں کہ ساس کو سننے دیتی ہوئی جوں ہی پلٹیں تھیں اور کر پڑیں اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھیں۔ اسپتال لے کے گئے ٹانگ کا آپریشن ہوا، راڈ بڑی لیکن یہ صورت حال وقت کے ساتھ ساتھ بگڑتی ہی گئی اور ساس کا حال خراب سے خراب ہوتا گیا۔

جاوید مرزا سوت کو نکال کر بہت پریشان ہو گئے تھے وہ اُن کی بیوی اور جوان بیٹیوں کی ماں تھیں۔ اب انہیں بلانا چاہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کچھ دن میکے میں رہنے کے بعد انہوں نے کرائے پر گھر لے لیا۔ اب بھلا وہ اس سائیکو کے پاس کیوں آتیں؟ اب وہ گھومنے پھرنے، ملنے ملانے، کھانے پینے، خرچ کرنے میں آزاد تھیں ورنہ تو جاوید مرزا ہم دونوں بیویوں کو ہمارے ماں باپ، بہن بھائیوں تک سے نہیں ملنے دیتے تھے مگر اب تو سوت بھی میکے میں ہوتیں، ابھی میکے اُن کے گھر جاوید مرزا نے میرے دو لڑکے چھڑوائے قدرت نے اس کے چار لڑکے چھڑوا دیئے۔ میری

رزم حق و باطل ہو تو فواد ہے مومن
رفاقت حسین صاحب کی کوٹھی نام کی طرح واقعی
دارالامان تھی۔ جس وقت، جس گھڑی بھی کوئی سائل
اس کے دروازے کو کھٹکھٹاتا، اس کی ضرورت پوری
ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کی ضرورتیں بغیر لیت
وصل کے پوری کی جاتی تھیں۔ رفاقت صاحب نے
خدمت خلق کے کاموں کو انجام دینے کے لیے گھر
کے لوگوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ کوئی سائل نامراد
واپس نہ جاتا تھا۔ انہوں نے سینکڑوں نادار
محتاج غریبوں کے لیے مالی وظائف مقرر کیے تھے اور
نہ جانے بندھنوں سے کتنے حاجت مندوں کی
حاجتیں پوری کی جاتی تھیں۔ رفاقت صاحب کی
اولاد میں دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی مہوش
اور چھوٹی کا نام رخشنہ تھا۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے
گھر کی ہو چکی تھیں۔ ایک بیٹا نیر حسین بنک میں افسر
تھا۔ چھوٹا بیٹا ریاضت حسین MBA کر رہا تھا۔ یوں
زندگی کا کاررواں رواں دواں تھا۔ دونوں بیٹوں کی
تربیت بہت اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔

ایک رات رفاقت حسین ایسے سوئے کہ پھر نہیں
اٹھے۔ صبح اُن کے جاگنے میں دیر ہوئی تو بیگم نے
سوچا، گزشتہ رات دیر سے سونے کی وجہ سے اُن کی
نیند پوری نہیں ہو رہی ہے۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو
بیگم رفاقت نے انہیں جگایا لیکن اُن کی رُوح اپنے
خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔

رفاقت صاحب کی اچانک موت کی خبر پر ہر
آنکھ اٹھکارتھی۔ کچھ ہی دیر میں کوٹھی دارالامان اُن
کے چاہنے والوں سے بھر گئی۔ رفاقت صاحب کی
موت پر بہت سے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے
تھے تو کچھ آپس میں اُن کی نیکیوں کا تذکرہ کرتے
ہوئے سسکیاں بھر رہے تھے۔ آہ و فغاں کا یہ منظر
اس یقین کی تقویت کے لیے کافی تھا کہ وہ جو

اس دار فانی سے گزرے تقریباً ایک سال ہو گا

دارالامان کوٹھی کے تمام معاملات حسب سابق چل
رہے تھے۔ بیگم رفاقت اپنے بڑے بیٹے نیر کے سر پر
سہرا سجانا چاہتی تھیں۔ بہنوں نے لڑکیاں دیکھیں
شروع کر دی تھیں۔ آخر ماں بہنوں کو ایک مناسب
لڑکی مل گئی مگر جب انہوں نے نیر سے شادی کی بات
کی تو اس نے ”بھی نہیں“ کہہ کر ماں بہنوں کے
ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ
بڑے بیٹے نیر میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس کا بیشتر
وقت باہر گزرتا تھا۔ وہ ہفتوں اپنی امی کو شکل نہیں
دیکھتا تھا۔ اس نے اپنے والدین کی دولت کو بہت
پرہیزی سے اڑانا شروع کر دیا، دولت کو اپنے قبضے میں
کرنے کے لیے اس نے اپنی کمپنی کے مینیجر اور
ہائیداد کے گماشتہ ہری چند لال کو اپنی مٹی میں کر لیا
تھا۔ رفاقت صاحب کی موت کے بعد کچھ عرصے تک
کمپنی کے مینیجر جانیفاد اور کمپنی کی آمدنی و اخراجات
کا حساب کتاب بیگم رفاقت کو دکھایا کرتے تھے اور
پھر رفاقت بند آگھوں اُن پر بھروسہ کرتی تھیں لہذا وہ
اس طرح نیر کے کہنے پر ہر قسم کے بنک اور جانیفاد
کے کاغذات پر بھی دستخط کرتی رہیں۔

ایک روز اتفاق سے ریاضت کا نیر بھائی کے
ساتھ جانا ہوا تو یہ جان کر اسے حیرانگی ہوئی کہ نیر نے
مکمل والوں کو بتائے دو ماہ پہلے ملازمت سے استعفی
دے دیا ہے۔ اس خبر سے گھر کے لوگ تذبذب کا
شکار ہو گئے۔ جب نیر سے اس حوالے سے دریافت
کی گئی تو وہ کہنے لگا کہ اب بنک کی ملازمت کی کوئی
ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا
تھا۔ امی کے اس کاروبار میں بہت فائدہ ہے۔
میں نے تین کوٹھیوں کا سودا چل رہا ہے یہ ایک کروڑ
روپے کی کوٹھیاں ہیں جو مقدمہ بازی میں الجھ کر
لازی کو محتاج ہو گیا ہے۔ اسے پیسے کی اشد

خواب

اک خواب تھا دیکھا میں نے
جہاں سب کچھ میرے مطابق تھا
لیکن جب آنکھ کھلی تو
در کے سوا کچھ نہ تھا
یہ خواب کبھی حقیقت نہیں ہوتے
ان کے ٹوٹنے ہی
ان کی کرچیاں
دل کو بڑھ بڑھ کر دیتی ہیں

صائمہ محرم

ضرورت ہے اسی لیے وہ اپنی تین کوٹھیاں انتہائی
ستے داموں فروخت کر رہا ہے۔ اس کے تین کروڑ
مانگ رہا ہے لیکن میرا سودا دو کروڑ پچاس لاکھ میں ہو
گیا ہے۔ اس کا ایڈوائس بھی میں دے چا ہوں۔
امی! آپ ان جنکس پر دستخط کر دیں، یہ تین
چیک دو کروڑ پچاس لاکھ کے ہیں۔ بیٹے کی باتیں سن
کر چند لمحے بیگم رفاقت تذبذب میں رہیں، تاہم
انہیں اپنی تربیت پر یقین تھا کہ نیر کسی غلط کام میں ان
کی دولت کو نہیں لٹائے گا لہذا انہوں نے چیک پر
دستخط کر دیے۔ اتنا بڑا چیک پارک نیر خوش خوش چلا گیا
اور بیگم رفاقت نظرات میں ڈوب گئیں طرح طرح
کے دوسو سے انہیں پریشان کرنے لگے۔ اسی وقت
اُن کی چھوٹی بیٹی رخشنہ آگئی تھی۔ وہ اکثر امی سے
لنے آتی رہتی تھی مگر آج جب اس نے اپنی ماں کو
فکر مند دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ دریافت کرنے پر
ماں نے نیر کے حوالے سے تمام باتیں اسے بتا دیں
جنہیں سن کر وہ بھی ترو کا شکار ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی
باتوں میں مصروف تھیں کہ چھوٹا بیٹا ریاضت خوش
خوش گھر میں داخل ہوا اور ماں بہن کو یہ خوش خبری

سنائی کہ وہ ایم بی اے میں پاس ہو گیا ہے۔ یہ خوش خبری سن کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔ امی نے اس کی پیشانی چومی اور مبارکباد دی۔
”اللہ نے میری دعائیں قبول کر لیں۔“
”بھائی! آگے کا کیا پروگرام ہے؟“ رخشندہ نے پوچھا۔

”مزید آگے پڑھنے کے لیے امریکہ جاؤں گا۔“ ریاضت نے کہا۔
”بیٹا!.....! جو منہ میں آیا وہ کہہ دیا، یہ نہیں سوچا تمہارے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا؟ تمہارے سوا میرے پاس کون ہے یہاں؟“ امی نے ناراضگی سے کہا۔

”لیکن امی!.....! یہاں کی ڈگری اور امریکہ کی ڈگری میں بہت فرق ہے وہاں کے ڈگری ہولڈر کو یہاں ترجیح دی جاتی ہے اور پھر میں امریکہ سے آ کر پاپا کے انسان دوستی مشن کو آگے بڑھاؤں گا انشاء اللہ! اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے میں پاپا کے نام پر چیریٹی ہسپتال قائم کروں گا جہاں مفت علاج ہوگا۔ آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے میں آپ کو اور پاپا کی روح کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ میری دعا ہے کہ باری تعالیٰ مجھ کو پاپا کے نقش قدم پر چلائے۔“ بیٹے کی پر عزم باتیں سن کر بیگم رفاقت مسکرائیں۔

نیر جب سے پیکس پر دستخط کروا کر لے گئے تھے تب سے اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اسے گئے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو گئے تھے اس کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کی امی بہت پریشان تھیں۔ ریاضت حسین امریکی ویزے کے حصول کی تک دو دو میں لگا ہوا تھا۔ اس کی سخت رنگ لائی امریکن وظیفہ پا کر وہ خوشی خوشی اپنے پاپا کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد دعاؤں کے لیے جب اس کے ہاتھ اٹھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ امریکہ روانگی

کے لیے ریاضت کے پاس صرف سولہ دن تھے، ان سولہ دنوں میں امریکن انٹیلیجنسی سے ضروری کاغذات کا حصول دیگر دستاویز کا متعلقہ اداروں سے حاصل کرنا اپنی ضرورت کے لیے چیزوں کا خریدنا وغیرہ یہ تمام کام کرنے تھے۔ بہر حال اس کے تمام کام نمٹ گئے اور اس کی روانگی کا وقت آ گیا۔ روانگی والے دن اس کی دونوں بہنیں مہوش اور رخشندہ اور ان کے میاں بھی ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ بہنوں کو تو خوشی تھی کہ ان کا بھائی بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے جا رہا ہے مگر امی بہت افسردہ تھیں اور پھر وہ سب کو اداس چھوڑ کر امریکہ روانہ ہو گیا۔ ریاضت کے امریکہ جانے کے بعد بیگم رفاقت بڑے بیٹے نیر محمود کی بہت یاد آئے لگی تھی۔ پتہ نہیں یہ نیر کی امی کو کس ذریعے سے ملی کہ نیر کا کاروبار اتنا پھیل گیا ہے کہ اسے پٹنہ سے بمبئی میں رہائش اختیار کرنی پڑی ہے۔ اس خبر سے نیر کی امی کے دل میں طرح طرح کے دوسے پیدا ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی کو لوگ ادبائش کی جگہ سمجھتے تھے۔ جوانی کی تسکین کے لیے بمبئی جنت سمجھا جاتا تھا۔ نو جوانوں کے دل کی نیکار بمبئی تھا۔

ایک روز گھر کی گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ نیر کے دوست روبن گھوش باپو آئے ہیں۔ روبن گھوش ایک مدت کے بعد آئے تھے۔

بیگم رفاقت سے مل کر انہوں نے کہا۔ ”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، مجھے آپ کے پاس بہت پرانا چاہیہ تھا مگر آنے میں دیر ہوئی۔ میرا تبادلہ پٹنہ سے کرنا تک ہو گیا ہے آج تقریباً ایک سال سے وہاں ہوں۔ میں دفتر کے کاموں کی غرض سے چلا ہوں۔ پہلے بمبئی گیا ہوا تھا اتفاق سے نیر سے ملاقات ہوئی وہ اپنے دفتر لے گیا۔ آپ جانتی ہیں، ہم دونوں کے دوست ہیں، ہم ایک دوسرے سے بلا تکلف

ماضی اور حال کو شیئر کرتے ہیں۔ آئی.....! اس سے دوران گفتگو مجھے پتہ چلا کہ وہ پٹنہ ہی میں بمبئی کے فلمی ٹھکوں کے دھوکے میں آ گیا تھا ان کے سنبھلے خواب میں آ کر وہ اپنی تین لکھیاں جو پٹنہ اور گیا میں خریدی تھیں ان کو بیچ کر بغیر کسی کو اطلاع کر کے اس نے بمبئی میں رہائش اختیار کر لی۔ فلمی ٹھکوں نے اسے فلم انڈسٹری کو سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار کا لالچ دکھا کر اسے فلم پر پیسہ لگانے پر اکسایا۔ نیر فلمی ٹھکوں کے چکر سے آٹا شاتھا اسے کروڑوں روپے منافع کمانے کے نام پر ٹھکوں نے لوٹ لیا، اس نے دو فلموں پر پیسہ لگایا اور دونوں بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ اس ناکامی سے وہ کنگال ہو گیا، وہ جو شہد کی کھیلوں کی طرح نیر کے ارد گرد بھجھکتا پھرتے تھے اب وہ اس سے دور ہو گئے۔ اب وہ تھا اور اس کی تنہائی تھی، ایسے میں اس کو کسی غم گسار کی ضرورت تھی، اس نے شراب کا سہارا لیا اور اس میں اس طرح غرق ہوا کہ اس کی زندگی شراب کی تالیخ ہو گئی۔ ایک فلمی ہیروئن جو نیر محمود پر جان چھڑتی تھی وہ ایسے موقع پر اس کا سہارا بنی، اس ہیروئن کے توسط سے ان دونوں وہ دو کمرے کے قلیٹ میں رہتا ہے۔ مالک مکان اس کے ماضی کی پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے کرایہ نہیں لیتا ہے۔ میں دو ماہ کی چھٹی پر گھر یعنی پٹنہ آ رہا تھا میں نے بہت کوشش کی، نیر محمود ہمارے ساتھ چلے۔ میرے اصرار پر وہ روتا رہا لیکن شرمندگی کے باعث آنے پر راضی نہ ہوا۔“

بیگم رفاقت مورت بنی خاموشی سے اس کی ساری باتوں کو سنتی رہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

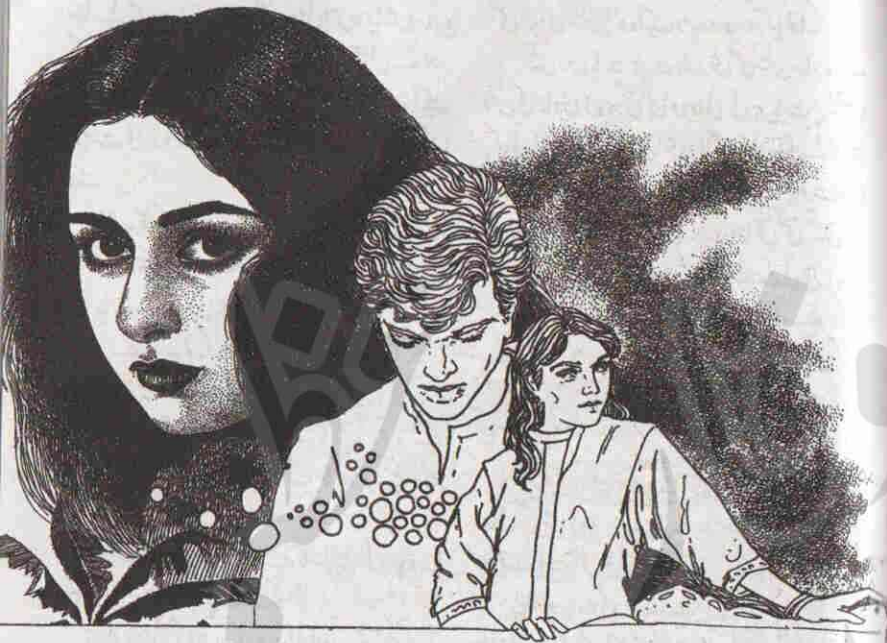
”تو کیا نیر مجھ سے نہیں ملے گا؟“ انہوں نے کہنے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، نہیں آپ پریشان نہ ہوں، بھگوان کی

کرپا سے، وہ بہت جلد آپ سے ملے گا۔“ روبن گھوش نے انہیں تسلی دی اور چلا گیا۔ بیٹے کے بارے میں یہ باتیں سن کر بیگم رفاقت انتہائی پریشان ہو گئی تھیں۔ وہ اسی غم میں مبتلا تھیں کہ ایک دن بیٹے کی میت دیکھ کر ماں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نیر کی میت کے ساتھ سلیمان فاروقی نام کے ایک شخص آئے ہوئے تھے ان کے مطابق روبن گھوش نے ان کو پابند کیا تھا کہ ہر صورت میں نیر صاحب کو لے کر میں پٹنہ پہنچوں۔ بمشکل تمام نیر آنے کے لیے تیار ہوا۔ بمبئی میں اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ تھی راستے میں سینے میں درد اٹھا اور آٹا شاتھا اس کی روح خالق حقیقی سے جا ملی۔

نیر کی موت کی خبر سن کر کچھ ہی دیر میں دارالامان کو کسی غم گساروں اور چاہنے والوں سے بھر گئی۔ چھوٹا بھائی ریاضت حسین چونکہ حال ہی میں امریکہ گیا تھا لہذا گھر والوں نے اسے نیر کی موت کی خبر دینا مناسب نہ سمجھا۔ تجھیر و گھٹن کے لیے میت کو گھر میں لایا گیا تو بیگم رفاقت اور مہوش پریشانی طاری ہو رہی تھی۔ ہر دل اداس ہوا، ناکہ ناک تھی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رورہے تھے اور پھر لوگ نیر کی میت کو کاندھے پر اٹھائے آخری منزل کی طرف لے گئے۔

اس واقعے کو برسوں بیت گئے ہیں۔ بیگم رفاقت کے چھوٹے بیٹے نے امریکہ سے آ کر حسب خواہش اپنے باپ کے مشن کو آگے بڑھایا اور ماں باپ کا نام روشن کیا ہے۔ ماں اُسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہے لیکن بیگم رفاقت آج تک یہ نہیں سمجھ پائیں کہ ان کی تربیت میں آخر ایسی کیا کی رہ گئی تھی کہ ان کا بڑا بیٹا اندھی راہوں کا مسافر بن گیا؟ مگر شاید انہیں اور اک نہیں قدرت کے اپنے کام ہوتے ہیں جو اسی طرح انجام پاتے ہیں جیسا قدرت چاہتی ہے۔ انسان تو بے بس ہوتا ہے۔



اجالا عادل

سولی اعتبار کی

داغ کا خیال

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ایک شگفتہ کلی کی کہانی وہ اعتبار کے ہاتھوں مرجھا گئی تھی

ہیں؟

”دانی.....؟ مگر میں کسی دانی کو نہیں جانتی؟“ یہ کہہ کر سارہ نے اپنے دماغ پر زور ڈالا تھا۔
”شاید کوئی سبیلی کا بھائی ہو یا پھر پرانی والی جاب کا کوئی گروہ مجھے کیوں کال کرے گا؟“
”آپ کی میں نے بہت تعریف سنی ہے پلیز“
مجھ سے دوستی کر لیجیے۔“

”What.....؟“ یہ بات سن کر تو سارہ اچھل ہی پڑی تھی۔ ”میں آپ کو نہیں جانتی۔“ یہ کہہ کر اس نے کال ہی منقطع نہیں کر دی تھی بلکہ موبائل بھی off کر دیا تھا۔ اس کا موڈ خراب جو ہو گیا تھا۔

اس کے بعد تو اس سوکا لند دانی کی کال روز ہی آنے لگی تھی۔ سارہ نے بہت avoid کرنا چاہا تھا مگر غصے اور ناراضی کا اظہار کرتے کرتے جانے کب اور کیسے اس کی دانی سے دوستی ہو گئی تھی حالانکہ یوں کسی اجنبی پر بھروسہ کرنا اُس کی فطرت نہیں تھی مگر شاید اس کا سبب اُس کی تنہائی ہو۔ اماں پانچ سال

بارش کی بوندیں ہو لے ہو لے جھروکے سے ٹکرا کر جلت رنگ کی صورت بن رہی تھیں۔ اس بھیگی رات کافسوں چار سو پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں سبیلی مٹی کی مہک تھی۔ اس ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سارہ اپنی پسندیدہ کتاب کے مطالعے میں غرق تھی۔ اس کے قریب ہی کافی کا وہ گم موجود تھا جو ذرا دیر پہلے پایا رکھ کے گئے تھے کہ اچانک اس کے موبائل کی مخصوص دھن کمرے میں گونجی تھی۔

”اس وقت کون ہے؟“ سارہ نے پہلے سوچا اور پھر حیرت سے اس اجنبی نمبر کو دیکھا تھا۔ ”ہو سکتا ہے کسی عزیز واقف کا یا پھر سبیلی نے sim بدل لی ہو؟“

سارہ کا دل سادہ سا تھا، دنیا کی کثافت نے ابھی اسے چھوا نہیں تھا۔ اس نے کال اینڈ کر لی تھی۔

”میں دانی ہوں، آپ سارہ بول رہی

پہلے گزر چکی تھیں۔ بابا اپنی ملازمت میں مصروف تھے۔ وہ دوستیوں کی زیادہ قائل نہیں تھی، دو قرہی سہیلیاں تھیں ان میں سے ایک اپنی نئی شادی شدہ زندگی میں گمن تھی اور دوسری جو ابھی شادی سے بچی ہوئی تھی، اس کی گھریلو ذمے داریاں اور دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں جبکہ وہ خود اپنا گھر اور علاقہ تبدیل کرنے کی وجہ سے اپنی ایک اسکول والی نوکری سے فارغ تھی۔

سارہ کی دانی سے یہ موبائل والی دوستی بہت بڑھی لیکن وہ دانی کے باوجود لاکھ اصرار کئے، اس سے کہیں باہر نہیں ملی تھی۔ دانی کی جاب بقول اس کے ناروے میں تھی۔ وہ تین ماہ کی چھٹیوں پر آیا تھا، گویا مسافر تھا۔ جاتے وقت بھی اس نے ملنے کے لیے بہت اصرار کیا تھا مگر سارہ کا انکار اقرار میں نہ بدلا تھا

سودانی نے جاتے جاتے شکوہ کیا تھا۔ ”تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔“ اور پھر وقت نے گویا پیروں پر پنکھ باندھ لیے تھے۔
دانی کو گئے کئی ماہ ہو گئے تھے مگر اس کی یاد نے سارہ کے دل کو چھوڑا نہیں تھا۔ کبھی بھی وہ افسوس کے ساتھ سوچتی کہ مجھے اس سے ملنا چاہیے تھا۔ آخر میں ڈر کیوں گئی تھی؟ اپنی سبیلی کو لے کر چلی جانی۔ آخر ریسٹورنٹ میں ہی تو ملنا تھا اور پھر جب وقت کے ساتھ سارہ کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ دانی کی یاد اس کے دل کا دامن کی صورت بھی چھوڑنے والی نہیں ہے تو پھر اس نے دانی کے بتائے E-mail ایڈریس پر ایک Mail کر ڈالی تھی۔ دل میں یہ پشیمانی تھی کہ میں نے اُس کا دل توڑا ہے۔ (لڑکیاں چاہے کتنی پڑھی لکھی کیوں نہ ہوں، ہولی نادان ہیں۔)

گڈی آپا

ریت کا محل

حیران کا خیال

یہ کون عین زندگی میں حرف شام لکھ گیا
ہم اپنے ہاتھ دے چکے تھے راستوں کے ہاتھ میں

گل کو شرماتی ایک گنار کا احوال جو راجہ محبت میں نامراد رہی تھی

فرحت بخش رہے تھے۔ بال پیچھے جھلکتے ہوئے اس کی نظر سامنے والے فلیٹ کی طرف اٹھی تو اٹھی رہ گئی ایک خور و نو جوان مسکراتا ہوا اسے ہی تک رہا تھا۔ گنار کو غصہ آ گیا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ اگلے روز بھی وہ اسی وقت اسی جگہ کھڑا

گنار نہا کر گناری کپڑوں میں ملبوس غسل خانے سے باہر نکلی اور بال سکھانے کے لیے بال کوٹنی میں آکھڑی ہوئی۔ بالی پٹکی دھوپ میں وہ اپنے خیالوں میں کم بالوں میں گنگھی کرنے میں مصروف ہوئی۔ بالکٹی سے سمندر کی شور مچانی لہروں کا نظارہ انتہائی دلکش تھا اور تیز سمندری ہوا کے جھونکے اسے



ہوں لیکن اگر انتظار کرنے میں کوئی پرابلم ہے تو کہیں بھی شادی کرلو۔“ وہ ایک دم rude ہو گیا تھا۔ تین دن بات چیت بند رہی تھی لیکن سارہ جیسے اس کی عادی سی ہو گئی تھی وہ دانی کی ہر بات پر یقین کرتی، یقین کا یہ سفر چلتا ہی چلا گیا تھا۔ پاپا نے بہت چاہا لیکن وہ شادی کے لیے کسی صورت تیار نہ ہوئی تھی۔ سارہ کو ایسی لڑکیاں بہت متاثر کرتی تھیں جو محبت کی اور سے اور شادی کسی اور سے کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ رشتے والوں نے سارہ نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا چھوڑ دیا اور پھر بابا بھی گزر گئے۔ اب کالج کی ملازمت ہی سارہ کی زندگی کا حاصل تھی۔

پھر ایک دن سارہ کی عزیز ترین سہیلی لینا کے بھائی کی شادی پر سب پرانے دوست اکٹھے ہوئے تو وہ عجب بات کھل گئی تھی۔

لینا جو سارہ کی سب سے پکی اور رازدار سہیلی تھی دانی اس کے شوہر کا خالہ زاد تھا۔ لینا نے ہی اسے سارہ کا نمبر دیا تھا۔ سارہ کو بہت زبردست شاک لگا تھا پھر اسے یاد آیا تھا کہ لینا سے اس کی ایک بار غیر لڑکوں سے موبائل اور نیٹ وغیرہ پر دوستی کے حوالے سے بحث ہوئی تھی اور اس نے ایسی دوستیوں کی شدید مخالفت کرتے ہوئے لینا کو اس کے ایک موبائل فرینڈ کے حوالے سے بہت کچھ کہہ دیا تھا تو گویا اس کی عزیز ترین دوست نے اسے نیچا دکھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا اور پھر سارہ کو دکھ اور اذیت کا ایک مزید جھٹکا اس وقت لگا تھا جب لینا نے ہنستے ہوئے اس بات کا بھی انکشاف کیا تھا کہ دانی تو ناروے میں ایک طویل عرصے سے شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے۔ یہ سب جان کر سارہ کی آنکھوں میں بس بے بسی کے آنسو ہی تھے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ تو اعتبار کی سولی پر چڑھ چکی ہے۔

Mail آنے اور جانے لگی دوستی اب پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ دانی اس دنیا میں سارہ کی طرح اکیلا تھا۔ بچپن میں ماں کے انتقال کے بعد چچا نے پرورش کی تھی اور وہ پڑھ لکھ کر اپنے ایک دوست کی مدد سے جاب کے لیے ناروے چلا گیا تھا۔

اس کا کہنا تھا۔ ”میں خود کو یہاں بہت اکیلا محسوس کرتا ہوں، بہت دن اور رات کام کرتا ہوں دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو میرا خیال کرنے مجھ سے پیار کرے۔“ یہ کہہ کر وہ فون پر معنی خیز انداز میں ہنستا تھا۔

”اچھا تو پھر کب آنے کا پروگرام ہے پاکستان؟“ سارہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ شرمیلے لہجے میں پوچھتی۔

”اب تو جلد ہی آنا پڑے گا، بہت دل چاہ رہا ہے کسی سے ملنے اور اپنا بنانا کو۔“

سارہ دانی کی ہر بات پر ایمان لے آئی تھی۔ اب بس اسے دانی کی آمد کا انتظار تھا۔

”کیا آپ دسمبر میں آئیں گے کرمس کی چھٹیوں پر؟“ سارہ آس کے دیپ جلا کر پوچھتی۔

”ارے بھئی، ایک گھر خریدا ہے، اسے renovate کر رہا ہوں یہاں labour نہیں ملتی، سب کچھ خود کرنا پڑتا ہے۔ wall paper لگانا، رنگ کرنا اور باقی کے کام خود ہی کرنا ہوتے ہیں۔ مجھے پاکستان آنے میں ٹائم لگے گا۔“

ٹائم بڑھتا اور بدلتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن سارہ نے کچھ ناراضی سے پوچھا۔ ”آخر میں کب تک انتظار کروں؟“

”دیکھو تمہاری مرضی ہے، تم اگر انتظار کر سکتی ہو تو کرو، میں تم سے شادی کرنے کے لیے بہت سنجیدہ



”عجب ہے، اسے بھی اسی وقت یہاں کھڑا ہوتا ہوتا ہے؟ اب ہم اپنی بالائی میں بیٹھنا چھوڑ دیں؟“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ ”ہمارا کیا لیتا ہے۔ وہ کتاب نکال کر پڑھنے لگی مگر اسے دیکھتے رہتا اس لڑکے کا معمول بن گیا تھا۔

گھنار نے زندگی میں کبھی کسی لڑکے کو اہیت نہ دی تھی اور نہ وہ لڑکوں سے بات کرنا پسند کرتی تھی۔ وہ اکثر لڑکوں کو لپچڑ کہا کرتی تھی۔ اس مسکراہٹ سے اسے گھن آتی تھی جو لڑکیوں کو دیکھ کر لڑکوں کے چہرے پر آتی تھی اور ان کے چہرے میل اٹھتے تھے۔

وہ اکثر خود سے کہتی تھی۔ ”میں تو اس لڑکے کا منہ نوح لوں گی جو مجھ کو دیکھ کر مسکرائے۔“

کئی دن اسی طرح گزر گئے وہ اسے دیکھ کر اسی طرح مسکراتا رہا مگر گھنار اس کا منہ نہیں نوح سکتی تھی۔ اب تو یہ معمول بن گیا تھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوئی وہ چاروں طرف کا جائزہ لیتی ایک آدھ اپچی نظر اس پر بھی ڈال لیتی اور پھر کتابوں میں مصروف ہو جاتی۔ اس دوران وہ اسے مسلسل دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں اسے اسی طرح گھورتا دیکھ کر اب گھنار کو غصہ نہیں آتا تھا مگر اس احساس پر کہ کوئی اسے گھور رہا ہے وہ جیز ہو جاتی پھر شام ہو جاتی اور وہ اپنی کتاب سمیٹ کر اندر آ جاتی اور پھر اگلی شام کا انتظار شروع ہو جاتا۔

اس دن گھنار نے خصوصی طور پر کڑھا ہوا کڑہ اور تنک پا جامہ پہن رکھا تھا۔ وہ بالکونی میں آئی مگر اس خوبرو کو نہ پا کر اداس ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اداسی کے ممتوں کا پتہ چلا تھا۔ وہ غروب آفتاب کا وقت تھا، سامنے ساحل سمندر پر لوگ بڑی دلچسپی سے سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہے تھے لیکن اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اسے بالکونی میں

آئے ہوئے گھنڈ بھر ہو گیا تھا۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سڑک پر لگے بجلی کے گھمبوں پر نصب برقی قوتیں روشن ہو چکے تھے۔ سمندر کی بے قراری میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور گھنار کے جذبات بھی اندر ہی اندر ٹھٹھکیں مار رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر مایوسی سے اندر آ گئی پھر کئی شاخیں گزریں، کئی سورج ڈوبے مگر وہ خوبرو نظر نہیں آیا۔ اب تو اسے خود پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی کہ اسے کیا ہو گیا تھا؟ اس کی نظریں اسے کیوں تلاش رہی تھیں؟ مگر اس کا دل تھا کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

امتحانات قریب تھے، وہ گرم کالی شال اوڑھے بوجھل قدموں سے بالکونی میں آ بیٹھی اور مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ پڑھتے پڑھتے اچانک سر اٹھایا تو اسی خوبرو کو سامنے پایا جس کی آرزو لیوے وہ ہر شام بالکونی میں آتی تھی۔ ضبط کے باوجود اس کا چہرہ خوش سے کھل اٹھا اور خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔ گھنار نے صاف محسوس کیا کہ دل کے یوں دھڑکنے میں عجیب سی لذت اور خوشی مل رہی تھی، ایسی خوشی کا احساس اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ بے اختیار اس نے اشارے سے اس کا حال پوچھ لیا، ”جواب میں لڑکے نے بھی سر ہلا کر جواب دیا۔ گھنار کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہے۔ وہ مسلسل ایک دوسرے کو تکتے جا رہے تھے۔ گھنار کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی کتابوں میں مصروف ہونا چاہا لیکن دل تھا کہ اس خوبرو کو بار بار دیکھنے پر اکسار ہا تھا۔ اس کا جی چاہا اس سے ڈھیروں باتیں کرنے اس سے پوچھنے تم مجھ میں پریت جگا کر کہاں گم ہو گئے تھے؟ میں تمہاری یاد میں کتنا ترپتی رہی۔“ لپچڑ کہیں کی..... کھیل اٹھی لڑکے کو دیکھ کر، مسکراہٹ ہی کیا تمہی کہ اشارہ بھی کر بیٹھی، بس“

آگئی تا تو بھی وہیں پر۔ ایک آواز گونجی۔ گھنار نے ارد گرد دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔

اس نے مٹی پلائٹ کی تیل کوڑی کے ساتھ بل دے دیا، چند سوکھے پتے ٹہنی سے جدا کیے اور پانی دے کر اندر آ گئی اور پلنگ پر دراز ہو گئی پھر اٹھ کر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے رو برو سر سے پانک خود کا جائزہ لیا۔ اس کے لمبے کھلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اسے خود پہ پیار آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے دیر تک مسکراتی رہی۔ ایک ایک اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ بند کمرے سے نکلے اور کھلی فضا میں جائے۔ یہ احساس اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ تو سب سے الگ تھلگ کمرے میں بند رہتا پسند کرتی تھی۔ صرف کتابیں ہی اس کی ساتھی ہوتی تھیں مگر آج کمرے سے نکل کر باہر جانے کی خواہش اس میں اس شدت سے جاگی کہ وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے جو کڑ پینے پر اس لیا اور شال اوڑھ کر کمرے سے نکلے تو ابو سے سامنا ہو گیا۔

”پٹا.....! کہاں جا رہی ہو؟“ انہوں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”وہ..... ابو.....! بس..... سامنے اسٹورٹک جا رہی ہوں۔“

”اچھا۔“ ابو نے خوش کوار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ ان کی حیرت بجا تھی۔ گھنار ان کی بیٹی تھی اور وہ اپنی بیٹی کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ وہ تو ان کے ٹال ٹال پر بھیجے پر بھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی اور آج از خود ہی.....

گھنار باہر نکلی۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے اس کے کھلے بال لہرانے لگے۔ ابھی وہ ذرا آگے بڑھی تھی کہ ایک نئی پچھاتی کار اس کے قریب آ کے رکی۔ اس نے گاڑی پر نظر ڈالی، ڈرائیونگ سیٹ پر وہی

غزل

ڈھل چکی شام الم، رات ہوا چاہتی ہے
جانے کیا صورت حالات ہوا چاہتی ہے
دل میں ہیں جذبات، آنکھوں میں آنسو میرے
ایسا لگتا ہے کہ برسات ہوا چاہتی ہے
بے قراری وہی نظروں کی، کک دل کی وہی
پھر محبت کی شروعات ہوا۔ چاہتی ہے
تم بھی آ جاؤ کہ میت ہے مری اٹھنے کو
آخری سب سے ملاقات ہوا چاہتی ہے

محمد فہیم

خوبرو براجمان تھا۔

”کہیں جا رہی ہیں؟“ اس نے دلنشین انداز میں پوچھا۔

”ج..... جی.....“ گھنار نے گھبراتے ہوئے کہا۔ سردی کے باوجود اسے لگا کہ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی ہے۔

”میں چھوڑ دوں؟“

”نہیں، نہیں، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

”اچھا آپ کی مرضی۔“

”جی، میری مرضی نہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

سامنے اسٹورٹک ہی تو جانا ہے۔“

”اوہ..... میرا خیال تھا شاید آپ کہیں اور جا رہی ہیں۔ اچھا، اوکے۔“ وہ آگے بڑھ گیا اور وہ اس مختصر ملاقات کے نشے میں چور اسٹور پر جانے کی بجائے تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی خوشی میں مخمور گھر پلٹ آئی۔

کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے چٹی لگادی تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات کوئی پڑھ نہ لے پھر خود کو پینک ردھپ سے گرا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ایک چھوٹی سی ملاقات نے اسے خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف پھول ہی پھول اور رنگ ہی رنگ بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔

’کاش ملاقات کے یہ لمحے طویل ہوتے۔ اس کے اندر سے ایک ہوک ہی اٹھی تھی۔ اب اس نے بالکونی میں بیٹنا بند کر دیا تھا گو اس کے لیے یہ بہت مشکل کام تھا لیکن وہ اپنا ضبط دیکھنا چاہتی تھی اور بار بار اٹھتے ہوئے قدم روک لیتی تھی کہ یہ سب کچھ اسے پسند نہ تھا۔

اس روز کالج میں فنکشن تھا۔ گنار نے اپنے ابو کو کالج آنے کا ساڑھے سات بجے کا وقت دیا تھا مگر فنکشن تو چھ بجے ہی ختم ہو گیا تھا۔ سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ اس نے سوچا وین سے چلی جانی ہوں کون ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرے سواٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ جوں ہی اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا سانسے سے وہی سفید چمکدار گاڑی آتی نظر آئی تاہم اس نے نظریں پھیلایں مگر گاڑی اس کے قریب آ کر رکی۔ گنار خوشی سے کھل اٹھی جو ضبط کے باوجود اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔

”گھر جا رہی ہیں؟“

”جی۔“

”آئیے میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔“

”نہیں میں وین میں چلی جاؤں گی۔“

”ارے آپ کس وین میں جائیں گی آج تو وینوں کی بڑتال ہے؟“

”اچھا؟“ وہ چونکی۔ ”پاپا نے تو ساڑھے سات بجے آنا ہے اور ابھی صرف ساڑھے چھ بجے ہیں اور

رات بھی ہونے والی ہے۔“ اس نے پریشانی سے بڑبڑاتے ہوئے کھڑی میں دیکھا۔

”بھئی اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟“

”نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”میں آپ کو فوٹر لگتا ہوں؟“

”نہیں نہیں۔“ اس نے بہ غلت شپٹاتے ہوئے کہا۔

”تو یہاں کھڑے رہنے سے بہتر نہیں کہ میں آپ کو گھر چھوڑ دوں؟ آپ کے پاپا کو چوہان صاحب کہتے ہیں نا؟“

”جی۔“

”وہ میرے ڈیڑی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے جو 18 سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔“

”اوہ.....“ گنار نے بے اختیار تاسف سے کہا۔

اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے بیٹھ گئی۔ گنار سمٹ کر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بار بار ششے سے اس کے چہرے پر نظریں ڈال رہا تھا۔ گاڑی فرائے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ وہ دونوں بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن پہل کون کرے؟

گنار کے اندر سے آواز اٹھی۔ ”یہ موقع زندگی بھر نہیں ملے گا۔ اگر کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو کہہ دو اپنے دل کا راز۔“ لیکن وہ ہمت کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔

”آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ اس نے ششے سے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

”جی جی“ مجھے گنار کہتے ہیں۔“ اس نے

تدرے بدحواسی سے کہا۔

”اور آپ کا؟“

”مجھے کفر از کہتے ہیں۔“

’نام بھی خوب ہے اور خود بھی خوب ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں سراہتے ہوئے کہا۔

اب گاڑی سی ڈیو پہ آن پہنچی تھی۔ گاڑی کی رفتار بھی ہلکی تھی۔

کس قدر حسین شام ہے بالکل نئی حسین بیابا کی طرح جسے آتش بیج پہ بٹھا دیا گیا ہو اور اس کے ماتھے پہ ڈوہتے سورج کی طرح کندنی ٹپکا چہرے کو روشن کر رہا ہو۔ گنار اس منظر میں جیسے کم ہوئی تھی۔

”ہم بھی چلیں ساحل پہ؟“ یکا یک گنار نے پوچھا۔

”نہیں پھر سی۔“ کفر از نے کہا۔

”پھر کیوں؟ اور کب؟“

”کبھی بھی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کبھی ابھی نہیں بن سکتا ہے؟ اگر ابھی نہیں تو کبھی نہیں“ کفر از اس غیر متوقع جواب پہ بوکھلا سا گیا اور اس نے گاڑی ساحل کی طرف موڑ دی۔ وہ کھیل اٹھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بچوں کی طرح تالیاں بجاے۔

”کفر از صاحب میں سمجھتی ہوں زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اس لیے انسان کو ہر لمحے کو جینا چاہیے۔ میں شام کے اس لمحے کو گونا گونا نہیں چاہتی اور ویسے بھی میں نے آج تک اس ساحل کی کوئی شام مس نہیں کی۔ ڈوہتے سورج کا نظارہ کرنا میرا من پسند مشغلہ ہے۔ ذرا گاڑی تیز چلائیے تاہم تھوڑا رہ گیا ہے۔“ گنار نے کھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈیڑی کے گھر پہنچنے سے پہلے میں گھر جانا چاہتی ہوں ورنہ وہ کان جا کر پریشان ہوں گے۔“

”او کئے ویسے آپ کالج میں کس ایئر میں

ہیں؟“

”ڈاکٹری کے فائل ایئر میں۔“

”جی میڈم؟“ کفر از چونکا۔

”جی.....!“

”کمال ہے میں تو آپ کو فرسٹ یا سیکنڈ ایئر کی طالبہ سمجھتا تھا۔“

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ گنار اب خاصی ایزی ہو چکی تھی۔

”ہمارے کچھ کرنے یا نہ کرنے سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟“

”اچھا یہ بات ہے تو ہم نہیں پوچھتے۔“

”پھر کب ملے گا؟“ گنار نے پوچھا۔

”کبھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس یونہی۔“

”کیا مطلب؟“

”کوئی مطلب نہیں۔“

”کیا آپ مجھ سے ڈر گئے ہیں؟“

”نہیں تو.....“ اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اگلے ہی لمحے ایک دھچک کے ساتھ گاڑی فلیٹ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”اندر نہیں آئے گا؟“

”پاپا سے سلام کہیے گا۔“

”او کئے ہائے۔“

”ہائے۔“

دن پونہی گزرتے رہے وہ کھڑکی سے روزا سے دیکھتی۔ کفر از بھی جیسے اس کا منتظر رہتا تھا۔ وہ امتحانات سے فارغ ہوئی تو گنار نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرنے کا سوچ لیا تھا۔ کفر از میں وہ سب کچھ تھا جو وہ چاہتی تھی وہ دوسرے لڑکوں سے بالکل

مختلف تھا نہ کبھی اس نے کوئی پھول دیا نہ ہی اشارہ کیا اور نہ ہی کبھی کوئی پریم پتر لکھا۔ ان خصوصیات نے گلزار کی نظروں میں اسے اور بھی قابل قدر بنا دیا تھا۔ وہ گلزار سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی محبت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس روز ای ڈیڈی بین و بھائی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ اکیلے میں اس کا دل گھبرا رہا تھا، سو وہ یونہی چہل قدمی کے لیے باہر آگئی۔ اگلے لمحے گلزار کی گاڑی اس کے قریب آ کر رکی۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“

”بس اکیلے جی گھبرا رہا تھا باہر نکل آئی۔“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ کیا ہو سکتا ہے گھر میں کوئی بھی نہیں سب گئے ہوئے ہیں۔ میں چونکہ نیند اور شام کی بڑی پیاری ہوں اس لیے نہ گئی لیکن آج مجھے اس شام سے بھی ڈر لگ رہا ہے ابھی گھر والوں کے آنے میں بہت دیر ہے۔“

”اگر آپ برا نہ مانیں تو.....“ گلزار نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی اور وہ اعتماد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔

”کہاں چلیں؟“

”سائل کچھوڑ کر اور کہاں جاسکتی ہوں؟“

”اب تو ذرا نہیں لگ رہا؟“ گلزار نے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

سی و پو پر دو تین چکر لگانے کے بعد گلزار نے گاڑی سائل پر روک دی۔ وہ نیچے اتر گئی جبکہ گلزار گاڑی میں بیٹھا اس بھولی بھالی لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال جوڑے کی شکل میں لپٹے ہوئے تھے۔ گلزار کے بالوں نے ہی اسے پہلے

ہی دن اپنا اسیر بنالیا تھا۔ وہ مالٹا لکری قیص و دو پیشہ اور فیروزی جینز میں بلبوں کی طرح آتی پائنتی مار کر ریت پر بیٹھ گئی اور گھر وندہ بنانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ گلزار اس کے پیچھے چلا آئے گا لیکن جب وہ نہ آیا تو اسے خود ہی گاڑی کی طرف آنا پڑا۔

”باہر تو آؤ دیکھو میں نے کس قدر خوبصورت گھر وندہ بنایا ہے۔ تم اس میں بسنے کے لیے آ جاؤ نا۔“ گلزار نے خوشی کے ساتھ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا لیکن گلزار کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”ارے یہ کیا؟“ گلزار نے حیرانی سے کہا۔ ”تمہیں میرے ہاتھوں سے بنے تاج محل میں رہنا پسند نہیں؟“

”نہیں..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے فوراً آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ گلزار اس کا بایاں پاؤں دیکھ کر چمکا سی گئی۔ اس کی ٹانگ مصنوعی تھی اس نے خود کو سنبھالا۔ گلزار ایسا کبھی اٹھانے لگا تو گلزار نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں گھر وندے کے پاس پہنچے۔ لہریں اسے بہا کر لے جا چکی تھیں۔ زخمی سورج پانی سے اپنے خون کو دھو رہا تھا۔ یہ اس کی تقدیر کا سورج تھا جو زندگی کی شامیں رات کو سو نہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو رہا تھا لیکن وہ واقعی اتنی کمزور نہ تھی فطری حوصلے نے ماپوسی کے لفظ کو اس کی زندگی سے مٹا دیا تھا۔ وہ جینا جانتی تھی۔

”گلزار از.....! میں وہ شرتی عورت نہیں ہوں جو قدم قدم پر مرد کی محتاج ہوا کرتی ہے جسے پاؤں کی جوتی سمجھ کر اتار دیا جاتا ہے۔ تم مجھے زندگی میں کبھی بھی کمزور نہ پاؤ گے۔ تم جیسے بھی ہو مجھے قبول ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی، تم مجھے چھوڑ دیتے؟“

”نہیں ہرگز نہیں۔“

”تو پھر مجھ سے کیوں اس بات کی توقع کرتے ہو؟ میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں تمہیں اس حال میں تنہا کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟“

گلزار حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”گلزار.....! تم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو میرا بھی فیصلہ سن لو، میں بھی خود غرض نہیں ہوں جو تم پر زندگی بھر کا بوجھ ڈال دوں کیونکہ حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے قدم قدم پر پچھتاوے کا بوجھ انسان کو زندہ درگور بنا دیتا ہے اور میں اپنی خود غرضی کے ہاتھوں تمہاری زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا۔“

”سک..... کیا؟“

”دیکھو سورج ڈوب رہا ہے چاند کی چاندنی راتوں میں تو محبت کرنے والے وعدے کرتے ہی ہیں مگر ہم اس ڈوبتے سورج کے سامنے کبھی نہ ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔“ اور وہ ٹپ کر اس کے سینے سے جا لگی کبھی نہ ملنے کے لیے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کے لیے۔

دونوں بو بھل قدموں سے چلتے ہوئے کار میں آئے بیٹھے۔ اس بار گلزار نے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا تھا اور وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

گاڑی مخصوص رفتار سے زمین کو روندتی چلی جا رہی تھی سرد ہوائیں ان کے جسموں میں سویں کی مانند چھ رہی تھیں تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ گلزار کے قلیٹ کے سامنے گاڑی رکی۔ اس نے اترنے سے پہلے زخمی نظروں سے گلزار کو دیکھا۔

”گلزار از.....! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ اس نے گہیر لہجے میں کہا اور تیزی سے اتر گئی۔ اس وقت جو کبھی نہ ختم ہونے والی برسات اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی جسے کوئی نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اب بھی شاید جاری ہو!

تیرے نام لکھ رہی ہوں!!

☆☆☆

میں اپنی زندگی کی ہر خوشی تیرے نام لکھ رہی ہوں

کبھی وہ کہتی تھی

میں اپنی زندگی تیرے نام لکھ رہی ہوں

ترے ہونٹوں کی یہ مسکان کبھی نہ مر جائے

اے مرے ساجن میں اپنی یہ ہنسی

ترے نام لکھ رہی ہوں

خوشیاں قدم قدم پر جوتی رہیں

تم ساتھ میرے تو سکھ کا بھی اجالا ہے

میں اپنی زندگی کی ہر گھڑی تیرے نام لکھ رہی ہوں

میں اپنے سکھ کا سو پر شاہد وفا

تیرے نام لکھ رہی ہوں

☆☆☆

مور شاہد وفا

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

احمر منصور

ان کی سی داستان

قابلِ اجیری کا خیال
نامرادی اپنی قسمت، گری اپنا نصیب
کارواں کی خیر ہو ہم کارواں تک آگئے

معاشرے کی اس جنس کی کہانی زندگی جس کے لیے ایک دشنام ہے



یوں تو خواہجہ سراؤں کی ایک تحریک برابر کے انسانی حقوق حاصل کرنے کے حوالے سے خراباں خراباں چل رہی ہے مگر ہندوستان کی فلم ”شبنم باجی“ میں جو رول اسوتوش رانا نے ادا کیا اور جیسی دینگ اور مردوں جیسی بات کی دہنی شبنم باجی رہیں کہ اپنے علاقے کے رکن اسمبلی کو بھی انہوں نے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا پھر وہ خود انتخابات جیت کر اسمبلی میں پہنچی۔ یہ ہندوستان کی جمہوری تاریخ کا ایک سچا اور انوکھا واقعہ ہے تاہم بعد میں یہ شور و غلظت ختم کیا اور پھر کی خواہجہ سراؤں کو اسمبلی تک پہنچنے کی جرات نہیں ہوئی کہ سیاست کے خارزاروں سے الجھنا کم سے کم خواہجہ سرا جیسی مخلوق کے بس کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایک پڑھے لکھے اور فر فر انگلش بولتے خواہجہ سرا بونے نے ایک تنظیم بنالی ہے جس کے وہ چیئر پرسن ہیں۔ اب تک تو صرف بونے کے مختلف ٹی وی چینلوں پر انٹرویوز چلے ہیں۔ ان کی تنظیم نے کیا کچھ کامیابیاں حاصل کی ہیں اس کی تفصیلات سامنے نہیں آئیں۔ بہت سے سوالات اس معاملے میں اٹھائے جاتے رہے ہیں مثلاً خواہجہ سرا مغربی ملکوں میں بھی تو پیدا ہوتے ہوں گے وہاں ان کی ایسی تذلیل اور کم تر کی کے مناظر کیوں دیکھنے میں نہیں آتے؟ دوسرا اہم ترین سوال کہ خواہجہ سرا کیا صرف غریب گھروں میں ہی جنم لیتے ہیں؟ اگر وہ امیر گھروں میں جاہ و شہمت والے لوگوں کے ہاں بھی جنم لیتے رہے ہیں تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی زندگی کا سفر کیسے تمام ہوا؟ کیا وہ بھی سڑکوں پر بھیک مانگ کر زندگی کی گاڑی کا پیہر چلاتے رہے ہیں؟ پتا نہیں ان سوالوں کا کوئی جواب بھی ملے گا یا نہیں مگر برصغیر میں اس پورے طبقے پر بہت سی فلمیں اور ڈرامے بنائے گئے جو زیادہ تر کامیاب ہوئے ہیں یعنی لوگوں کو ان عجیب و غریب کرداروں کے بارے

میں جاننے میں بھاری دہچکی ہے۔ ماضی میں خواہجہ سراؤں کی گزراوقات کا جو رلیہ ہمیں بڑی وضاحت سے نظر آتا ہے وہ شادی بیاہ کی تقریبات میں ناچ گانا اور جواب میں ملنے والے وہ پیسے جو دلہا دلہن کے مختلف رشتے داروں کے ہاتھوں انہیں تیل کی صورت میں ملا کرتے تھے شادی بیاہ کے علاوہ فتنوں کی تقریب، کہیں کہیں رسم بسم اللہ یا پھر بچوں کی خوشی کے حوالے سے منعقدہ تقریبات سے خواہجہ سراؤں کا بڑا گہرا سببندہ تھا۔ دیرے دیرے وقت بدلا اور سب کچھ بدل گیا۔ شادی بیاہ میں خواہجہ سراؤں کا ناچ گانا موقوف ہوا اور ان کی جگہ میوزک پلیئر پر چلتے چلتے گانوں کی تال پر ناچنے کی ذمہ داری خاندان کے اپنے ہی نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھالی۔ عین شادی کی بڑی تقریبات میں یا تو میوزیکل شوز کی روایت اب کافی حد تک دم توڑ چکی ہے یا پھر بعض بڑے خرچے والی شادیوں میں ہی میوزیکل شوز ہوتے ہیں ورنہ عام متوسط گھرانوں کی شادیاں اب فلمی گانوں کے شور و غوغا سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی ہیں اور بیشتر شادیوں میں یہ تکلف بھی نہیں کیا جاتا چنانچہ خواہجہ سراؤں کے سامنے اس سوال نے اڑ دے کی طرح منہ کھول دیا کہ ان کے پیٹ کا دوزخ اب بھرے تو کیسے بھرے؟

”بڑی اذیت ہوئی اس فیصلے تک پہنچنے میں۔ بڑے روئے ہم سب۔ اے ہے کیا اب سڑکوں پر بھیک مانگیں گے؟“ اس نے اپنی کہانی کا تھمنا شروع کر دی تھی۔ ”شروع شروع میں فیصلہ ہوا کہ سب لوگ الگ الگ گردہ بنا کر اپنے اپنے علاقے بانٹ لیں اور سڑکوں پر بھیک مانگنے کے بجائے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے جائیں۔ محبوب تو تھا یہ بھی۔ پر سڑکوں سے زیادہ نہیں۔ کچھ دن میں یہ پتا پڑ گیا کہ

تھیں جس میں تین وقت کا کھانا مجھے لازمی مل جاتا تھا، وہ بھی میری قسمت میں نہ رہا اور مجھے بمشکل دو وقت کا کھانا ذاتی کوششوں سے ملا کرنا تھا۔ گھر کے زیادہ تر کام مجھ سے کرائے جانے لگے۔ ماجدہ بچن کا کام کرتی اور اماں کھانا پکایا کرتی تھیں۔ میری ماں بھلے ہی مجھ سے وہ محبت نہ کرتی تھی جو بہر بھائی سے کرتی تھیں یا سب بچوں کی مائیں ان سے کیا کرتی ہیں مگر وہ میری ماں تھیں اور مجھے اس بات کا احساس اس وقت زیادہ شدت سے ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرے لیے کھانا پکانا کبھی نہیں بھوتی تھیں مگر اب مجھے کھانا خود نکال کے کھانا پڑنا تھا۔ ماجدہ صرف میرے لیے ہی ایسی نہ تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کافی لاپرواہ اور بد اخلاق قسم کی انسان تھی۔ ایسے ہی دنوں میں ایک دن ایسا آیا کہ اماں کی طبیعت کچھ خراب تھی اور اس دن ماجدہ کو کھانا بنانا تھا۔ مجھے شدید بھوک لگی تو حسب معمول میں نے بچن میں جا کے کھانا نکال کے کھانے کی کوشش کی مگر کھانا تھاپی نہیں۔ ہر طرح سے کوشش کرنے کے بعد جب مجھے کھانا نہیں ملا تو میں اماں کے کمرے میں گیا اور چپ چاپ کھڑے کھڑے رونے لگا۔ اس دن جو مجھے یاد ہے پہلی اور آخری بار اماں نے بڑی گرم جوش سے روتے ہوئے پیار کیا تھا۔ اپنی چھاتی سے بھی چٹایا اور بس اتنا بولیں۔ ”جا چلا جا۔ جہاں تیرا دل چاہے۔“

”اماں.....! کیا آپ مجھے گھر سے نکال رہی ہیں؟“ میں نے بڑی مشکل سے روتے ہوئے کہا۔ ”کاش“ میں تجھے اپنی لکھ سے ہی نہ نکال پاتی۔“ پھر اماں بہت ہی شدت سے روئیں اور منہ چھپا کے لیٹ گئیں۔ میں کچھ دیر کھڑا کچکیوں سے روتا رہا پھر آہستگی سے کمرے سے نکل آیا۔ ماجدہ نے شاید ہماری باتیں سن لی تھیں وہ بچن میں جلدی جلدی

کچھ پکانے کھڑی ہو چکی تھی مگر اماں کا یہ جملہ کہ ”جا“ چلا جا جہاں تیرا دل چاہے۔“ میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ میں خاموشی سے جانے کیوں دروازے کی طرف بڑھا۔ کہ چلا جاتا ہوں۔ دل کا تو پتا نہیں، بس ”جا“ چلا جا۔ مجھے یاد ہے۔ مجھے جاتے دیکھ کر دروازے کی آہٹ سن کر ماجدہ میرے پیچھے لپکی۔ اس نے مجھے بہت آواز سن دیں کہ ”کھانا پک گیا ہے، کھالے۔“ مگر مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی اور میں چلا ہی رہا۔ ایک جگہ جا کے رک گیا۔ نہیں معلوم کہ کون سی جگہ تھی؟ کچھ ہی دیر میں موٹر سائیکل پر دوادو باش سے لڑکے آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کون ہوں؟ کیا گھر کا راستہ بھول گیا ہوں؟ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا، بس میری آنکھوں سے آنسو گرتے رہے پھر وہ دونوں مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جانے لگے تو میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ راستے میں ایک گنجان آبادی سے گزرے تو ایک ڈھابے سے ہوٹل کے سامنے مجھے اچانک اپنی بھوک یاد آئی، میں نے بس اتنا کہا۔ ”بھوک لگی ہے۔“ ان میں سے ایک گیا اور نکلے روٹی خرید کر پارسل لے آیا۔ میں موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا پھر وہ مجھے رات کے اندھیرے میں ایک فلیٹوں کی بلڈنگ میں لے گئے۔ وہ فلیٹ کافی غریب لوگوں کا لگتا تھا ہر چیز سے غربت نیک رہی تھی وہاں ایک چھوٹا سا پٹنگ بھی تھا جو ایک آدمی کے سونے کا ہی تھا۔ انہوں نے مجھے پٹنگ پر بٹھا دیا اور اس رات میرے ساتھ وہ کچھ ہوا جسے میں بھول نہیں سکتا، جو کچھ فہم میری پچھلی کے لڑکے نے کیا تھا وہی سب ساری رات یہ دونوں لڑکے بھی کرتے رہے اور صبح ہونے پر ان میں سے ایک کہیں چلا گیا اور کافی دیر بعد واپس آیا پھر مجھے بٹھا کر لے چلے اور مجھے ایک اور راتج خواجہ سرا کے پاس چھوڑ دیا۔ اس کا

ام ممتاز باجی تھا۔ انہوں نے ہی اماں کے کہنے پر تمام الماس رکھا اور مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان حرام زادوں نے مجھے 2,000/- میں ممتاز باجی کے پاس لے لیا تھا۔ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ تو ممتاز باجی بھی بھر لی لیٹ تھیں مگر مجھے خریدنے کی دوجہ میں ایک ہرے بچہ ہونے سے بھیک زیادہ ملتی تھی دوسرے ان لڑکوں جیسے گاہک بھی کافی پیسے دے جاتے تھے اور اس طرح میں اپنی اصل جگہ آچکا تھا جس کے لیے قدرت نے مجھے پیدا کیا تھا۔

دس سال میں نے یہی زندگی گزاری اور ان دس سالوں میں مجھ سے جو کچھ گزری وہ سننے کی آپ میں تاب نہیں ہو سکتی پھر مجھے نونہ ملی جو میری ہی ہم عمر تھی اس کی کہانی مجھ سے کچھ مختلف تھی۔ وہ اس گندگی میں میری طرح بچپن سے نہیں تھی مگر اس کے کہنے کے مطابق، بھیک مانگنے پر بھی ایسے لوگ ٹکرا ہی جاتے ہیں اور یوں وہ بھی اس دھندے میں آ گئی۔ مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں ملا کہ آخر خدا نے ہمیں کیوں پیدا کیا؟ ہم نہ ہی انسانوں کی طرح مر کے دفن ہو سکتے ہیں نہ ہی ہماری کوئی اور اوقات ہے۔ مسجد میں نماز پڑھنے کو ہمیں کوئی نہیں روکتا مگر ہماری نماز جنازہ کوئی نہیں پڑھاتا۔ اس کے لیے بھی ہم نے ایک مولوی رکھا ہوا ہے جسے اپنی بھیک اور حرام کی کمائی میں سے ہم معاوضہ دیتے ہیں تو وہ نماز پڑھانے پر تیار ہو جاتا ہے مگر جب بھی کوئی جنازہ اٹھتا ہے تو نماز جنازہ میں یہ سوال ضرور کھڑا ہوتا ہے کہ ہمیں مرد کہہ کر دفن کیا جائے یا عورت کہہ کر؟ مجھے دو جنازے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ دونوں میں ان لواحقہ سراؤں نے جو ان مرنے والوں کے کچھ لگتے تھے انہیں عورتوں والے ناموں سے ہی دفنانے اور نماز پڑھانے پر زور دیا۔ ہم اب پانچ لوگوں کا ایک گروپ بن چکے تھے۔ میں، نونہ، نیلو، سانوری اور

ریشم۔ ہماری لڑائیاں بہت ہوتی تھیں اور دوستی بھی بہت تھی۔ آپس کا ہنسی مذاق بھی خوب تھا۔ ایک مرتبہ تو مجھ میں اور ریشم میں خوب زوروں کی جنگ چلی۔ ایک لڑکا تھا اسد، ہم دونوں کو اس سے محبت ہو گئی۔ ریشم کا پتا نہیں مجھے سچ سچ اس کی آنکھوں سے پیار ہوا تھا مگر وہ سر اسراف کیس کی بات کرتا تھا کہتا تھا کہ میری محبت بھی یہی ہے۔ میں چاہتی تھی مجھ سے شادی کر لے مگر وہ مانا ہی نہیں۔ کسی سرکاری پرچنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ ایک دن یونٹی سیکل پر ملا تھا، اگلے دن پھر آ گیا۔ میں پاس سے گزری تو اس نے آواز دے کر مجھے بھیک دی ورنہ تو موٹر سائیکل والے عموماً بھیک نہیں دیتے کہتے ہیں۔ ”ہمارا سچ چھوٹ جائے گا۔“ اور ہپ پاٹ سے پیسے نکالے میں بھی انہیں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

ہوا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“

میں نے اسے گھور کے دیکھا تو جھٹ آنکھ مار دی۔ میں سمجھ گئی، گاہک ہے۔ میں بڑی جلدی میں تھی اس لیے فوراً اس سے کہا۔ ”الماس نام ہے رات دس بجے آ جانا، یہیں ملوں گی۔“ وہ مسکرا کے چلا گیا۔ رات کو میں انتظار ہی کرتی رہی پھر وہ چلی نہ آیا پھر دو دن بعد ملا۔ میں لپک کے اس کی طرف بڑھی۔ اس دن ریشم کی بھی اسی سیکل پر باری تھی۔ ہماری باریاں لگتی ہیں۔ وہ لپک کر اس طرف آئی اور جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کے بولی۔ ”خبردار.... وہ میری پارٹی ہے۔“ مجھے ریشم پر براغصہ آیا، یوں دھونس جما کے کوئی کسی کی پارٹی تو نہیں ہو جاتا؟

”مجھے جانے دے، مجھے بھیک نہ دی تو سمجھوں گی، تیری پارٹی ہے۔“ مجمع میں تماشہ کرنے سے اماں جی نے بڑی سختی سے منع کر رکھا تھا۔ بقول اماں جی کے جو قدرت نے ہمارا تماشہ بنایا ہے وہ کم

نہیں ہے جواب ہم خود بھی اپنا تماشا بنائیں۔ جو کسی نے ذات برادری کو بدنام کرنے کی کوشش کی اس کی ناک کاٹ ڈالوں گی۔ ہم دونوں کو اماں جی کا خوف محسوس ہوا مگر غلطی پر ریشم تھی، ناک اس کی کٹ سکتی تھی اس لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں اس آدمی کے پاس پہنچی تو اس نے مجھے بھیک دے دی اور اپنا نام اسد بتایا۔ میں نے گلہ کیا کہ وہ اس دن کیوں نہیں آیا تھا؟ تو وہ بولا۔ ”وہ ہے تا ریشم“ اس نے ریشم کی طرف اشارہ کیا، دوسرے سکتل پر وہ مل گئی تھی، میں انتظار نہیں کر سکتا تھا تو اسی کو لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی اور بات کرتی، وہ سکتل کھٹنے لگے کارن چلتا بنا۔ اب ریشم کی حالت دیکھنے والی تھی بار بار مجھے رٹھی بولے جانے تے شاید ہنسو گے کہ رٹھی ہم جیسوں میں بھی گالی ہی ہے۔ میں نے اسے بہتر اسبھایا مگر وہ مرکھی گائے کی طرح بگڑتی ہی رہی اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ہم دونوں میں خوب بال پکڑ کر لڑائی ہوئی۔ جب تھک گئے تو نغمہ اور نیلو جو تھی دیر سے تماشا دیکھ رہی تھیں زور زور سے ہنسنے لگیں۔

”نیلو! اس چھٹال سے کہہ دے دنیا میں بس ایک آدمی کو چھوڑ دے باقی جسے چاہے نکل جائے۔“
”پر تو اس آدمی کا کیا اچار ڈالے گی؟“ نیلو نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

”مجھے پسند آیا ہے وہ۔“ ریشم نے اٹھلانے کی کافی کوشش کی۔
”مجھے بھی پسند ہے تو۔۔۔۔۔“ میں نے درمیان میں غصے سے کہا۔

”لو بھئی یہ دیکھو ایک پرانے آدمی پر یہ دونوں عقل کی دشمن ایسے حق بتا رہی ہیں جیسے وہ ان کا خصم ہو۔“ یہ نغمہ تھی۔

”ہاں میں اس سے شادی کروں گی۔“ ریشم

نے خند میں کہا۔

”اری تو؟ تو سب سے شادی کرنا چاہے مگر کوئی تجھ سے بھی کرنا چاہے کہ نہیں؟ خواہ مخواہ بھیجے پکائی ہے۔ تیرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ نغمہ نے چیخ کر کہا۔

”یہ ایسا نہیں ہے پہلے والے مردوں جیسا یہ ضرور مجھ سے شادی کرے گا“ مجھے پکا یقین ہے۔“ ریشم بولی۔

”نہ تو مجھے یہ بتا“ تجھ سے شادی کر کے وہ کرے گا کیا؟ جس کارن وہ شادی کرنے کو تیار ہوگا وہ مقصد تو اس کا اپنا شادی کے بھی پورا ہو رہا ہے پھر ہماری جیسی زنانوں کی شادیوں کی حیثیت بھی کیا ہے جب دودھل رہا ہو تو بھندار بندہ بھینس نہیں پالتا۔“ نیلو نے کافی گہری خنیدگی کا مظاہرہ کیا۔

”تو کون سی اس کے بچوں کی ماں بن سکتی ہے؟ آدمی کی فطرت ہے سال بھر بعد ہی اسے بیوی میں ماں دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ جو عورتوں کے گھر بے پڑے ہیں تا اس کی وجہ صرف سیکس نہیں ہے بلکہ وہ بچے ہیں جو یہ سب عورتیں جنم دیا کرتی ہیں پر تو نہ دیکھ ایسے خواب۔۔۔۔۔ ریشم نام رکھنے سے تو ریشم ہو نہیں جائے گی۔“ نغمہ نے بھی فلسفہ جھاڑا۔

”جب ریشم نہ تھی سیدی سیدی فیض محمد تھی تب کون سی میں فیض محمد گئی؟ ہم بے نام ہیں ہماری کوئی پہچان نہیں۔ جو کبھی ہوتے دونوں وہ سب میں بھی جانتی ہوں پر کیا چلا جاتا تم لوگوں کا جو کچھ عرصے میں اس غلط فہمی میں جھومتی نا چلی جی لیتی؟“

”چل پھر ٹھیک ہے جو تیری آنکھیں کھل ہی گئی ہیں۔ اب آپس میں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بن پڑے تو مل بانٹ کے کھاؤ ویسے وہ حرامی کوئی اتنی دیر نہیں رکھے والا جس پر تم دونوں ایک دوسرے کی دشمن ہوئی جاؤ۔“

”اری اولماس۔۔۔۔۔“ نغمہ نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔

”آج اماں جی نے سب کو اپنے پاس جمع ہونے کو کہا ہے یاد ہے نا؟“

”ارے اس ریشم کتیا کی وجہ سے میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ ٹھہر میں بس دس منٹ میں چلتی ہوں۔“

جب ہم تیار ہو کر جانے کو نکلے تو شبو آگئی جو ہمارے گروہ کی نہیں تھی مگر آج اماں کے پاس جانے کو ہمارے ساتھ چلتا چاہتی تھی۔ ریشم بدستور اسی طرح بیٹھی تھی حالانکہ وہ خاص طور سے ہرمینے اماں کے اس بلاوے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اماں بڑے مزے مزے کی پرانی باتیں بتایا کرتی تھیں۔

”تو نہیں چلے گی؟“ نیلو نے اس کے عین قریب جا کر پوچھا۔

”میں بعد میں آ جاؤں گی، تم لوگ جاؤ۔“ ریشم نے نیچی نظروں سے جواب دیا۔

”اری اولماس! اسے تو بچ مچ محبت ہوگئی ہے ری! اب یہ کچھ دن کسی کام کی نہیں رہی۔“ وہ یہ کہہ کر پھر ریشم کی طرف مڑی۔ ”چل ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی دیکھ، سانوری کو آج کافی دیر ہوگئی ہے۔ پتا نہیں کہاں رہ گئی؟ آئے تو اسے بھیج دینا۔“ نیلو نے کہا تو میں نے اسے بتایا کہ سانوری کا فون میرے پاس آیا تھا وہ اپنے اڈے سے سیدی وہ ہیں بچے کی یوں ہم پانچوں چل پڑیں اور ریشم چوری سی نیچی رہی۔

اماں نے مجمع دیکھا تو وہ بولیں۔ ”بڑی عجیب مخلوق ہے ہماری۔ گئے وقتوں میں مخلوں میں راج تھا ہمارا۔ بادشاہ جتنا اعتماد ہم پر کرتے تھے اتنا اپنی بیباہی بیگاہت اور رانٹوں پر بھی نہیں کرتے تھے۔ انہیں بھی اپنی کوئی عرضی بادشاہ تک پہنچانے کے لیے ہمارے جیسوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور سب سے عجیب بات

کیسا زمانہ بدلا۔“ اماں نے اپنے کم ہوتے بالوں کو پکڑ کے ان کا گولہ بنایا اور پیچھے دھکیلا۔ ”ارے تمہارے نصیب پھوٹے جو اس پرے اندھے عہد میں پیدا ہوئیں تم سب کی سب۔“ نہیں تو وہ زمانہ آج لوگ بزدل آدمی کو بھڑا بولے ہیں اور ان وقتوں میں بادشاہوں کی فوج کا ہراول دستہ یہی ہمارے جیسے خواجہ سرا ہی ہوتے تھے۔“

”اماں۔۔۔۔۔ ایہ ہراول دستہ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پتا تھا تو سوال ضرور کرے گی۔ ہراول دستہ وہ ہوتا ہے جو جنگ کے میدان میں سب سے آگے ہوتا ہے جو آگے والے دشمن کی سپاہ کو آگے بڑھنے نہ دیں تو سمجھو جیت یقینی ہوتی تھی۔ بڑے بہادر اور چاشنار لوگ ہراول دستے میں شامل کیے جاتے تھے اور خواجہ سرا اس دستے میں پیش پیش۔“

”پر اماں۔۔۔۔۔ کیا اس وقت انہیں بھڑوانہ سمجھیں تھے لوگ؟“ نیلو نے پوچھا۔

”اے لو! اب یہ نیلو بھی سوال کرنے لگی؟ بھڑواتو اس نئے زمانے کے لوگ کہتے ہیں۔ اس وقت تو ہم خواجہ سرا تھے۔“

”یہ خواجہ سرا کیا ہوتا ہے اماں؟“ پھر ایک آواز ابھری۔

”ہندوستان میں بادشاہی عہد میں ان خنثوں کو خواجہ سرا کہتے تھے جو مل کے زنان خانوں میں بھی بے دھڑک آ جاسکتے تھے مگر بعد میں سب ہی خنثوں کو خواجہ سرا بڑی عزت اور ادب سے کہا جانے لگا۔“

”لو! ہمارا بھی کبھی ادب تھا؟“ کسی کی ایک سرکشی ابھری۔

”اور اب بھڑوا کیوں کہتے ہیں؟“

”کیوں کہ اب محل رہے نہیں بادشاہ بھی سب ختم ہو گئے، شرافت بھی انہی کے ساتھ اٹھ گئی۔ جو

لوگ ہم کو بھڑایا لے ہیں اپنے گھروں اور محلوں میں رہنے نہ دیں تو یہ سرے خود بھی بھڑے ہیں ان میں اتنی مجال کہاں کہ بادشاہوں جیسی عزت دیں اور کچ پوچھو تو ان کی اپنی کوئی عزت نہیں ہے تو یہ ہمیں کیا عزت دیں گے؟ سمجھ لو بڑے بے عزت زمانے میں جینا پڑا ہے ہم جیوں کو.....

”تو اماں.....! تم بھی کسی محل میں تھیں کیا؟“
”ارے بیٹا، تمہاری اماں نے محل دیکھے مگر اجڑے ہوئے۔ بادشاہ نہ ہوں تو محلوں کی حیثیت خالی پڑی ڈھنڈا رہی کسی عمارت کی سی ہے۔ میری پیدائش سے تو بہت پہلے سب محل رُجواڑے بادشاہ اور ان کے خانوادے ختم ہو لیے پر تمہاری اماں نے تم سے اچھی دنیا میں آنکھ کھولی ناچ گانا بڑے سہاؤ کا کام تھا، بڑا بڑا لگا کے ٹوڑے موڑے سیکھنا پڑتے تھے پر اب آہ..... کیا کیا زمانے خاک ہوئے.....“

اماں ہر مہینے ماضی کے رنگین پنوں جیسے پنوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر واقعات اور قصے سنایا کرتیں۔ انہوں نے بھی یہ سب سن رکھا تھا ورنہ تاریخ لکھنے والوں نے بھی بھڑوں کو ایسی اہمیت نہیں دی کہ ان کی الگ سے کچھ کہانی بیان کی جاتی۔ کیا وہ زندگی نہ تھی جو بھڑوں نے ہزاروں سال کے ان سب دن و رات میں جی تھی؟ ہر روز ایسے سوال سر اٹھاتے جنہیں اب جھک کے آگے بڑھنے میں ہی شائستگی کیونکہ ہمارے کسی سوال کا کوئی جواب اس دنیا کے پاس نہیں ہے۔ چار چھ لوگ کھانے پکانے میں جڑے تھے۔ اماں کا وزن ملال کس مجلسی ماتم کی طرح جاری تھا۔ میرا ذہن بار بار ریشم کی طرف بھٹک جاتا کہ وہ کس طرح اس چمکنے اسد کی بانہوں میں بھول رہی ہوگی پھر اماں کی آواز میرے کانوں میں پڑی وہ کہہ رہی تھیں۔

”روح تو ہماری سدا کی ویران تھی پر جب سے

گندے تالاب میں نہائی ہے ہماری برادری۔ ہم سے لوگوں کا یہ ایمان بھی متزلزل ہوا کہ ہماری بددعا میں بڑا اثر ہے۔ اب تمہاری بد نصیب نسل لوگوں کو خوب دعا دیتی ہے اور ان کا معلوم ہے کہ تمہاری دعاؤں سے بھی ان کے نصیبوں میں مٹی بھر جالائیں ہونے والا اور جن کی دعاؤں میں اثر نہ رہے ان کی بددعا کی حیثیت کیا؟ پاؤں میں پڑی ٹوٹی ہوئی جوتی بس.....! اماں کی آنکھوں میں آنسو ڈول گئے۔

ماضی کا ماتم کرنے سے کیا ماضی بدل سکتا ہے؟ دنیا تو بدلی سو بدلی یہ ہمارا بنانے والا بھی ہم سے بدل گیا؟ اس سوال کا جواب تو اماں کے پاس بھی نہیں تھا کہ آخر خدا ہم سے کیوں اور کب ناراض ہو گیا؟ بھلا اب ہمیں کس کا آسرا ہے؟ تب بھی اماں یہی کہتی تھیں کہ یہ خدا ہی ہے جو ہمیں کھانے کو رزق دے رہا ہے ورنہ اس کے بندے تو ہمیں کبھی کا اپنی دنیا سے نکال چکے۔ خدا سے شکوہ کیا تو جو یہ امید ہے کہ مرنے کے بعد اچھے جہانوں میں اٹھائے جائیں گے وہ امید بھی نہ رہے گی اور جو یہ آخری امید بھی نہ رہی تو سمجھو جیسے کا کوئی سبب باقی نہیں۔“

”پر اماں.....! اتنے ڈھیروں ڈھیر گناہوں کے بعد کیا اس امید کو پکڑ کے جیا جاسکتا ہے؟“
”صبر تھی پرانے وقتوں اور پرانی فلموں کی شوقین، یہ غم کیا کم تھا کہ اب اسے سینماؤں پر پرانی فلمیں دیکھنے کو نہ ملتی تھیں اور پر سے یہ آخری امید بھی ہاتھوں سے چلی جا رہی تھی کہ اچھے جہانوں میں اٹھائے جائیں گے۔“

”اری، کہاں خدا سے امید تو شیطان کو بھی ہے کہ وہ آخر میں بخش ہی دے گا۔ امید کو نہ رکھو تب بھی انسان کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور جسے احساس ہو جائے وہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے تو اس کے گناہوں کا انت ہو ہی جاتا ہے۔“

”میں یاد نہیں اپنی مینا جو بدری کیسے پلک جھپکتے میں بدلی۔ حاجی نمازی بن کے اس نے اپنا نام عرفان غازی رکھ لیا اور کہتا ہے اللہ کے پاس نہ عورت ہے نہ آدمی بس روح ہے جو اس کی ہے اور روح کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ بڑی عجیب عجب باتیں کرتا ہے۔ کسپہری کی زندگی جیتا ہے۔ چھوٹی سی دکان میں بچوں کی چیزیں اور چورن اور مردوں کی خفیہ طاقت بحال کرنے کی دوائیاں بیچ کے پورا ڈال رہا ہے اپنا پر خوش ہے۔ خدا سے کو برابر لگائے رکھتا ہے۔“ اس آخری جملے پر ہم میں سے کیوں کو کلمی آ گئی۔

”ہاں تو کیا جھوٹ تھوڑی بولوں ہوں اس نے خود مجھے بتایا بولا سرکار نے کوئی بجلی گیس کی چھوٹ تھوڑی دی ہے۔ بچوں کی چیزوں سے بڑی مشکل سے پیٹ بھر روٹی ملتی ہے بجلی گیس تو بے..... خفیہ طاقت والی دواں دیاں ہی پوری کرتی ہیں خود بھی جانے کیا الا بلا بنائے ہے پر اللہ سب کو توفیق دے.....“

”خفیہ دوائیاں بیچنے کی؟“ نغمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چل گھوڑ ماری تیری عقل پھوٹی جج کرنے کی توفیق.....“

”اری اماں.....! جو دنیا میں جینے کے لیے جج کر کے بھی خفیہ طاقتیں بحال کرنی پڑیں تو پھر.....“
”نیلو نے کہا تو اماں سچ میں سے بولیں۔“

”بس، اس کے آگے کچھ مت کہنا۔ اللہ کے عہد اللہ جانے۔ ہماری سمجھ نہیں سمجھ سکتی ان رازوں کو۔“
کھانا تیار ہو گیا اور سب خوب ہنسی مذاق سے کھانے میں جٹ گئیں اور اماں کا سب کچھ جیسے پانی پلکسا تھا کسی کو نقطہ بھی یاد نہیں ہوگا۔ میں نے اماں کے کندھے دبا نا شروع کیے تو وہ بولیں۔

”کیوں ری الماس، تجھے آج بھوک نہیں ہے

”کیا؟“
”بھوک کیا ہے اماں.....! کبھی کبھی تو کھانے سے بھی ختم نہیں ہوتی پھر جانے کب آنا ہو آپ کی کچھ خدمت ہی کر لوں۔“

”تو بڑے اچھے گھر کی ہے بیٹا.....! بڑے کرم ہیں تیرے۔“ وہ بولیں۔ بڑا آرام مل رہا تھا انہیں۔

”اچھے گھر کی ہونے سے کیا ہوتا ہے اماں.....! دنیا نے میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو نغمہ، نیلو، سانوری اور ریشم کے ساتھ کیا۔ ان میں سے تو کئی ایسی ہیں جنہیں بڑے بھگالائے ان کی پیدائش ان کے گھرانوں پر ایسی قیامت بن کے نہیں ٹوٹی کہ باپ ہی چلتا ہے۔ میرے باپ کی غیرت یہ گوارہ ہی نہیں کر سکتی کہ اس کے گھر میں بھی کوئی بھڑا جہنم لے سکتا ہے۔ بڑا مان تھا انہیں اپنی مردانگی پر جانے میری ماں کو مجھ سے اسی کارن نفرت ہوئی ہو کہ ابانے اماں سے یہ کہا کہ وہ بھڑا پیدا نہیں کر سکتے۔ بڑی مردانگی ہے ان میں۔ یہ ضرور کسی اور کا گناہ ہے.....! اماں یہ الزام سن کر کچھ اور تو کیا رایا ایک کرتیں مجھ سے نفرت کرنا انہیں آسان لگا جو انہوں نے کی.....“

”بس تو بھی.....! باولی ہے ایک ذرا سی چوٹ پڑتی ہے اور شروع ہو جاتی ہے۔ ممتاز تیار رہی مگی کہ تیری ماں تیری روٹی پکانا کبھی نہیں بھولی تھی اور مرنے سے پہلے مجھے اس نے ایک راز بھی بتایا.....! اوہ.....“
”راز.....! کیا راز؟“ اماں.....! چپ کیوں ہو گئیں؟ بولو نا۔“ میں بے چین ہو گئی۔

”بتاتی ہوں بتاتی ہوں یوں بھی اب ممتاز تو رہی نہیں۔ تو بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ اری، ممتاز نے تیرا گھر ڈھونڈ نکالا تھا، وہ تیری ماں سے ملی تھی اور پھر وہ جب بھی جاتی تو تیری ماں تیری دیکھ رکھے کے لیے ہزار دو ہزار سے بڑا دیتی تھی۔ تیرا

حال بھی پوچھتی تھی۔“

”ہائے اماں.....!“ میں نے بڑے دکھ سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اماں نے مجھے پکار کے اپنے پاس اپنے سامنے بٹھایا۔ اوروں کی ماں کا تو پتا نہیں پر تیری ماں نے تجھ سے کبھی نفرت نہیں کی۔ میری بچی! وہ مجبور تھی۔“

”اماں جی.....!“ بھل بھل کر کے میں رو پڑی۔

”یہ جو تم لوگ منوں منوں کے حساب سے میک اپ تھوپتی ہو رنگ برنگے کپڑے پہنو ہو بڑے خرچے ہیں ان سب چیزوں کے کھانے پر اتنا خرچ نہیں ہوتا جتنا ان نام بھاموں میں لگ جاتا ہے پھر بھی ممتاز کچھ نہ کچھ چھوڑ گئی ہے تجھے بھی ضرورت پڑے تو مجھے کہنا۔“

”جی! چل اب یہ رونا دھونا بند کر روتے سے کچھ بدلتا تو ہم سب باجماعت روتے۔ دنیا ویسے کے ویسی اور سب کچھ اپنی جگہ پر.....“

اماں نے مجھے زبردستی کھانا کھلوا یا اور کچھ ہی دیر میں ان کی داستانوں کا ایسا طویل سلسلہ چلا کہ اماں نے جس صدمے سے ماضی ادھیڑا اس سے زیادہ دلچسپی سے ہماری سب کی باتیں سنیں اور اس وقت تو ہم سب کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا جب اماں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”اری..... کوئی ایسا مردوان نہیں ملتا تم لوگوں کو جو مجھ جیسی بوڑھی سے دل بستگی کرے؟“ اماں نے جس بھی سلیقے سے اپنے مطلب کی بات کہی مگر اس کا مفہوم تھا بڑا ہی مضحکہ خیز۔ ہائے بے چاری اماں.....!

میں واپس آئی تو ریشم گھر میں اندھیرا کیے پڑی تھی۔ میں نے بتی جلائی تو اس کے کھلے دیووں سے جھانکتی ویرانی پوری طرح مجھ پہ عیاں ہو گئی۔

”کیوں نہیں ملا؟“

”ملاقات۔“

”پھر ایسی اداس کیوں؟“

”وہ آج میرے ساتھ سونے کو نہیں مانا۔“

”بڑی جلدی دل بھر گیا؟“

”نہیں دل بھرا نہیں دل بدل گیا.....“

”مگر میں تو اماں کے پاس تھی؟“

”تو ہوتی بھی تو فرق نہیں پڑتا تھا۔“

”مطلب؟“ میں ہوتی بنی اس کے سامنے بیٹھی۔

”وہ اپنا ہی جیسا لوٹ لایا تھا ساتھ.....“

”ہائے دیا.....“

”ہاں زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے منہ پر کپڑا ڈھنک لیا اور میں سوچوں کی پتیلیوں میں بھٹکتے لگی۔ بڑے دن بعد مجھے پھوپھی زاد نند یاد آیا جس نے سب سے پہلے مجھے بھجوا سبھا تھا۔ ماضی میں دوڑتے دوڑتے آپا ساجدہ کی یاد نے بڑی شدت سے دل کے دروازے پر دستک دی۔ اماں پر بھی بہت پیارا آیا جو مجھے ختم دے کا پورا خراج ادا کرتی رہیں۔ شوہر کھویا، بد چلتی الزام سہا اور بعد میں بھی میری دیکھ رکھ کے لیے اگر بڑی میں ’کینر‘ بولتے ہیں تا اس کے لیے باقی ممتاز کو پیسے دیا کرتی تھیں۔ زندگی میں کچھ بھی تو اچھا نہ تھا جو سچا ہو سوائے چند اچھے دنوں کی یادوں کے باقی ساجدہ سے ملنے کو بڑا من چاہا مگر مجھے معلوم تھا اور ڈھیروں آرزوؤں، تمنائوں کی طرح اس آرزو نے بھی کبھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ بھجروں میں کوئی بھلے ہو نہ ہو مگر یہ انہیں اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے کہ ان کے اپنوں سے ملنے کی انہیں کوشش بھی نہیں کرتی چاہے۔ جن کی زندگیاں پوری ہوں ان کا ادھروں سے کیا سببندہ؟ بس اتنا ہوا کہ ان یادوں کی خارزار جھاڑیوں سے اچھے اچھے مجھے اسد کی

ہول گئی اور میں آپا ساجدہ کی باتیں یاد کرتے کرتے رو گئی۔

صبح اٹھ کر پھر سے کام پہ جانا تھا سو بے دلی سے کار ہوئی۔ کوئی بھی آج ساتھ چلنے کو تیار نہ تھا سب بہت تھکے ہوئے تھے مگر مجھے لگا کہ جیسے دل کہتا ہو چل! وہاں۔ میں نکلی۔ معمول کی طرح اپنے اڈے پر پہنچی اور اس وقت میرے پیروں تلے زمین ٹھسک گئی جب مجھے اپنے اڈے پر دو بڑے کٹے بھجروے بھیک مانگتے ملے۔ شوشوں کر کے گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

”یا اللہ! یہ کون ہیں؟ بڑی بے ایمانی اور دغا بازی ہے جو ہمارے لوگوں میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔“

میں نے قریب پہنچ کر انہیں غور سے دیکھا وہ نظریں چرانے لگے۔ ان میں سے ایک کچھ زیادہ خوبصورت تھا۔ اماں کے ڈیرے پر تو ان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی؟ وہ دونوں ہی نئے اور اچھی شکلیں تھیں۔ آخر میں نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا۔

”کیوں ری چھمک چھلوتو کہاں سے آئی؟“

”اے ہی میرے اڈے پہ کیوں قہقہہ کر لیا؟“

میرے پوچھنے پر وہ ایک دم ٹھہرا گئی۔ ”اڈہ..... کیا اڈہ؟ تمہیں بھیک مانگتی ہے تو تم بھی مانگ لو اس میں اڈے والی کون سی بات ہے؟“

”اوئی دیا..... اری! کیا نئی ہے اس دھندے میں؟ کہاں سے گری ہے سیدھی میرے اڈے پر؟“

”اے جانتی کہ پولس والوں سے لے کر ایک ایک کاری والے کو جاتی ہوں میں۔ سب کو خوش بھی کرنا پاتا ہے کبھی مال سے اور کبھی..... تو بول تو نے کیسے اٹھایا میرا اڈہ؟ کس نے لگایا تجھے یہاں اور یہ بڑے ساتھ کون ہے؟“

”کس نے لگایا؟ مطلب؟“ اس کی آنکھوں

غزل

دیکھیے دیں گے جب سبھی کاندھا کون دیتا ہے آخری کاندھا

بھگ اے میرے مہرباں نکلیے! جب میر نہیں کوئی کاندھا

بوجھ سا کیا ہے چار پائی پر؟ کیوں بدلتے ہیں آدمی کاندھا

لوریاں سن کے جس پہ سوتے تھے یاد آتا ہے آج بھی کاندھا

ہوش لٹنے سے گھر پہنچنے تک دان کرتی ہے شاعری کاندھا

جوڑ کر رونقیں بڑھاتی ہے گھر کے کاندھے سے تیرگی کاندھا

راول کرم پوری

انک جھنگ باتی ہے

قابل اجیری کا خیال

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

وقت اور حالات سے نبرد آزما ایک حوصلہ مند کی کہانی

میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں اور صبح و شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ تو رہ نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں تو کیا ہوا؟ سونے کے لیے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کئی ہوائی ٹانگ دیکھ کر رحم نہ کھائیے

نہیں صاحب کوئی شکوہ نہیں رشتے داروں
توں دشمنوں تعلقات والوں افسروں مالکوں
کی سے کوئی شکایت نہیں ہے نہ سرکار سے کوئی گلہ
نہ خدا اللہ میاں سے کوئی شکوہ۔ وہی ہوتا ہے جو منظور
ہوتا ہے۔ قسمت کا لکھا کون کیسے مٹا سکتا ہے؟ سو



چھین لیا گیا..... اب کئی سالوں سے اس تیزی سے
یہ قبیلہ بڑھ رہا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ لوگ ہجڑوں کی
پیدائش کو معیوب سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ ناحق میرے
باپ کی جان گئی۔

کہانی کے انت پر سورج کی سواری اوجھل
ہونے لگی۔ میں نے اسے روکا۔
”الماس..... یہ لیتی جاؤ۔ 500 کا ایک نوٹ
اس کی طرف بڑھاتے میں نے کہا۔
”میرا ایک کام کرو گے؟“ وہ بولی۔
”ہاں بولو۔“ میں نے کہا۔

”دعا کرنا اپنے خدا سے کہ تمہارا نوٹ ختم
ہونے سے پہلے میری زندگی ختم ہو جائے..... کیونکہ
اب مجھ میں اپنی کہانی کسی اور کو سنانے کی ہمت نہیں
اور 500 کا نوٹ.....؟“ کہتے کہتے اس کا گلہ رندہ
گیا۔ طویل ہڑک پر وہ چلتی گئی۔ راستے میں ملنے
والے جتنے بھی مسافروں کے آگے اس نے عادات
ہاتھ بڑھایا بھیک مانگنے کو ان سب نے اس سے
معذرت کر لی۔
گئے دتوں میں ان کی بددعاؤں سے ڈرتے
تھے لوگ اب تو.....

ہزاروں سوال اور بدلتی ہوئی دنیا..... الماس
میری نظروں سے اوجھل ہوئی۔ منظر در منظر آکھیں
دیکھا کیس۔ پردہ کھائی کچھ نہ دیا۔

مجھے لگتا تھا کہ اس کہانی کے اور بھی کئی کردار ہیں
جن میں ریشم، نیل، سانوری اور نعمت نامی خواجہ سراؤں
سے بات ہونا ان کی کہانیاں جانتا از بس ضروری ہے
کیونکہ یہ الماس کا گروہ ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟ سنیں
گے اس داستان کے بانی اور اوراق میں کیا لکھا ہے؟
تو پھر اگلے مہینے تک تھوڑا سا انتظار کر لیجیے۔

”اماں جی کا علاقہ ہے یہ سب اور ان کی
اجازت کے بغیر کوئی سکتل ہرا نہیں ہوتا، سمجھی؟ پچی
نہیں تو.....“

”اچھا.....“ کتنے ہی زخم تھے جو اس اچھا کے
اندر سلے ہوئے تھے۔

”چل اب پریشان مت ہو۔“ مجھے اس پر ترس
آ گیا۔

”میں اماں جی کے پاس تمہاری رجسٹریشن کرا
دوں گی پھر پولیس اور کیٹی ڈالے بھی کچھ نہیں کہیں
گے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا، چپ رہا۔ میں ابھن
میں تھی پھر اس نے اپنے سامھی کو بھی بلا لیا اور ان
دونوں نے مجھے جو کہانی سنا دی وہ میرے لیے دنیا کی
سب سے بڑی حیرت اور دکھ تھا۔ وہ دونوں ہجڑے
نہیں تھے بلکہ بنے ہوئے تھے۔ وہ صحیح لڑکے تھے۔
بچپن کی خاطر انہوں نے یہ سوانگ رچایا تھا اور
دوسری وجہ ان کے مجھے ریشم غریب کی ہونے والی
بے عزتی صرف اپنے منہ پر پڑے طمانچے کی پہلی
قط محسوس نہیں ہوئی بلکہ اپنے پیٹ پر پڑنے والی
لات کو بھی میں اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ دنیا پھر
بدل رہی تھی۔ اماں کو محلوں اور بادشاہوں کے
اچڑنے کا غم تھا پھر وہ مخفیل بھی تاراج ہو گئیں مگر یہ
سکتل کون سے طوفانوں کی زد میں آ گئے؟ کیا اب
ہجڑوں کے حصے کی بھیک بھی انہیں نہ ملے گی؟
تاہو تو ڈر سے ان پتھروں نے مجھے ابھان کر دیا۔

”ارے اللہ میاں! اب ہجڑے بنانے والی
تمہاری فیکٹری بند ہو جانی چاہیے کہ دنیا والوں نے
خود ایسے کارخانے کھڑے کر دیئے ہیں جہاں سے
ہجڑوں کی پوری کی پوری فوجیں تیار ہو رہی ہیں۔ نہ
رجاؤ سے تاراج ہوئے نہ شاہوں سے ان کی
بادشاہی چھینی گئی پھر بھی ہجڑوں سے ان کا ہجڑا پن

صاحب! خدا کا شکر ہے دوسری ٹانگ تو صحیح ہے۔

بچ پوچھے تو صبر ہی غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ صبر ہماری عورتوں کا زیور اور ہمارے بچوں کا کھلونا ہے۔ آپ مخلوق، جنٹلوں میں رہنے والے صبر کے فائدے کیا جانیں؟ سوکھی ہوئی روٹی کو چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مسلم کا مزہ آتا ہے پھر سرنگ کے کنارے صبر کی مٹکی گلدی بچھا کر اوپر سے صبر کی ریشمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ، نواب کو نہ آتی ہوگی اور جب مشین میں آ کر میری ٹانگ کٹ گئی اور مل مالکوں نے ہر چاند دینے سے انکار کر دیا تو میں کباڑی کے ہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اچھلتا کودتا لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے ہاں پہنچا جو فطری ٹانگ بنانے میں مشہور تھا۔ اس نے ریڑی کی ٹانگ لگانے کے لیے ہزار روپے اور لکڑی کی ٹانگ کے لیے پانچ سو مانگے اور میری جیب میں صرف سات روپے نکلے تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ریڑی کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی صبر کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک انہی ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور صبر کی ٹانگ سے گزارہ کر رہا ہوں۔ صبر ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب! اللہ نے ہاتھ تو دیئے ہیں، کوئی دیئے ہیں۔ وہ سامنے دیکھیے رولڈو کی تو دونوں ٹانگیں بے کار ہیں پھر بھی ہاتھوں اور کلبوں کے ساتھ مزے سے گھسٹ گھسٹ کر چل لیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے ٹانگوں کے ساتھ ہاتھوں پر فلاح نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی سے مجھے باپ سے صبر کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاءے ہیں صاحب! یوں ہم مسلمانوں میں ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں مگر امیری، غریبی، اونچ نیچ، شرافت، رذالت بھی تو اللہ کی بنائی

ہوئی ہیں اس لیے میرے باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنا درجہ بھی نہیں بھولنا چاہیے اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریفوں کے لوٹوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو خاں صاحب، ہر سید کو میر صاحب، ہر بیٹے کو لالہ جی، ہر برہمن کو پڈت جی اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر کو یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو سرکار کہتا تھا مگر وہ سب اسے بندو جولاہا کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان امیر شریفوں کے بچوں کو اچھے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لیے اسکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چلتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں مگر باپ ہمیں سمجھاتا۔ ”بیٹا! اپنی اوقات کبھی نہ بھولی چاہیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے اسی پر شکر سے صبر کرنا چاہیے، نہیں تو کوا چلاؤ بس کی چال والی کھاوت ہو جائے گی۔“ میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں۔ جیسا بھی موقع ہوتا وہ فوراً کوئی نہ کوئی کہاوت سنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے جب ہم شہر کے ایک آڑھتی پنپے کے لیے کھل بنا کرتے تھے وہ ہمیں اون اورنی کھل ڈیڑھ روپے کٹائی اور بنائی کا دیتا اور پھر وہی کھل دس روپے، گیارہ روپے میں بازار میں بیچتا۔ ہاں! ایک برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے ہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولایت اور جاپان سے مشین سے بنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کھل سستے داموں آگئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کھلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کھل دن بے پڑے ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کھلوں کی انجنیسی لے لی تھی۔ ہاں تو جب بابا کو پچاس ساٹھ کھلوں کی بنائی نہ ملی تو وہ بے چارہ ہمارے لیے کپڑے کہاں سے لے آتا؟ وہی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھو کر دے

دیئے۔ جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچھیں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو ہمیں بڑا رون آ یا پر بابا نے کہا۔ ”ارے روتے کیوں ہو؟ وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست۔“ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن جب میں کبھی کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑفون کرتے دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب! تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کھل بیٹنے کا کام کرتا رہا مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا تو میرے باپ نے نمبردار سے سفارش کر دیا کہ مجھے تحصیل دار صاحب کے ہاں نوکر رکھا دیا۔ تحصیل دار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک جنگل میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے، خان قدرت اللہ خاں نام تھا ان کا بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی موچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جائے۔ شہر بھر ان سے کانپتا تھا۔ ان کے ہاں بس میں ایک ہی نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چہرے ہی بھی پچھری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے مگر گھر کا سب کام کاج بھی کوکرنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے ایک بڑھیا دو وقت آ جاتی تھی مگر جھاڑو دینا، روز کرے کی میز کرسیاں جھاڑنا پونچھنا، تحصیل دار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا، برتن دھونا، بستر بچھنا، بازار کا سودا سلف لانا، یہ سب میرا کام تھا اور ہاں! ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھا وہ تھا تحصیل دار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اسے اسکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دور نہیں تھا۔ جنگل سے بمشکل آدھے میل اور گاؤں کھیتوں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم مگر تحصیل دار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ ان کی

ہجیر

ترہتا ہے

سکھتا ہے

ترستا ہے

مگر!!

اُسے کہہ دو

کسی کے ہجر میں کون مرتا ہے

ثانیہ بیٹی

بیٹی کتابیں اٹھا کر جائے اس لیے بانو کو اسکول پہنچانا اور واپس لانا میرا فرض تھا اور بچ پوچھے تو سارے کاموں میں یہی کام مجھے سب سے اچھا لگتا تھا۔

ان دنوں میں کوئی سترہ برس کا ہوں گا صاحب! خدا کے فضل سے ناک نقشب بھی برا نہیں تھا، صحت بھی ماشاء اللہ اچھی تھی پھر تحصیل دار نے دو چار پرانی قمیصیں اور شلواریں بھی دے دی تھیں جنہیں میری ماں نے کونٹھ کا گتھ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال کر میں بھی اچھا خاصا جٹلمیں لگتا تھا۔ بانو اسکول تو برق اور تھ کر جاتی تھی مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیل دار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کڑتھے مگر ان کا کہنا تھا کہ نوکر کوں سے کیا پردہ؟ یا گھوڑے سے کیا پردہ؟

ہاں تو صاحب! بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی کوئی پردہ یا سولہ برس کی ہوگی۔ ساتویں کا امتحان دینے والی ہوگی۔ اس کا حال کیا بتاؤں؟ آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے پر یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔

رنگت ایسی جیسے میدہ اور شہزادے کی ریشمی برقع میں منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو۔

لے گئی اور وہیں چھپر کھٹ کا پایہ اٹھا کر اس کے نیچے دبا کر خود چھپر کھٹ پر چڑھ بیٹھی اور کہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی، ناک نہیں گئی، میں تجھے نہیں چھوڑوں گی، پر بانو بھی ہٹ گئی تھی، دانت بھیچنے رہی، نہ رونی، نہ سکی، نہ لگی۔ جب خانم کا پیر رویا تو وہ خود ہی اٹھی۔

میں ہانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب الٹ دی۔
 پلنگڑی پلنگڑی کھیتوں میں سے جاتا تھا۔
 "مہمہ یوں تو میں مر جاؤں گی۔"
 میں نے کہا "ہاں چھوٹی بی بی! یہ خاتمہ بڑی ظالم ہے۔"
 "کہ؟" یہ کہہ کے اس نے میری طرف یوں
 لہر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا۔

”خفیصل دار صاحب سے کیوں نہیں شکایت
 کرتے؟ تمہارے باپ ہیں آخر؟“
 ”ابا سے شکایت کی تو یہ ڈانٹ مجھے جان ہی سے مار
 دے گی اور پھر لبا میری بات کیوں مانیں گے؟ تم نے
 لبا نہیں ان کے سامنے چلنے کی باتیں کرتی ہے؟“
 ”پھر؟“ اس بار میں نے سوال کیا۔

گے کہ سر پر بال نہ رہے گا۔
وہ تو خیر ہوئی سر کاڑھتے میں سامنے اسکول
کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا اور بانو نے جھٹ سے
نقاب گردی پھر آہستہ سے مجھ سے بولی۔ ”چھٹی
چار بجے ہوگی پرتو تا نکاح تین ہی بجے لے کر آ جائیو۔
ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتی ہے بس آج میں گھر
واپس نہیں جاؤں گی۔“

ماسٹر پاس سے گزر گیا تو میں نے چپکے سے کہا۔
 ”بی بی! ایسی باتیں مت کرو، تحصیل دار صاحب کو پتا
 چلے گا تو میری کمال بچھ دیں گے۔“
 وہ بولی۔ ”ارے تو مرد ہو کر ڈرتا ہے؟“ اور
 برقع میں سے کسکی آواز آئی۔ ”عمدو! اگر تو ناکا تین
 کھانے کے لئے اپنا بھائی کو بلاتا تو کچھ ہوا کرتا۔“

سچی کہانیاں 135

جنھوڑا پر جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ چھوا اس کی چیخ نکل گئی۔ ”ارے“ تجھے تو تیز بخار ہوا ہے۔ لیبر یا کھین پلک تو نہیں ہے؟ گھر میں آج ہی مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔“ اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا جیسے میں ہی مرا ہوا چوہا تھا اور فوراً جا کر کاربولک سے ہاتھ دھوئے لگی تو سرکار خدا جو کچھ میری کمرے کے بندے کی بھلائی ہی کے لیے کرتا ہے۔ مجھے پلک تو نہیں ہوا پر لیبر یا بخار جو اس دن چڑھا تو اس نے ایک مہینے تک نہیں چھوڑا۔ میں ادھ موا تو ہو گیا مگر تحصیل دار کے ہشروں سے میری چڑی بچ گئی۔ خانم نے تو اسی وقت مجھے چڑی کے ساتھ گھر بھجوا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بس اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار ہوتے ہوں۔ گھر بیٹھتے بیٹھتے مجھے تو سرسام کا دورہ پڑ گیا اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کر رضائیاں اور رکڑے میرے اوپر ڈال دیئے پھر بھی لپکتا نہ گئی اس بخار کی حالت میں بھی سرکار کاٹو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بے ہوشی میں بھی بار بار یہی چلاتا رہا۔ ”چھوٹی بی بی تم گھبرانا مت میں پورے تین بجے تا نکالے کر آؤں گا۔“ یہاں تک کہ میرے باپ نے مجھوڑا کھادیا کہ اب کیا تا نکالے گا بڑبڑا رہا ہے؟ کہیں گرمی تو دماغ پر نہیں چڑھ گئی؟ مہینے بھر کے بعد چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو سنا کہ تحصیل دار قدرت اللہ خان کی بدلی سہارن پور ہو گئی۔

ان کی جگہ کوئی اور تحصیل دار آیا پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ خاں صاحب کی ترقی ہو گئی اور اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے۔ سرکار سے تنخواہ بھی کافی ملتی ہے جیسی تو خاں صاحب نے سہارن پور جاتے ہی موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟ تو بات یہ ہے سرکار کہ اچھا ہونے کے دو چار مہینے بعد

میں لالہ گردھاری مل آدھتی کی غلے کی دکان پر اپنا کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ ایک دن میں کیا دیکھا کہ سہارن پور سے کوئی زمین دار غلام نواب علی ملنے آئے تو کہنے لگے۔ ”لالہ سنا تم نے تمہارے ہاں جو تحصیل دار قدرت خاں تھا نہ.....“ یہ نام کن کر میرے تو کان کھڑے ہو گئے اور پورے کے پیچھے سے دھیان دے کر سننے لگا۔ لالہ بولے۔ ”ہاں وہ نواب تہلہ ہاں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے اب تھے نہ بڑے ٹھٹھ ہیں موٹر بھی رکھ لی ہے۔“

غلام نواب علی نے کہا۔ ”ارے لالہ یہ موٹر کی برکت ہے موٹر کی اور تعلیم کی۔“

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ لالہ جی بولے۔ ”غلام صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟“

غلام صاحب نے کہا۔ ”لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خاں صاحب قدرت اللہ خاں کی لوٹریاں کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔“

میں نے اپنے دل کو لالہ سمجھایا کہ اب تجھے خوش ہونا چاہیے کہ خاں صاحب کے ہنر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے تو تو صاف بچ گیا مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار؟ جی بات یہ ہے کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک کام نہ ہو سکا اور اس رات جب ماں نے روز کی طرح پھر بندی جولائی سے میرے پیادہ کی بات چھیری تو میں نے بھی کہہ دیا۔ ”اچھا ماں! اتنی مرضی۔“ صبر عجیب چیز ہے سرکار! انسان کو اپنا قسمت پر صبر شکر کرنا چاہیے تو پھر یہی فٹ پاتھ پھر بھی بھل کے گدے بن جاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں بندی شیدی جولائی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھی نہیں تھا کہ شیدی کے ایک بچہ ہو گیا۔ اگلے برس ایک پھر تو سرکار نمبر لگ گیا۔ پانچ برس میں پورے پانچ بچے تین لڑکیاں دو لڑکے پرخدا کی مرضی میں گئے

ہے اور سارے کلکتے، بمبئی کی سیرمفت کرتے ہیں وہ الگ۔“ یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا۔ ”بھیا رحمت ایک بار کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔“ سومر کا سوڈا لیمن پیتے پیتے میں بھی کلکتے پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دلی بھی نہیں دیکھا تھا کلکتہ دیکھ کر آ نکھیں پچھنی کی پچھنی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں یہ موٹریں بس ٹرامیں میں نے پہلے کہاں دیکھی تھیں؟ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت ہے جو اور بمبئی رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے آج تک کلکتے سے باہر قدم نہیں بھرا۔

پہلے تو کئی مہینے رکشا چلاتا رہا۔ دن میں بھی دوڑھائی روپے بھی مل جاتے تھے۔ میں نے سوچا یہ کام تو بہت اچھا ہے مہینے میں ساڑھ ستر روپے مل جاتے ہیں۔ مزدوروں کے محلے میں ایک کٹھری لے لی تھی۔ دس روپے اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی دس پندرہ بیوی کو بھی بھیج دیتا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اس پر کیا گزری؟ جوان آدمی تھا سرکار اور پھر کلکتے میں سونا گاچی بھی تو ہے جی ہاں سرکار سونا گاچی..... تو پھر ہزار میل دور بھیگی بد صورت بیوی کو روپیہ بھیجتا تو بڑا مشکل ہوتا ہے اور پھر داروپینے کی بھی عادت پڑ گئی تھی سرکار آپ کہیں گے یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لیے تھوڑی سی دارو ضرور چاہیے اور پھر دارو کے بعد جانے کیسے جیڑا آپ ہی آپ سونا گاچی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلایا۔ کوئی سو سو سو روپے آڑے وقت کے لیے جمع بھی کر لیے پر یہ پتا نہیں تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آ پینچے گا۔ برسات کے دنوں میں بھیگ کر بخار چڑھا بخار سے نمونہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”رکشا کھینچتے کھینچتے پیچھوڑے کمزور ہو گئے

ہے اور سارے کلکتے، بمبئی کی سیرمفت کرتے ہیں وہ الگ۔“ یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا۔ ”بھیا رحمت ایک بار کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔“ سومر کا سوڈا لیمن پیتے پیتے میں بھی کلکتے پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دلی بھی نہیں دیکھا تھا کلکتہ دیکھ کر آ نکھیں پچھنی کی پچھنی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں یہ موٹریں بس ٹرامیں میں نے پہلے کہاں دیکھی تھیں؟ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت ہے جو اور بمبئی رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے آج تک کلکتے سے باہر قدم نہیں بھرا۔

ہیں یہ کام چھوڑ دو۔“ پورے ڈیڑھ مہینے کھات پر پڑا رہا۔ جب بخار نے چھپا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جتھا جو کچھ تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمو بے سے مرانہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں، لعنت بھیجور کشا پر چلو اور کوئی کام کریں گے۔ کلکتے میں جہاں خدا تئیں لاکھ کروڑی دیتا ہے، کیا مجھے ہی نہ دے گا؟ اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھا رہا۔

میری برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہرنام تھا بلند شہر کا باپ نے ساری جائیداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں، سو وہ اب کارخانے میں مزدوری کرتا پھرتا تھا۔ ایک بنارس کا چھار تھا منگو، ایک پبلی بھیت کا مسلمان تھا رحمت خان اور مزہ یہ کہ تینوں میں گہری دوستی تھی اور تینوں ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اکیلے میں رحمت خان سے کہا بھی کہ تم ان کافروں کے ساتھ رہتے ہو۔ ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال نہیں؟ بولا۔ ”اس میں ایمان دھرم کی کیا بات ہے؟ مزدور وہ بھی ہیں اور میں بھی۔“

ان تینوں نے مجھ سے کہا کہ چل، تجھے اپنے کارخانے میں نوکری دلائے دیتے ہیں۔ دو روپے روز ملیں گے۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے رکشا کھینچ کر پیچھے دے کھوٹلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی ہے۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے میں لے گئے جہاں پٹ سن کی بنائی ہوتی تھی اور مزدوروں کے ٹیکے دار کو سب سردار سردار کہتے تھے میری طرف سے پانچ روپے رشوت بھی دے دیے پر مجھے نوکری بھی نہ ملی۔ دیوگک ماسٹر بولا۔ ”کام آج کل مندا ہے اس لیے ہم تو پہلے سے بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں، نیا آدمی کہاں سے رکھ سکتے ہیں؟“ اور میری جانب اشارہ کر کے بولا۔ ”پھر

اسے ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے کتنے ہی تو دن اسے کھینچے میں لگ جائیں گے۔“ میں واپس آ گیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا خدا کا کرنا کیا ہوا اسی دن اس کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا۔ ”بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا ان کی تنخواہ کم کرنی پڑے گی اس لیے ہم نے دو روپے گھنا کر ڈیڑھ روپے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ مزدوروں نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خان اور منگو دونوں کو ہڑتال کی باتیں کرتے سنا تو بولا۔ ”تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ آٹھ آنے کے لالچ میں ڈیڑھ روپے کی آمدنی پر لات مار رہے ہو؟ ارے بھائی، جو ملتا ہے اسی پر صبر کرو۔ خدا کی مرضی ہوگی تو مزدوری بڑھ جائے گی۔“ مگر ان دونوں پر تو ہڑتال کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خاں بولا۔ ”اس وقت ہم نے چپ چاپ پکار کٹوا لی تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے، سینے پر۔“ منگو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا کہ اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک پانچ موٹروں میں سے دو ایک بچ کیوں نہیں ڈالتا؟ سالا نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں جن میں سے ایک وہ لاتی میم بھی ہے۔

ہاں تو جب یونین والوں نے ہڑتال کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو ہڑتال میں شامل نہیں ہوئے تھے مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا کہ نہیں، نہیں، ایسے ہی گھومنے گیا ہو گا مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے

کپڑوں پر لگے کالک کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آ رہا ہے۔ منگو تو لگا ماں بہن کی گالیاں دینے مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا۔ ”کیوں ہرنام، یہ سچ ہے؟“

یہ سن کر ہرنام چلا کر بولا۔ ”ہاں ہاں، گیا تھا کام پر، کر لے جس کا جو بھی چاہے۔“

رحمت اب بھی دھیرے ہی سے بولا۔ ”اچھا، یہ بات ہے؟“ پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، اٹن کا ٹریک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑی خاموشی سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا، چپ چاپ جا کر اپنی چار پائی پر بیٹھ گیا اور حقہ کڑکڑانے لگا۔ ہرنام کی آنکھوں میں خون اتر آیا، ہاتھیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا مگر منگو بچ میں آ گیا۔ کالا کلوتا منگو تھا تو دبلا پتلا سا مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھر تیز بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اسے ایک لنگڑی جو دی تو چاروں خانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔ ہرنام سے کبھی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اب جو وہ اٹھنا سہلانا ہوا اٹھا تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے اس لیے اس بے چارے نے اپنی چیزیں اٹھ کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں پھر میرے پاس آ کر بولا۔ ”کیوں مدد تیرے ہاں آ جاؤں؟ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دے دیا کروں گا؟“

سرکار اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں میں ٹھہرا بے کار مجھے تو پہلے ہی فکر تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا؟ سو میں نے کہا۔ ”تو بے کھٹکے یہاں آ جا ہرنام“

میں نہیں ڈرتا کسی سے۔“ وہ جو کہتے ہیں، کر بھلا تو ہو گا بھلا، سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لیے کوٹھری میں جگہ دے دی اور اس نے اگلے ہی دن مجھے کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔

ہڑتال کی وجہ سے مالک ہر کی کور کھنے کے لیے تیار تھے، چاہے اسے کام آتا ہو یا نہیں، بس دو ہاتھ دو ٹانگیں ہونی چاہئیں، سو میں بھی ڈیڑھ روپے روز پر نوکر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے روپیہ اسٹرائیک الاؤنس ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی تھیں۔ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ بانی بند کر دیا تھا۔ دو ایک بار اینٹ پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے، پر میں نے سوچا جو بھی ہو، ہڑتال کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہو گا۔

ہاں تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا مگر مجھے کام آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام نے دیوگک ماسٹر سے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین سنہال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینیں کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ ہڑتال ختم ہو گئی اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسے ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو، تو یہی ظاہر کیے جیسا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی۔ میں برابر اسے دیکھتا رہتا اور جو وہ کرتا، وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے مٹن دبا یا، میں نے بھی دبا دیا۔ اس نے تیل کی کچی لے کر پرزے میں تیل دیا۔ میں نے بھی اسی کی طرح پرزے میں تیل دیا۔ اس نے مشین تیز کی، میں نے بھی کی۔ تین دن تو میں نے ایسے ہی گزار دیے۔ پکار تو ہفتے کے بعد ہفتے ملنے والی تھی مگر

کتنے ہی مہینے میں نے صبر سے بھیک مانگ کر جتا دیے ہیں۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزہ آنے لگا۔ نہ محنت نہ مزدوری نہ مالک مکان کو کرایہ دینا نہ چولہے جلنے کا بکھیرا فقیر کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں ضرورتوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہو گیا پر کئی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں کو تنگ کرتی ہے۔ جب میرے پاس پانچ روپے جمع ہو جاتے تھے میں رات کے وقت سونا گاچی بچھ جاتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں سرکار اس بازار میں امیر غریب، نواب، فقیر، سب برابر ہیں جس کی جیب میں دام ہوں وہ جو بھی چاہے خرید سکتا ہے۔ چاہے وہ لنگڑا لولا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔ جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے۔ میں بیساکھوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں وہیں جایا کرتا تھا۔ دو روپے میں کام ہو جاتا تھا مگر اس رات بوڑھی نانیکہ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر بولی۔ ”کیوں رے لنگڑے پھر آگیا؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا۔ گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں تو راستہ پکڑ۔“

ان دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی۔ چالیس کے نوٹ تو میں نے گدڑی کے اندر سے ہوئے تھے اور سات آٹھ روپے کے قریب اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں لنگڑا ہوں تو کیا پیسا میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ لڑکی دکھاؤ پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔“

پروہ بڑی گھاگھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی، مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں دھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیاں تو پھینک دیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لونڈیا کوئی بچ بچ ہی معلوم ہوئی تھی سر

جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”صورت تو دکھاؤ“ میں لنگڑا ہوں تو کیا ہوا آدمی ہوں۔ مگر اس نے گھونگھٹ اٹھا تو یقین مایے سرکار میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی۔ ”مردو.....!“

میں نے کہا۔ ”چھوٹی بی بی!..... تم کہاں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں مردو..... ایہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمہاری ٹانگ کیا ہوئی؟“

میں نے کہا۔ ”اور یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔“

وہ رورہی تھی۔ میں نے دلاس دینے کی کوشش کی تو بانو سکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ اتنی مدت میں اس کا وہ رنگ روپ نہ رہا تھا۔ میں آکس برس کی عمر کی تیس پینتیس کی لگتی تھی۔ آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے تھے۔ پاؤں سرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت پیلے تھی۔ دلی اتنی ہو گئی تھی کہ ہانہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جب آنسو کچھ دیر کو تھمتے تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا۔ جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگی تھی وہ بڑا بدعاش نکلا۔ کلکتے لاکر دو تین مہینے ہانوں کا زیور بچ کر خوب عیش کیا پھر جب گزارے کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے کرم پر مجبور کیا اور ایک دن اسے ایک سیٹھ کے ہاتھ بچ کر غائب ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”چھوٹی بی بی! تم نے پولس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی؟ تم تو بڑھی لکھی ہو۔ تحصیل دار صاحب کو لکھا ہوتا وہ آکر تمہیں لے جاتے اور اس سواری چڑی ادھڑ دیتے۔“

وہ بولی۔ ”پولس میں رپٹ لکھوائی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی واپس بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ مجھ پر گزر چکا تھا اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی؟“

مطلب یہ کہ بے چاری بانو ایک ہاتھ سے

دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخر سونا گاچی تک آن پہنچی جہاں قسمت اسی رات مجھے لے آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اب تم کوئی فکر نہ کرو جب تک مردو میں دم ہے، تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔ اب میں تمہیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے کزک میں نہ رہنے دوں گا۔“

وہ آنکھیں پٹی کر کے بولی۔ ”پر مردو میں بیمار ہوں بہت بری بیماری ہے۔“

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی جو بانو کا چاند جیسا مکھڑا داغ دار بنائے ہوئے تھی مگر میں نے کہا۔ ”کوئی پروا نہیں ہے میں بھی کون سا جھپلا جوان ہوں؟ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا، تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”آ جاؤ۔“ بوڑھی نانیکہ بولی۔ ”ابے لنگڑے..... پانچ روپے دیئے ہیں، کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ کوئی تیرا گھر نہیں ہے۔“ چچے ایک بیساکھ کا لالسا سٹرا آدمی نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور دوسرے سے بیساکھیاں اٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے اب یہ یہاں نہیں رہے گی۔ اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا؟ ٹھیک یاد نہیں شاید نانیکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ بانو کو پکڑنے کے لیے بڑھا۔ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے ایسی چیخ جو پتھر دل کو موم کر دے۔ نہ جانے کب اور کب میری بیساکھی ہوا میں ابھی اور اس شرابی کی کھوپڑی پر گر گئی۔ اگلے پل میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نانیکہ چلا رہی تھی۔ ”خون..... کوئی آؤ..... دوڑو..... اس خون کو پکڑو.....“ اور بانو ڈری اری آنکھوں سے مجھ دیکھ رہی تھی۔

”مردو.....! یہ تو نے کیا کیا؟“

میں کہہ رہا تھا۔ ”چھوٹی بی بی! تم فکر نہ کرو اس دن میں تا نکا وقت پر نہ لایا تھا یہ اس کی سزا ہے۔“

اور وہ دن اور آج کا دن دس برس قید کاٹی پرسوں ہی چھوٹا ہوں۔ اب پھر وہی سڑک کا کنارہ ہے وہی صبر کا فرش اور صبر کی چھت۔ سنتا ہوں ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہوئی ہے ہوئی ہوگی۔ سنتا ہوں لاکھوں مسلمان ہندو ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتے کی سڑکوں پر خون کے دریا بہنے لگے ہوں گے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا ہوا ہوگا۔ مجھے تو پتا نہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے اور بہت سے رحم دل بابو پاس سے گزرتے ہیں اور پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو جیب خالی پاتے ہیں۔

پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رولدو کی طرح بالکل اپانچ نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے۔ وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا وہی بانو ہے۔ بانو جس کی رنگت بھی ایسی تھی جیسے میدہ اور شہد اور جو بھی کالے ریشمی برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو۔ جس کی بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھیں اور جس کے بالوں کی بھین بھین خوشبو مست کرنے کو کافی تھی اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پنا پڑا ہے اور بہت دن ہوئے اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کے سکھ یاد ہیں اور نہ جوانی کے دکھ نہ تحصیل دار صاحب نہ خانم نہ مردو..... دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جوئیں مارتی رہتی ہے اور آپ ہی آپ نہ جانے کیا بوڑائی ہے؟

مگر شکر اللہ کا بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔

ایڈیٹس اور لیس مسج

نظر ثانی ہے مگر

سعدیہ حرم کا خیال

یہ وقت ہر انسان پہ آتا ہے کہ اکثر
آنکھیں تو کھا کرتی ہیں، لب کچھ نہیں کہتے

اپنی زندگی کی لاش کندھے پر اٹھائے پھرتی اک حرام نصیب کا المیہ ماجرا

بلند و بالا عمارات اور آدمیوں سے بھرے
پرے اس شہر کے مضافات میں ایک ساٹھ گز کاٹین
کی چھت والا بوسیدہ مکان میرے باپ کا بھی
تھا جس کے زنگ آلود پرانے داخلی دروازے پر
رنگ اڑی لکڑی کی تختی پر میرے دادا مرحوم کا نام
بھی اب دھندلا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی سیدھے



کمرہ جس میں ایک کونے پر رکھے سرخ رنگین
پاپوں والے پلنگ پر میری ماں ہر سال بچہ جتا کرتی
تھی۔ اماں اور ابا دونوں کو بچوں کا بڑا شوق تھا مگر
صرف پیدا کرنے کی حد تک ورنہ فیڈر بنانے سے
لے کر نہلانے دھلانے تک ساری ذمے داری
میرے سر تھی۔ بچے پالنے کے علاوہ گھر کا بیشتر کام
بھی میرے ہی ذمہ تھا۔

آٹھ نو برس ہی کی عمر سے میری ماں مجھے صبح
اپنے ساتھ ہی اٹھا دیا کرتی تھیں۔ اماں چائے کا پانی
چڑھا کر مجھے کھاتے کی کاپی تھما دیتی اور میں چاچا
حید اللہ کی دودھ دہی کی دکان سے دودھ اور پاپے
لینے جایا کرتی تھی۔ یہ میرے دن کا آغاز ہوتا پھر
بہن بھائیوں کو ناشتا کروانا اسکول بھیج کر برتن دھونا
جھاڑو پونچھنے سے فارغ ہو کر اماں کے سر میں تیل
گرم کر کے ڈالنا اور جوئیں نکالنا مجھے جوئیں نکالنے
سے سخت چڑھتی۔ پتا نہیں اماں کو کیا مزہ ملتا تھا ہر
دوسرے تیسرے روز بال کھول کر بیٹھ جاتیں میں
بے دلی سے لگی رہتی۔ شکر تو تب کرتی جب ایک بار
پھر مجھے راشن کے کھاتے والی کاپی دے کر احسان
بھائی کی دکان پر سودا لینے بھیجا کرتی تھی۔ ہمارے
ہاں دودھ دہی آٹا صابن ہر شے ادھار پر ہی آیا
کرتی تھی جو سب کھاتے کی کاپیوں میں نوٹ ہوتا
رہتا تھا۔

احسان بھائی کی دکان ہماری گلی کے ککڑ پر تھی۔
مجھے بہت پسند تھا ان کی دکان پر جانا۔ وہ مجھ سے پیار
بھی بہت کرتے تھے بلکہ دکان کے اندر ہی بلا لیا
کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے بھائی نہ کہا
کر۔ میں مصیبت سے آنکھیں پٹپٹا کر کہتی۔

”آپ تو بڑے ہو بڑوں کو تو بولتے ہیں
بھائی؟“
وہ ہنس دیتے اور مجھے خود سے لپٹا کر تین چار

بھیاں لے لیتے۔ مجھے نہ اچھا لگتا نہ برا۔ سودا دے کر
وہ مجھ سے پوچھتے۔ ”کیا لینا ہے؟“ تو میں اپنی پسند
کی چاکلیٹ یا بسکٹ کی فرمائش کر دیتی تو وہ مجھے
بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھا لیتے اور میں اونچے
فلیٹ پر سے خود اپنی مرضی سے چیز اتار لیتی۔

آن دنوں اتنی عقل کہاں کام کرتی تھی کہ احسان
بھائی ایسا صرف دوپہر کے وقت جب گلی میں کوئی
نہیں ہوتا تھا تب ہی کیوں کرتے تھے؟ اور دوسرے
گاہکوں کے سامنے مجھ سے سیدھے منہ بات تک
نہیں کرتے۔ خیر سیدھے منہ بات تو کبھی میرے
اماں ابا بھی ایک دوسرے سے نہیں کرتے تھے لیکن
رات بھی جو پانی پینے یا واش روم کے لیے اٹھتی تو
اماں اپنے بستر پر نہیں ہوتی تھیں اور ابا کی بیٹھک
سے دبی دبی ہنسی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔
میرے ذہن میں وہ تمام مناظر گھوم گھوم جاتے جو
میں نے اپنے ابا کے میسوری کارڈ والے موبائل پر
چوری چوری دیکھے تھے۔ میرے سارے بدن پر
چیونٹیاں سی رینگ جاتیں۔ اب میں اتنی بھی بچی
نہیں رہی تھی، اماں آج کل مجھے دوپٹہ
پھیلا کر اوڑھنے کا کہتی تھیں اور احسان بھائی اب مجھ
سے روز ہی ڈاکٹر ڈاکٹر کھیلنے لگے تھے۔ وہ ڈاکٹر
بننے میں مریض پانچوں انگلیاں جوڑ کر وہ ڈاکٹری
آلہ بنا لیتے اور میرے سینے کا چیک اپ کرتے
ہوئے بالکل ڈاکٹر کی طرح کہتے۔

”تیز تیز سانس لیں۔“
اور بھلا مجھ میں سانس رہتی ہی کہاں تھی وقت
گزرنے کے ساتھ احسان بھائی کی نوازشات
میں اضافہ ہو چکا تھا۔ چاکلیٹ بسکٹ کی جگہ اب
کریم لوشن اور نقدی نے لے لی تھی لیکن مجھے
احساس ہوا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے، میں ہشیار ہو گئی
تھی، ویسے تو اب دکان پر جانی ہی نہیں تھی، چھوٹے

نیا سال..... پہلی جنوری

انتہائی تیز سردی

دل اداس

بے چین روح

بکھری ہوئی سانسیں

بے ترتیب دھڑکنیں

یہی ہے نئے سال کا انعام

جنوری جب بھی آتا ہے

مجھے اداس کر جاتا ہے

وفا صدام حسین

شعوری اور غیر شعوری طور پر بالکل انہی جیسا ہو گیا تھا۔

ایک دن شاہجی سینٹر سے واپسی پر وہ مجھے اپنی ایک دوست کے گھر کا کہہ کر ایک گھر میں لے آئیں۔ عجیب سا گھر تھا، ٹوٹا پھوٹا، چھ سات عجیب و غریب سی عورتیں تھیں وہاں بس..... دو ایک سگریٹ پوکھتی کش باتیں کر رہی تھیں۔ میں گھبرا گئی مگر شاہانہ آنٹی کی ناراضگی کا خیال کر کے چپ رہی۔ وہاں میری آؤ بھگت ہوئی، میرا خوف اب قدرے زائل ہو چکا تھا۔ میں نے چلنے کا کہا تو شاہانہ آنٹی نے لیٹے لیٹے کہا۔ ”میں تو بہت تھک چکی ہوں، کچھ دیر آرام کروں گی، تم بھی برابر والے کمرے میں ذرا کمر سیدھی کر لو۔“

میں تو دیے بھی ان عورتوں کے عجیب انداز سے کوفت میں جٹا بھی لہذا دوسرے کمرے میں جانے میں ہی عافیت جانی۔ بستر پر لیٹے ہی مجھے لگا میں بھی بہت تھک گئی تھی، کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی، تبھی وہ پینتیس، چھتیس برس کا آدمی اندر آ گیا۔ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، وہ میری طرف بڑھا تو میں دروازے کی طرف بھاگی مگر تب تک باہر سے کنڈی لگ چکی تھی۔

شروع میں میں نے احتجاج کیا مگر پھر لذت گناہ میں ڈوب گئی اور سب کچھ لٹوا بیٹھی، ہوش تب آیا جب دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل گیا۔ میں بری طرح رو رہی تھی، چیخ رہی تھی مگر جلد ہی میرا منہ ٹونوں سے بھر دیا گیا۔

”گنواں کو تمہارے پندرہ دن کی تنخواہ سے زیادہ ہی ہوں گے۔“ شاہانہ آنٹی کہہ رہی تھی اور مجھے کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔

اب یہی میرا کام ہے، میں ہر روز صبح گھر سے

نہیں جانتی، بس ایسا ہے کہ بڑی ہی کشش تھی اس میں، میں پور پور نشے میں ڈوب جاتی۔ ان دنوں مجھ پر سنے جہانوں کے درواہ ہور ہے تھے، عجیب مستی تھی رگ و پے میں آنکھوں میں نشہ ہی نشہ تھا، مجھے ٹھک کے چلنا آ گیا تھا۔ احسان بھائی کی دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں جان بوجھ کر دوپٹہ سر کا دیا کرتی اور ترچھی نظر سے انہیں گھورتی گزرتی اور پھر گھر میں داخل ہونے تک اپنی پشت پہ چھپتی ان کی نظریں مجھے غرور میں جٹا کر دیتیں۔

طارق، عابد، سعد، امجد، الیاس، مبارک اور پیٹہ نہیں، کون کون سب میری محبت کے دعوے دار رہے اور میں بھی ان سے جھوٹی محبت کا ڈھونگ رچا رہی۔ بے چارے بے وقوف لڑکے پوری پوری تنخواہ مجھ پر لٹا دیتے تھے۔ ہا ہا ہا، ان میں سے کوئی بھی اب تک مجھے مکمل طور پر کھوج نہیں پایا تھا۔

زندگی شاید اسی ڈگر پر چلتی رہتی اگر میری ملازمت ختم نہ ہوتی۔ ٹھیک بند ہوا تو میں ایک بار پھر نوکری کی تک دو دو میں لگ گئی۔

دوسری مرتبہ نوکری آسانی سے مل گئی اور سینیں سے میری زندگی کا تاریک ترین دور شروع ہوا۔

جب میری ملاقات شاہانہ آنٹی سے ہوئی، چالیس کے پیٹے میں زیورات سے لدی پھندی زرق برق کپڑے پہنتی، اونچی آواز میں قہقہے لگاتی وہ عورت کسی طور فیکٹری ورکر نہیں لگتی تھی۔ اس کے پاس بہت مہنگا موبائل ہوتا تھا اور پرس ہمیشہ ٹونوں سے بھرا رہتا تھا۔ میں اب اپنی چھوٹی بڑی سب ضرورتوں کے لیے شاہانہ آنٹی سے ہی ادھار لیا کرتی تھی جو وہ کبھی واپس نہیں لیتی تھیں۔ انہی کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ سنیما پر فلم بھی دیکھی تھی اور بہت سارے شاہجی سینٹرز بھی۔

شاہانہ آنٹی کی میری زندگی میں آمد کے ساتھ ہی سب کچھ بدلنے لگا۔ میرا رنگ ڈھنگ، ہر انداز

بھائی بہن سودا سلف لایا کرتے تھے۔ کبھی ضرورت پڑ جانا پڑ بھی جاتا تو دکان کے اندر نہ جاتی تو وہ اندر بلا لے لیتے البتہ باتیں اسی طرح مشاعرہ کر کرتے۔ اس طرح میں احسان بھائی سے بچ تو گئی مگر کم عمری اور نادانی میں ہی جن لذتوں سے مجھے انہوں نے روشناس کروایا، اب میں کم و بیش انہی کی متلاشی تھی۔

ہم کل گیارہ بہن بھائی ہو چکے تھے۔ ابا کا نشہ انہیں لے ڈوبا تھا۔ گھر میں روٹیوں کے لالے پڑ گئے تو میں نے سولہ برس کی عمر میں گھر سے باہر قدم نکالا۔

ایک پرائیویٹ فیکٹری میں کروٹنگ کا کام تھا۔ میں بہت تھک جاتی تھی۔ پورا مہینہ جان توڑ محنت کرتی تو مشکل سے ساڑھے چار ہزار تک ہی بنا پاتی۔ ٹھیکے کا کام تھا، کچھ کم عمری، نا توانی اور نا تجربہ کاری تھی، گھر کا جھاڑو پونچھا کرنا اور باہر کسی فیکٹری میں کام کرنا، بہت الگ معاملات تھے۔ روز رات کو گرم پانی میں نمک ڈال کر پیر ڈبوئی تو پورا دن کھڑے رہنے سے جو سوجن ہوتی، آرام پا جاتی۔

اماں ابا کو اب بھی چین نہیں تھا، اماں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ میں بہت پریشان رہتی تھی، میری پریشانی کا احساس سب سے پہلے طارق کو ہوا۔ وہ میرے ہی ڈپریشن میں کام کرتا تھا۔ اونچے قد کے اس لڑکے کے خیالات بھی خاصے اونچے تھے وہ مجھ سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ فیکٹری کے بعد اکثر وہ مجھے کہیں گھمانے لے جاتا، کبھی آکس کریم پارلر پر، کبھی چائے چھو لے کھلانے، کبھی سی ویو وغیرہ۔ دیر سے گھر جانے پر پوچھ گچھ ہوتی تو میں چڑکھتی۔ ”اور نام تھا۔“

طارق، احسان بھائی سے زیادہ پر جوش تھا، مجھے اس کے ساتھ ہونا اچھا لگنے لگا۔ میں محبت کے معنی

مذہب ان کے برابر ہے، ایسی جان سوز کہانیاں جنہوں نے اس ایجاد جدید کے ذریعے جنم لیا

خلیل جبار

گر جو صلیے مضبوط ہوں

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

میں نے خود اس سے محبت کی سزا مانگی تھی
جس اتنا تھا کہ روزن سے ہوا مانگی تھی

محبت میں چوٹ کھانے والی ایک لڑکی کا ماجرا وہ مرنا چاہتی تھی

تھا وہ میرے لیے انجانا تھا۔ دل میں بے اختیار خیال آیا کہ بلاوجہ وقت ضائع ہوگا، کال کاٹ دوں پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے کس نے کس مجبوری کے تحت فون کیا ہو، میرے کلائنٹ مجھ سے واقف ہیں کہ دس بجے کے بعد میں کوئی کال اینڈ نہیں کرتا اس لیے اگر کسی نے اس وقت مجھے فون کیا ہے تو یقیناً اس شخص کو کوئی ضروری کام ہی ہوگا چنانچہ میں نے کال اینڈ نہ کر لی۔

”جی ہیلو.....“

”کیا آپ سید سرفراز علی ایڈووکیٹ ہیں؟“
دوسری طرف سے کسی خاتون کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”جی ہاں میں سید سرفراز علی ایڈووکیٹ ہی ہوں“
آپ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے

میں دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ میرا موبائل بج اٹھا۔ میں نے فائل دوبارہ میز پر رکھ دی۔ میرا اسٹنٹ آصف ظہوری چاچکا تھا اور میں اس وقت آفس میں اکیلا تھا۔ میرا آفس شہر کے مرکز گاڑی کھانا میں موتی محل نامی بلڈنگ میں واقع ہے اور میں مغرب ہوتے ہی اپنے آفس آ جاتا ہوں۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا آفس ہے جو مغرب کے وقت کھلتا ہے؟ دراصل میں پیسے کے اعتبار سے وکیل ہوں۔ صبح کا وقت مختلف عدالتوں میں مقدمات کے سلسلے میں گزرتا ہے۔ دوپہر میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں اور پھر شام میں اپنے آفس چلا آتا ہوں تاکہ صبح جن مقدمات کی پیروی کرنا ہے ان کی تیاری کر سکوں۔ رات تقریباً دس بجے تک میں آفس سے گھر کے لیے نکل جاتا ہوں۔
میں نے موبائل اسکرین پر نظر ڈالی جو نمبر آ رہا

کہ میں خودکشی کر رہی ہوں.....“ خاتون نے سچاٹ لہجے میں کہا۔

”بس یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟“ میں نے جھلاہٹ سے پوچھا۔

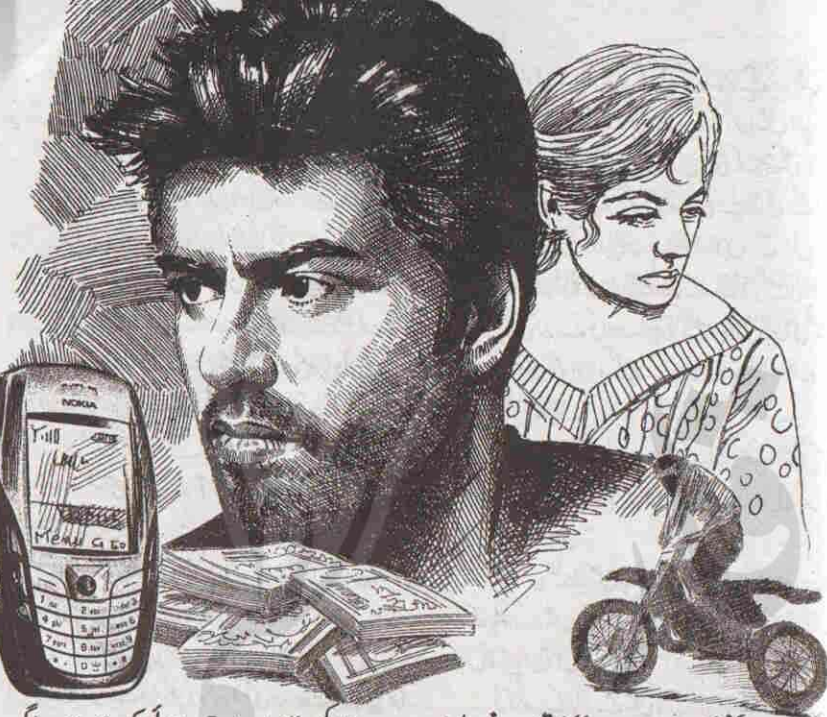
”ہاں یہی بتانا تھا۔“ دوسری طرف سے آواز ابھری۔ اس بار آواز میں درد و کرب نمایاں تھا۔

”دیکھیے محترمہ میں وکیل ہوں اور وکیل بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں لہذا آپ کے یہ بتانے سے کہ آپ خودکشی کر رہی ہیں مجھے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ جب میں آپ کو جانتا ہی نہیں تو پھر آپ خودکشی کریں یا نہ کریں مجھے اس سے کیا؟“ میں نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی بلکہ سنجیدہ ہوں کل صبح جب آپ اخبار پڑھیں گے تو اس میں کسی مظلوم لڑکی کی خودکشی کی خبر بھی پڑھنے کو ملے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سکیوں سے رو دی۔

”کیا آپ کو میرے رونے کا کوئی احساس نہیں ہے؟ آپ پتھر دل ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ عورت کے آنسو دیکھ کر مرد پھل جاتا ہے۔“ وہ مسلسل روئے جاری تھی اور اس کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میرا دل چاہا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر موبائل آف کر دوں لیکن مجھے اب اس کی باتوں سے کچھ



”دیکھیے آپا میرا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اگر آپ کو مجھ سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بتائیں ورنہ اس طرح کی باتیں کر کے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، ویسے میرا نمبر آپ کو دیا کس نے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا نمبر مجھے کسی نے نہیں دیا بلکہ یہ میں نے حاصل کیا ہے۔“

”آپ ہیں کون اور مجھے کیوں پریشان کر رہی ہیں؟“

”کیا آپ کو میرے رونے کا کوئی احساس نہیں ہے؟ آپ پتھر دل ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ عورت کے آنسو دیکھ کر مرد پھل جاتا ہے۔“ وہ مسلسل روئے جاری تھی اور اس کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میرا دل چاہا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر موبائل آف کر دوں لیکن مجھے اب اس کی باتوں سے کچھ

دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”آپ کی بات بجا ہے کہ عورت کے آنسو سخت سے سخت دل مرد کو بھی پگھلا دیتے ہیں، پہلی بات یہ کہ میں آپ کو جانتا نہیں ہوں اور مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ آپ خود کئی کیوں کرنا چاہتی ہیں، کوئی وجہ بھی تو ہوگی اس انتہائی اقدام کی؟“ میں نے کہا۔

”مجھے آپ کے دوست احمد نے دھوکہ دیا ہے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے، میرا دل ٹوٹ گیا ہے اسی لیے اب میں عینا نہیں چاہتی۔“

”احمد کون؟“

”وہی احمد جو آپ کے ساتھ اکثر تفریحی مقامات کی سیر کرنے جاتا رہتا ہے، کچھ عرصے پہلے تک سلطان ہوٹل پر جس کے ساتھ آپ کی نشستیں رہتی تھیں۔“ اس نے کہا۔

”اچھا، اچھا“ میں سمجھ گیا۔ ”احمد میرے کزن مقیم احمد کا دوست تھا پھر وہ میرا بھی دوست بن گیا تھا۔“ میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ گیا ہوں، آپ حوصلہ کریں، خود کئی کرنے کا ارادہ ترک کر کے نماز پڑھیں اور صبح نئی عبدالوہاب شاہ بابا کے مزار پر ضرور حاضری دیں۔ اس کے بعد مجھ سے رابطہ کر کے آفس آجائیں۔“ میں نے کہا۔

”میں وعدہ تو نہیں کرتی لیکن کوشش کروں گی کہ اپنے ارادے سے باز رہوں۔“ اس نے کہا۔ احمد کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا، وہ ادب و طبعیت کا مالک تھا۔ اس کی فطرت بھنورے کی سی تھی جو ہر گلی کارس جو سنے کا خواہش مند رہتا تھا۔

اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس نہیں آئی۔ اسی طرح پندرہ دن گزر گئے اور اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں بھی اس بات کو بھول گیا۔

ایک دن میں آفس میں اکیلا بیٹھا ایک فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے اسٹنٹ آصف ظہوری کو

کسی شادی میں شرکت کرنی تھی اس لیے وہ نہیں آیا تھا۔ اسی وقت ایک لڑکی میرے آفس میں اچانک آئی اور میرے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میں فائل کے مطالعے میں مرق تھا اس لیے لڑکی کے اس طرح کرسی کھینچ کر بیٹھنے پر چونکا۔ اس کے بال بے ترتیب سے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے، آنکھیں سوچی ہوئی تھیں، رونے کی وجہ سے آنکھیں لال ہو چکی تھیں بلکہ آنکھوں کو لال کہنے کے بجائے دہکتا انگارہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

”میرا نام بلقیس ہے۔ میں نے پندرہ دن پہلے آپ سے موبائل پر بات کی تھی۔“ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بولی۔

”کس سلسلے میں بات کی تھی؟ کیا کسی مقدمے کے بارے میں بات کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ میں اس کو پہچان نہیں پایا تھا۔

”احمد کے بارے میں آپ کو بتایا تھا کہ اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے اور میں خود کئی کرنا چاہتی ہوں۔“ بلقیس نے کہا۔

”ہاں، ہاں مجھے یاد آ گیا۔“

”میں آج آپ کو یہ بتانے آئی ہوں، سب کچھ ختم ہو گیا ہے، میرے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے، میری موت ہی اب تمام مسائل کا حل ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

”بلقیس صاحبہ، زندگی کوئی ایسی ویسی چیز کا نام نہیں ہے اس میں انسان کو کچھ بھی ملے ہیں اور دکھ بھی پریشانیوں نہ ہوں تو انسان کو خوشی ملنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا تم آگئیں، مجھے کھل کر بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ تم بار بار خود کشی کا ارادہ کیوں کر لیتی ہو؟ زندگی ایک بار ملتی ہے، صرف ایک بار اس لیے ہمیں اس کی قدر کرنا چاہیے۔“ میں نے

بلقیس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہاں، آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن میری بات سننے کے بعد بھی یہی کہیں گے کہ میں نے جو خود کشی کا ارادہ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔“

”میں بڑی توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔ بتاؤ، کیا مسئلہ ہے اور تمہاری دوستی احمد سے کس طرح ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک دن میرے موبائل پر کال آئی، میں نے ایک لمحے کو سوچا، کال انٹینڈ نہ کروں لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر کال ریسیو کر لی، وہ کال احمد کی تھی۔“

”جی فرمائیے، کس سے بات کرنی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ سے بات کرنی ہے۔“

”مجھ سے بات کرنی ہے، آپ ہیں کون؟“

”مجھ ناچیز کو احمد کہتے ہیں، فرصت میں ہوں سوچا، آپ سے بات کر لوں۔“ اس نے کہا۔

”مجھ سے بات کرنے کی بجائے اللہ اور رسول کو یاد کرو، مسجد میں جا کر نماز پڑھو۔ فضول میں اپنا اور دوسروں کا بھی وقت برباد کرتے ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔ مجھے رائیگ نمبر پر فضول گفتگو کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے رائیگ نمبر آنے پر میں اسی طرح کے لہجے میں بات کرتی تھی۔

”ارے..... ارے..... آپ تو ناراض ہو گئی ہیں۔ میں ابھی نماز پڑھ کر سیدھا مسجد سے گھر پہنچا ہوں۔“

”نماز پڑھ کر آئے ہو تو قرآن شریف کی تلاوت کر لو۔ اگر قرآن شریف نہیں پڑھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لو۔ برائے مہربانی مجھے تنگ نہ کرو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے موبائل بند کر دیا۔

دوسرے دن پھر اس کی کال آ گئی۔ مجھے شدید غصہ آ گیا۔

”میں نے جب تمہیں منع کر دیا پھر تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ مجھ سے رابطہ کرو؟ تمہیں بات سمجھ میں نہیں آئی مسٹر؟“

”مجھے احمد کہتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کچھ بھی کہتے ہوں لیکن میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔“

”دیکھیے، میں نے کسی غلط ارادے سے آپ کا نمبر ڈائل نہیں کیا۔“ احمد نے کہا۔

”سب یہی کہہ کر لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور پھر ان کو بدنام کر کے رکھ دیتے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہاں، ایسا ہوتا ہے لیکن جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح ہر مرد بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ میں نے تم سے عشق لڑانے کو فون نہیں کیا بلکہ میں نے تمہیں اپنی بہن سمجھ کر فون کیا ہے کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے جس سے میں اپنے دکھ سکھ کی بات کر سکوں، اس پر فریب دینا میں لوگ اپنی زندگی میں گن ہیں۔ کسی سے ہمدردی کے دوپول کہہ دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔“ احمد کہتا چلا گیا۔

یہ جان کر کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے، مجھے اس سے خود بخود ہمدردی سی ہو گئی تھی اور میں چاہنے کے باوجود کال نہیں کاٹ سکی۔ وہ اپنے دکھ کی فرضی کہانی سناتا رہا اور میں آنکھ بند کر کے یقین کرتی چلی گئی۔

اب اس کے موبائل سے مستقل کال آنے لگی تھی اور ہر بار وہ ایسی من گھڑت کہانی سناتا کہ میں اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے لگتی تھی اور اس کو سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ ہمت سے کام لے، زندگی میں ایسا ہوتا رہتا ہے، وہ مرد ہے اور مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ مند ہوتا ہے پھر اس نے بتایا کہ وہ میرے رشتے کے لیے بڑا فکر مند ہے اور کسی اچھے رشتے کی تلاش میں

ہے۔ کئی دن یہ سلسلہ چلتا رہا۔

ایک دن اس نے خود ہی مجھے پیشکش کر دی کہ وہ کنوارا ہے اور مجھے اپنا بیٹا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے اس مقصد کے لیے ملاقات کے لیے کہا تا کہ ایک نظر دیکھ لوں پسند آنے کی صورت میں وہ اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے گھر بھیج دے گا۔ میں اس کی لچھے دار گفتگو میں آگئی اس لیے میں نے اس کی بات کا فوراً یقین کر لیا اور اس کے بلانے پر ایک ہوٹل میں ملاقات کرنے پہنچ گئی۔ ایک نظر میں دیکھتے ہی وہ مجھے پسند بھی آ گیا۔ اُن دنوں میں رشتے کے لیے بہت پریشان بھی تھی کیونکہ جو رشتے کی غرض سے دیکھنے آتے تھے پھر دوبارہ پلٹ کر نہیں آتے تھے۔ ان کے دوبارہ لوٹ کر نہ آنے کی وجہ ہماری غربت تھی، لوگ کہتے تو ہیں کہ ہمیں جہیز میں کچھ نہیں چاہیے لیکن دراصل انہیں ایسی سونے کی چڑیا کی تلاش ہوتی ہے جو جہیز میں ٹھیک ٹھاک سامان لائے اور ساتھ ہی لڑکے کو کاروبار میں مالی طور پر فائدہ پہنچا سکے۔ ہمارے پاس تو کچھ نہیں تھا ایک عزت تھی جس پر ہمیں ناز تھا کہ لوگ ہماری عزت کرتے ہیں اور ہماری شرافت کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ ان حالات میں احمد کی شادی کی آفر پر میں پھولے نہیں سار ہی تھی۔ اگر وہ زیادہ خوبصورت نہ بھی ہوتا تو میں پھر بھی اس سے شادی کر لیتی۔ میں اس کی لچھے دار باتوں میں ایسی الجھ چکی تھی کہ غیر شعوری طور پر اسے چاہنے لگی تھی۔ احمد نے مجھے بھرپور یقین دلایا تھا کہ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے گا اور بہت پیار دے گا۔ اپنی مختصر روداد سنا کر بلیقیں خاموش ہو گئی اور آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرنے لگی۔

”پھر اس نے رشتہ بھیجا؟“ میں نے پوچھا۔

”احمد نے مجھے یہی کہا کہ وہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے راضی کر کے جلد ہمارے گھر بھیجے گا۔

میں اس کے وعدے پر دن گزارنے لگی اور اس کا رشتہ نہ آنے پر اداس رہنے لگی تھی۔ میں پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی تھی لیکن بے دلی سے کہ مجھے خدا سے بھی شکوہ تھا اور معاشرے پر بھی غصہ آتا تھا کہ میں نے انگلش میں ماسٹر کیا تھا۔ کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس پر والدین کو شرمندگی ہو پھر میرے رشتے کیوں نہیں آتے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنا غریب کیوں بنادیا ہے؟ امیر کیوں نہیں بنایا کہ رشتوں کی لائن لگ جاتی۔ اس قسم کے شکوے ذہن میں کلبلا تے رہتے تھے۔ احمد کے رشتہ بھیجنے کی یقین دہانی پر میرے انگ انگ سے خوشی پھٹکنے لگی تھی۔ میرا چہرہ جو ہر وقت اداس رہتا تھا اب اس پر مسلسل مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔ اب میں نماز بھی دل سے پڑھنے لگی تھی۔ میری خوشی والدین سے چھپی نہ رہ سکی اور میں نے ان کو بتادیا کہ احمد اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیجنے والا ہے۔ یہ بات سن کر وہ بھی خوش ہو گئے۔

ایک دن کہنے لگا کہ بھیر کے دن اس کے گھر والے رشتے کی بات کرنے آ رہے ہیں۔ میں خوش ہو گئی، مجھ سے زیادہ خوش میرے ابو اور امی تھے کہ وہ میری ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں گے لیکن بھیر بھی گزر گیا، منگل بدھ اور جمعرات بھی گزر گئے، جمعہ کو احمد کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ ماموں کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا اس لیے وہ نہیں آ سکے۔ اس طرح کئی بار اس نے مجھے کہا کہ گھر والے آ رہے ہیں پھر نہ آنے پر کوئی نیا بہانہ گھڑ لیتا تھا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا اس کا معمول بن گیا تھا پھر اکثر وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے پوچھتا کہ تم گھر پر ایکی کب رہتی ہو؟ میں اب ایسی چھوٹی بچی بھی نہیں تھی جو اس کی بات نہ سمجھتی کہ وہ مجھ سے تنہائی میں کیوں ملنا چاہتا ہے اس لیے میں صاف انکار

کر دیتی کہ گھر میں ایکی نہیں رہتی، امی اور ابو گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ جب اس کا ملاقات کا اصرار زیادہ بڑھا تو میں نے اس شرط پر کہ وہ مجھے کسی دوست کے گھر ہوٹل لے جانے کا اصرار نہیں کرے گا میں اس سے پبلک مقامات پر مثلاً بازار میں ملاقات کرنے لگی۔ میں بازار کی سیر کرتے ہوئے اس سے بات چیت کرتی رہتی اور گھر آ جاتی تھی۔

ایک دن میرے سیل پر کسی خاتون کی کال آئی، اس نے کہا کہ میں اس کا گھر نہ اجاڑوں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے پر یاد ہو جائیں گے۔ احمد تمہیں دھوکہ دے کر تمہیں بھی نکلی نہیں رکھے گا اور پھر کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ کر تمہیں چھوڑ دے گا۔ یہ انکشاف میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا کہ احمد نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے بچے بھی ہیں۔ جب میں نے احمد کو اس کی بیوی کے فون کا بتایا تو وہ غصے سے بھر گیا۔

”وہ پاگل، جاہل، گنوار عورت میرے پلے باندھ دی گئی ہے اس سے جان چھڑا کر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تا کہ زندگی سکون سے گزر سکے۔“

ایک روز میں نے جب اس کے محلے میں جا کر کسی طرح احمد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو بڑے سنگین انکشاف ہوئے۔ پتا چلا کہ وہ بڑا عیاش نوجوان ہے اس کا کام یہی ہے کہ بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر ان کی زندگیاں برباد کرنا، کئی بار اس سبب جیل بھی چا چکا ہے۔ یہ باتیں جان کر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مہر دوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا تھا اور میرے پاس خودکشی کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اگر رشتہ داروں اور محلے والوں کو اس کہانی کے بارے میں پتا چل جاتا تو مجھ میں حالات کا سامنا

قانون

ایک قانون
بتاتا ہوں آپ کو
کہ
ماں روٹھ جائے
تو
خدا بھی روٹھ جاتا ہے
ہاں
یہ قانون ہے
میرے خدا کا

محمد صفدر رٹھوٹی

کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی کہ خودکشی کرنے سے پہلے کسی کو احمد کے بارے میں بتاؤں پھر یہ انتہائی قدم اٹھاؤں۔ میں نے اکثر احمد کے موبائل پر آپ کا نمبر دیکھا تھا اور احمد نے بھی بتایا تھا کہ آپ اس کے اچھے دوستوں میں سے ہیں آپ کا نمبر میں نے اپنے پاس نوٹ کر کے رکھ لیا تھا تا کہ کبھی ضرورت پڑنے پر رابطہ کیا جاسکے۔ جس رات میں نے خودکشی کرنے کا سوچا تھا بے اختیار میں نے آپ کے نمبر پر کال کی لیکن آپ نے مجھ سے جو باتیں کیں ان سے میرا ارادہ فنی طور پر بدل گیا تھا۔ میں جب بابا عبدالوہاب شاہ کے حزار پر حاضری دے کر آئی تو میرے دل کو قرار آ گیا تھا اور میں نے حالات سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ آپ کے پاس نہ آنے کی وجہ بھی یہی تھی مگر دو روز پہلے جب میرے والد کو یہ پتا چلا کہ مجھے احمد کے ساتھ بازاروں میں گھومتے پھرتے رشتہ داروں نے دیکھا ہے اور احمد عیاش نوجوان ہے اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ان کو دل کا

عقل کو گند کر دینے والی ایسی کہانیاں

جن پر اسرار کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا

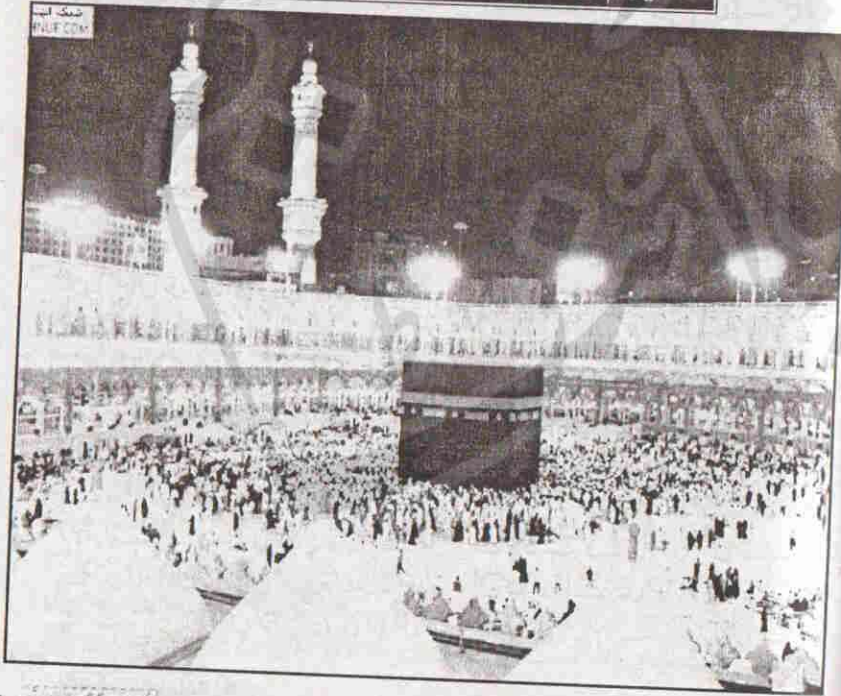
عطیہ ہدایت اللہ

جب میں گھوگئی تھی

حزین صدیقی کا خیال

نہیں یہ خواب کا عالم نہیں ہے
یہ سب منظر تو جیتے جاگتے ہیں

دیار حرم میں بٹک جانے والی ایک عورت کی حیرت انگیز آپ بیتی



ایک شادی کارڈ مجھے تھا دیا۔ کارڈ پڑھتے ہوئے میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ شادی کارڈ بلقیس کا تھا۔ جس لڑکے سے اُس کی شادی ہو رہی تھی میں اسے جانتا تھا وہ مقامی کالج میں لکچرار تھا اور اچھی شہرت کا مالک تھا۔

شادی کے دن میں نے دیکھا بلقیس بہت خوش تھی اور میرے شادی میں شرکت کرنے پر بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ دلہن کے زوہپ میں وہ گلاب کی طرح کھل رہی تھی۔

”کیوں بھی بلقیس، تمہارا وہ فیصلہ اچھا تھا یا یہ.....؟“ موقع ملنے پر میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”سر آپ کے طفیل مجھے یہ دوسری زندگی ملی ہے ورنہ میں کب کی خودکشی کر کے حرام موت مر چکی ہوتی.....“

”بلقیس ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، دنیا میں ملنے والا ہر غم عارضی ہوتا ہے، وقتی طور پر وہ غم بڑا لگتا ہے اور ہم ہمت ہار جاتے ہیں لیکن حوصلہ مندان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں پھر وہ وقت گزرنے پر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ دکھ تو کچھ بھی نہیں تھا، ہم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے تھے۔“

”سر واقعی اس وقت وہ میرے لیے دنیا کا سب سے بڑا غم محسوس ہوا تھا، محبت میں پہلی بار چوٹ کھائی تھی اس لیے خودکشی کا ارادہ کر بیٹھی تھی۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر اس قسم کا اعتقاد فیصلہ نہیں کروں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ اُس کے مسکرانے پر میں بھی بے اختیار مسکرا دیا تھا۔



دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اب والد صاحب کے انتقال کے بعد میرے جینے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا۔ گھر کے وہی واحد فیل تھے جب وہی نہیں رہے تو گھر کا گزارہ کس طرح چلے گا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ ہنسیوں سے رو پڑی تھی۔

”دیکھیے بلقیس صاحبہ مجھے اندازہ ہے کہ آپ پر کیا گزری ہے مگر حوصلہ اور ہمت سے کام لیجئے، یوں رونے سے کام نہیں چلے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”اب مجھ میں حوصلہ نہیں رہا آج رات میں خود کو ختم کر لوں گی.....“ بلقیس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو وقت سدا ایک سا نہیں رہتا، تم جوان ہو آج نہیں تو کل تمہاری شادی کسی اچھے شخص سے ہو جائے گی۔ خودکشی کر کے تم حرام موت کیوں مرنا چاہتی ہو؟ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے اس طرح ضائع کرنا بے وقوفی ہے۔ ایسا کرو تم کسی اسکول یا کالج میں پڑھانا شروع کر دو۔ ماشاء اللہ تم نے انگریزی میں ماسٹر کیا ہے، تمہیں جاب مل جائے گی۔ اس طرح تمہارا دل بھل جائے گا اور کوئی اچھا رشتہ ملنے کی بھی امید ہو جائے گی۔“ میں خاصی دیر تک اس کو سمجھاتا رہا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ مجھ سے وعدہ کر کے چلی گئی کہ وہ خودکشی نہیں کرے گی اور جینے کی بھرپور کوشش کرے گی۔ میں خوش تھا کہ میرے سمجھانے سے ایک لڑکی حرام موت سے بچ گئی تھی۔ میں چونکہ وکیل ہوں لہذا اس طرح کے واقعات آئے دن میرے علم میں آتے ہیں کہ دوستی کر کے مرد نے لڑکی کو برباد کر دیا، لڑکی نے زہریلی دوا کھا کر خودکشی کر لی۔

وقت گزرتا گیا اور دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک روز جب میں آفس آیا تو میرے اسٹنٹ نے

پچھلے دنوں نیویں پرائیک پروگرام دیکھ رہی تھی جس میں ایٹمک پرنس ان لوگوں سے انٹرویو لے رہے تھے جن کے رشتے دار عمرہ یا حج کی ادائیگی کے دوران کم ہو چکے تھے اور ابھی تک ان کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا تھا۔ وہ لوگ سعودی اور پاکستانی حکومت سے استدعا کر رہے تھے کہ ان کی تلاش میں مدد کی جائے اور کوئی مستقل انتظام کیا جائے کہ کم شدہ لوگوں کو سفارت خانوں کے حوالے کیا جاسکے۔ اس پروگرام کو دیکھ کر مجھے بھی کچھ عرصہ پہلے حج کے دوران اپنے آپ پر بیٹنے والی ایک افتاد کی یاد آگئی۔ اسپانر شپ کے تحت ہم میاں بیوی حج پر گئے تھے کیونکہ کوئی معلم نہ تھا اس لیے جدہ سے مکہ مکرمہ پہنچے تو میرے میاں نے مجھے ایک جگہ بمعہ سامان بٹھایا اور ہوٹل میں کمرہ لینے چلے گئے۔ گھنٹہ آدھ بعد اُن کی شکل دکھائی دی۔ اُن کے پیچھے دو ہانپتے کا پتہ نوجوان آتے دکھائی دیئے۔

”یہ کراچی کے میرے عزیز ترین دوست امجد صاحب کے نتیجے ہیں۔ اس کے بھائی منیر صاحب کے قلیٹ میں رہتے ہیں۔ منیر بیج فیملی امریکا گئے ہیں۔ بازار میں انہوں نے مجھے پہچان لیا اور مصر ہو گئے کہ منیر صاحب کے گھر کا ادپری پورشن خالی ہے آپ دس بارہ دن کے لیے آئے ہیں ادھر ہی رہ لیں۔“ میاں جی نے اُن نوجوانوں کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اس دوران لڑکوں نے لپک کر سامان اٹھالیا۔ ہم ان کی بڑی سی بلڈنگ میں آگئے جو حرم شریف سے دس منٹ کی ڈرائیو پر واقع تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گیلری میں رکھے اسٹود پر چائے بنائی اور عمرے کی ادائیگی کے لیے ٹیکسی میں حرم شریف چلے گئے۔ صبح کی نماز پڑھ کر ہم نے گھر سے ضروری سامان لیا اور بس میں بیٹھ کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ تین دن وہاں گزار کر حج کی ادائیگی کا

فریضہ شروع کیا۔ میدان عرفات میں ٹینٹ سے لگ کر مزدلفہ جانے کے لیے ٹیکسی کے انتظار میں تھے کہ ایک عورت میری طرف بہت تیزی سے بھاگتی ہوئی آئی۔ میں ابھی حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی کہ اس نے جھکے کے ساتھ میرے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھمایا اور اسی طرح بھاگتی ہوئی پھیر میں غائب ہوگئی۔ اچانک جیسے مجھے ہوش آیا، ہتھیلی کھولی تو اس میں نیا غور سو ریاں کا نوٹ رکھا ہوا تھا۔ میرے میاں بھی پیچھے مڑ کر میری طرف لپکے۔

”کیا ہوا؟ کون سی یہ خاتون؟“
”معلوم نہیں، یہ دیکھیں، مجھے سو ریاں خیرات دے گئی ہے۔ اف، کیا میں چلے سے فقیرنی لگ رہی ہوں؟“ میں روہانی ہوگئی تھی۔

”ارے نہیں بھئی یہاں کے لوگ حج کے دنوں میں بے انتہا دینا دلانا کرتے ہیں۔ مسافر سمجھ کر دے دیا ہوگا۔ رکھ لو پرس میں۔ تم بھی آگے کسی کو بھنا کر بانٹ دینا۔ حرم شریف میں کتنے پاکستانی مالکتے نظر آتے ہیں۔“ چونکہ سعودی کرنسی کی مجھے زیادہ سمجھ نہیں تھی اس لیے شاپنگ کے لیے ساری کرنسی میرے شوہر ہی کے پاس تھی۔ نوٹ کو پرس میں ڈال کر ہم مزدلفہ جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ مزدلفہ اور منی وغیرہ میں تمام ارکان حج کی ادائیگی کے بعد ہم لوگ اپنے بڑے سے بیگ میں سامان ٹھونس کر سیدھے طواف الوداع کے لیے حرم شریف چلے گئے۔ جو کہ نماز میں کافی وقت تھا لیکن ٹولیاں کی ٹولیاں جگہ لینے آ رہی تھیں۔ میرے میاں کو منی میں رات سے ایک سو ایک بخار تھا جو پیر ایڈنا مول لینے کے بعد ننانوے پر آ گیا تھا۔ ادائیگی طواف کے دوران اُن کے ہاتھ جلنے کوئلے کی طرح جھلس رہے تھے۔ میں اُن کا ہاتھ تھامے انہیں سہارا دیتی آرام سے طواف کراتی رہی پھر ہم بڑے دروازوں میں سے ایک سے

اُپر نکلے گئے۔ بیچڑ میں میری چپل پر کسی نے پاؤں رکھ دیا اور ایڑی کے اوپر ہی جھکے کو ڈنکی بھی کر دیا۔ میں ہل لینے والیں مڑی ٹشو پیپر سے جھکے کا خون صاف کیا پھر پلٹ کر دیکھا تو بے تحاشہ بیچڑ میں میاں کا کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ میں بیگ کو بمشکل سنبھالتی راستہ نکالتی باہر سڑک کی طرف لپکی ادھر ادھر انہیں ڈھونڈتی پھری لیکن ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے گھبرا کر حرم کے ہر دروازے سے باہر دیکھا پھر تھک ہار کر جمعہ کے لیے وضو کرنے خواتین کے غسل خانوں کی طرف چلی گئی۔ وضو کر کے نکلی تو بائیں تیس سال کا ایک بنگلہ دہی نشو جوان وہاں کھڑا تھا۔

”باجی.....! آپ بہت تھکی ہوئی اور پریشان دکھائی دے رہی ہیں اور پھر اتنا بھاری بھر کم بیگ بھی اٹھائے ہوئی ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی مرد نہیں؟“
ٹوٹی پھوٹی اردو انگریزی میں وہ لڑکا بولا۔ اسے ہمدردیا کر میں نے اسے اپنی پتا سنادی۔

اس نے کہا: ”نماز کے بعد آپ ادھر ہی آ جائیے گا۔ میں ساری بڑی بڑی بلڈنگوں کو پہچانتا ہوں آپ کو لے جاؤں گا میری اپنی ٹیکسی ہے۔“ اس بات پر میں نے خوش ہو کر سکون سے نماز جمعہ ادا کی۔ واپس آئی تو وہ لڑکا وہیں کھڑا تھا وہ میرا بیگ اٹھا کر باہر سڑک پر آ گیا۔

”باجی! ادھر کھڑی رہو میں ٹیکسی لے آتا ہوں اور ہاں۔“ جاتے جاتے مڑ کر بولا۔ ”آپ مجھے تیس ریاں دے دیں میں لگے ہاتھوں پیٹرول بھی ڈالواؤں گا۔“ میں پہلے تو مایوس ہوگئی کہ کرنسی تو میرے پاس تھی ہی نہیں پھر اچانک سو کے اُس نوٹ کا خیال آیا جسے میں نے پرس میں ڈالا تھا۔

”بھائی.....! میرے پاس تو ٹوٹا نہیں۔“
”لاائیں، میں تڑوا دیتا ہوں۔“ اُس نے تڑیاں گن کر میرے حوالے کیے اور پھر سڑک کے کنارے

کھڑے کھڑے دو گھنٹے بیت گئے اور وہ لڑکا مڑ کر نہ آیا۔ ناامید ہو کر میں بھاری بیگ کو گھنٹے پھر سے حرم شریف کے اندر آگئی اور ایک طرف ٹھنڈے فرش پر ڈھے جانے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ میرے اعصاب شدید تھکاں، بھوک اور ڈر کی وجہ سے جواب دینے لگے تھے۔ بیٹھے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ دو شرطے (سپاہی) بھاگم بھاگ میرے سر پر آن کھڑے ہوئے اور عربی زبان میں تیز و تند لہجے میں بولنے لگے۔ ساتھ میں میرے بیگ کو بھی باہر کھینچنے لگے۔ اپنی بے بسی اور بے عزتی پر میں زار و قطار رونے لگی۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ لوگ گھبرا کر کہیں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان ترک خاتون کے ساتھ واپس آگئے۔ خاتون میرے پاس بیٹھ گئی اور نرم لہجے میں انگریزی زبان میں بات کرنے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں صبح آٹھ بجے سے اپنے میاں سے پھڑکنے ہوں ذرا کی ذرا دم لینے یہاں بیٹھی ہوں تو یہ لوگ اٹھنے کو کہہ رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کا گھر ہے! اس دُور سے بھی نکالے گئے تو جاؤں گی کہاں؟ ترک خاتون نے عربی میں ترجمہ کر کے بتایا تو انہوں نے فوراً ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔ آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھ کر حواس درست کیے اور پھر بیگ اٹھا کر باہر سڑک پر آگئی۔ وہاں موٹر سائیکل پر ایک بڑی رینک کا پولیس افسر اور چند یونیفارم میں ملبوس سپاہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُن کے افسر کے پاس جا کر بڑی لجاجت سے مدد کے لیے کہا مگر انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے جانے کا کہا۔ میں نے پھر استدعا کی کہ میری بات سن لیں، انہوں نے پھر عربی میں چلاتے ہوئے ڈانٹ کر پرے جانے کا کہا۔ ناامید ہو کر دوبارہ حرم شریف میں آ بیٹھی۔ انگش جاننے والے ایک غیر ملکی سے مدد مانگی تو اس نے میرا بیگ اٹھایا اور مجھے

"Lost and found" (گم ہو جانے والے لوگوں) کے ادارے میں پہنچا دیا۔

وہاں ایک افسر نے پوچھا: "آپ کے پاس کوئی شناختی کڑا لاکٹ ایڈریس یا فون نمبر ہے؟" میں نے انکار میں سر ہلایا تو اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا کہ آپ تو تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں اتنی بھی کیا جھالت کہ جگہ کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں؟ یہ میری نا سچی ہے لیکن میرے میاں ساتھ تھے۔ ہم وہاں صرف ایک رات رہے تھے۔ میاں کو سب معلوم ہو گا لیکن اب مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ "اس صورت میں ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جہاں چاہیں جائیں۔"

یہ میری آخری امید تھی اب میں جاتی تو جاتی کہاں؟ وہیں سر جھکائے دروازے پر کھڑی رہی۔ افسر باہر نکلا اور غصے سے لال پیلا ہو کر مجھے وہاں سے جانے کا کہا۔ میں ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ باہر آ کر چھوٹی دیوار کے اوپر بیٹھ گئی۔ دس منٹ بعد ایک درمیانی عمر کا عربی میرے قریب آیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولنے لگا۔

"تم گم ہو گئی ہو جس بلڈنگ سے آئی ہو نا میرے ایک مزدا گاڑی والے ڈرائیور دوست کو ان سب جگہوں کا پتہ ہے بس تم مجھے تیس ریال مختانہ دینا" میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گا۔" میں نے خوش ہو کر اسے تیس ریال گن کر دیے۔ مجھے لیے ہوئے وہ باہر آیا۔ سامنے سواریوں سے بھری گاڑی میں مجھے چڑھایا اور ڈرائیور سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔

"آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟ جگہ کافی دور ہے یہ تو بہت رقم مانگ رہا ہے۔" عربی نے کھڑکی سے اندر کی طرف منہ کر کے آہستگی سے کہا۔ "میرے پاس یہ چالیس ریال ہیں یہ لے لو۔"

"بننے تو پچاس ریال ہیں لیکن چلو تم چالیس ہی لے لے گا۔"

پھر گاڑی چل پڑی۔ جگہ جگہ مسافر اتارے ہوئے بہت دیر بعد اس نے مجھے ایک بڑے سے مل کے قریب اتار دیا۔

"تمہاری مطلوبہ بلڈنگ یہاں سے دو منٹ کے فاصلے پر ہے۔ میں اس طرف نہیں مڑ سکتا تم آ جاؤ۔" میں بیک کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے باہر نکلی اور بائیں ہاتھ کی طرف فٹ پاتھ پر چلتی چلی گئی۔ مختلف بلڈنگز دکائیں، شاپنگ سینٹر گزرتے گئے۔ اب رہائشی کالونیاں شروع ہو گئیں۔ آخر کار وہ بھی ختم ہو گئیں۔ آگے دیکھا تو قلعہ دوق مجوروں کے درخت

چک چک چک نہ آدم نہ آدم زاد۔ ڈر کے مارے میری کھٹکھی بندھ گئی۔ خطرے کے وقت انسانی جسم میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ انزائم (enzymes) خارج ہونے لگتے ہیں۔ مجھے بھی اس وقت تھکان بھول بھال گئی بس یاد رہا تو یہی کہ مجھے اب اپنی جان بچانی ہے۔ جب دائیں طرف فٹ پاتھ کی شکل دیکھی تو اس پر بیک پیچتی میں تقریباً دوڑتی رہی۔ میرا

بیک بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا پھر دور مجھے ایک عمارت نظر آئی۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے میری طاقت بالکل جواب دے گئی اور میں دھڑام سے گر گئی۔ اٹھا یاد تھا کہ دو ملازم صورت سیاہ فام لڑکے میری طرف لپکے تھے۔ آکھ کھلی تو ایک پردے کے پیچھے کھڑی کی بچہ پڑی تھی۔ میری چادر میرے اوپر پڑی تھی اور بیک ساتھ ہی زمین پر رکھا ہوا تھا۔ میں جھٹکے کے ساتھ اٹھی تھی۔ اسی وقت ایک لڑکا اندر آیا۔

"دیدید..... کیا آپ ٹھیک ہو گئیں؟" "تم کون ہو اور یہ کون سی جگہ ہے؟" "دیدید! آپ ہمارے اس ہوٹل کے سامنے گر گئی تھیں۔ ہم آپ کو اہلے لے آئے پھر آپ گھنٹہ تک

مل رہیں۔ ہم یہاں پر بیرے ہیں اور ہندوستان کے شہر کے لیے تعلق ہے دیدید! آپ کے لیے دو دھلاؤں؟" "نہیں میں اب جاؤں گی۔"

"نہیں دیدید..... بڑے صاب نے بولا تھا" "ہوش میں آئیں تو ہمیں بلا لیں۔"

پانچ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر کورا چٹا عربی لباس میں ملبوس آدمی اندر آیا۔ "آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگتی آپ حاجن اور پاکستانی ہیں لیکن اس ویرانے میں کیا کر رہی ہیں؟" وہ شخص اچھی بھلی اردو میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے پوری روداد سنائی۔

"یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ کو کوئی اتہ پتہ معلوم نہیں کیا آپ اتنا بتا سکتی ہیں کہ اس بلڈنگ میں کسی پاکستانی ڈاکٹر کا کوئی کلینک تھا کیونکہ میں ہمیشہ سے پاکستان کے ڈاکٹر کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں بہت عرصے سے بیمار ہوں یہ دیکھیں میرا ایک ہاتھ بھی کہنی پر سے کٹا ہوا ہے اس کی وجہ سے بھی علاج معالجوں کے پیچھے پھرتا رہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں وہاں بلڈنگ سے اتر کر ڈاکٹر وقار احمد کا بورڈ میری نظر سے گزرا تھا۔"

"اچھا تو میں اپنے سارے نسخوں کی فائل لے آتا ہوں اسے چیک کرتے ہیں شاید ڈاکٹر وقار کا نسخہ ہاتھ آئے نہ ہو تو کسی بھی پاکستانی ڈاکٹر سے وقار کا پتہ پوچھ لیں گے۔ آپ میری بہن کی طرح ہیں جب تک آپ کو گھر نہیں ملے گا میں آپ کو اپنے گھر بیوی اور ماں کے پاس لے جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹری نسخوں کا رجسٹر لے آیا۔ اس میں ورق الٹتے الٹتے ایک جگہ ڈاکٹر وقار کے نام کا نسخہ نکل آیا۔ خوش ہو کر اس نے اپنے تیرہ ہفتہ سال کے بیٹے کو بلایا اور اسے گاڑی کی چابی دے کر تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"آئی کو گھر چھوڑنا ہے۔ اگر انہوں نے گھر پہچان لیا تو ٹھیک ورنہ پھر ان کو واپس لے آنا۔" میں منٹ بعد ہم اپنے قلیت کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر اطلاعی کھنٹی بجائی اور پھر کافی دیر تک بجاتے رہے لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ میرے میاں مجھے حرم شریف میں نہ پا کر گھر آ گئے ہوں گے لیکن یہاں تو کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں نچلے قلیت سے ڈاکٹر منیر کے پیچھے لفٹ سے اوپر آئے۔

"ہم ابھی حرم شریف سے آئے ہیں۔ گھنٹیوں کی بے درپے آواز آئی تو اوپر آئے۔"

انہوں نے بھی کچھ دیر تک بجائی پھر نیچے سے چابی لا کر دروازہ کھولا۔ اس وقت تک لڑکا چلا گیا اور میں اندر گئی تو میرے میاں شدید بخار میں ادھ موئے پڑے تھے۔ دونوں لڑکوں نے انہیں کاندھے پر ڈال کر بلڈنگ کے آخری سرے کے کلینک میں پہنچایا۔ ٹھنڈی پیوں اور بخار کے انکشن کی مدد سے ان کا بخار اترا۔

ان کے حواس بحال ہوئے تو مجھ سے پوچھا۔ "تم کب آئی ہو؟"

"بہت دیر سے آ کر بیٹھی ہوں۔" ٹھیک ہوں گے تو پھر ساری کہانی سنائیں گی۔ میں نے دل میں سوچا۔ "تم پچھڑیں تو کافی دیر نہیں ڈھونڈتا رہا پھر بخار نے اتنا تنگ کیا کہ میں کسی سے گھر آ گیا اور بستر پر بڑھال ہو کر گر پڑا۔ میں نے سوچا کہ تم تعلیم یافتہ عورت ہو خود ہی واپس آ جاؤ گی۔"

آج بہت عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں ہر نماز میں اس عربی مہربان کے لیے دعا کرتی ہوں۔ دنیا اچھے لوگوں کی وجہ سے قائم ہے اور میدانِ عرفات میں جو سو ریال مجھے ملے تھے اس کی وجہ سے تو میں بھٹکتی ہوئی اس مہربان عربی کے پاس پہنچی ورنہ آج میں کہاں ہوتی یہ سوچ کر ہی جھرجھری آ جاتی ہے۔ میری زندگی سے جڑے اس بچے والے کو آپ پراسرار بھی کہہ سکتے ہیں۔

ارم ایوب

مجھے انصاف دو

”عارب! یہ دیکھو اماں نے میرا کیا حال کیا ہے؟ تم نے تو مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا تھا، کہاں گئی تمہاری محبت؟ دیکھو میں بے چین ہوں اور مجھے تب تک چین نہیں آئے گا جب تک میرے قاتل کو سزا نہیں ملے گی۔“

ایک مقتول لڑکی کی روح کی روداد، جو انصاف کی چاہ میں بھٹک رہی تھی



”عارب! اٹھ جا پڑھنے نہیں جانا کیا؟“

”نہیں اماں! آج دل نہیں کر رہا“ سونے دو مجھے۔ عارب نے کروٹ بدلتے ہوئے خود پر چادر تان کر کہا۔

”ارے گھوڑ مارا، کام کا نہ کاج کا ابھی اٹھ کے دوستوں کے ساتھ باہر نکل جائے گا۔ ارے لڑکے! کیا کروں میں تیرا؟“ اماں بی بستی جھکتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

عارب ایک سفید پوش گھرانے کا نوجوان تھا، دو جوان بہنوں تانیہ اور تاندہ کا اکلوتا بھائی تھا۔ گھر میں بوڑھی اماں بی بی اس کی واحد سرپرست تھیں جن کے بے جا لاڈ پیار کا فائدہ اٹھا کر وہ نکما ہوتا چارہا تھا۔ اماں بی سارا دن گھر میں بیٹیوں کے ساتھ سلاخی کڑھائی کر کے گھر کا چھپے تیسے گزر بسر کر رہی تھیں جبکہ عارب کالج کے بعد ایک ورکشاپ پر کام سیکھ کر وہیں تھوڑا بہت کام کر کے کچھ پیسے کمالیتا تھا جو زیادہ تر باہر دوستوں کے ساتھ ہی خرچ ہوتے تھے۔

آج کل عارب نے کالج جانا تقریباً بند ہی کر دیا تھا۔ ہاں البتہ دوپہر میں وہ ٹھیک ایک بجے ورکشاپ کے لیے بھاگ بھاگ کر تیار ہوتا تھا اور عین وقت پر گھر سے نکل جاتا تھا۔ اماں بی بیٹے کی اس تبدیلی پر بہت خوش تھیں۔

ایک دن تانیہ نے طنز یہ کہا تھا۔ ”اماں بی! کیا بات ہے آج کل تو بھائی روز ہی کام پر جانے لگا ہے۔ خیر تو ہے ناں؟“

”ارے چپ کلہوئی خدا نے اگر میرے بچے کو عقل دے ہی دی ہے تو تجھے کیا غم کھائے جا رہا ہے؟ خدا ترقی دے میرے لال کو۔“ اماں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے دُعا کی۔

”لو بھلا مجھے کیوں فکر ہونے لگی مجھے تو بس ذرا

سی حیرت ہوئی تھی اور وہ بھی بھائی کے مسلسل کام پہ جانے پر نہیں بلکہ ایسے بن ٹھن کرنواہوں کی طرح جانے پر جیسے کام پر نہیں گھومنے پھرنے جا رہا ہو۔“ تانیہ نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ وہ اماں کی بات پر یکفخت جل گئی تھی۔

”ارے ہاں۔“ اماں بی نے منہ میں چلتا پان روک کر ٹھوڑی پرانگی رکھتے ہوئے پرسوج انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر وہ گھومنے پھرنے جاتا ہے تو خرچے کے پیسے کہاں سے لاتا ہے جو وہ باقاعدہ طور پر مجھے دینے لگا ہے؟“ اماں بی نے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلا ہلا کر اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”چل چھوڑ، میں کل خود ورکشاپ والے خان بھائی سے پوچھ لوں گی پتہ لگ جائے گا۔“ اماں بی نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور مطمئن ہو کر دوبارہ پان لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

دوسرے دن اماں بی واقعی خان بھائی سے پوچھنے چلی گئیں۔ خان بھائی کا مثبت جواب سن کر وہ کافی پرسکون ہو گئیں۔ گھر آ کر انہوں نے تانیہ کو بھی پوری بات بتاتے ہوئے کہا۔

”میں پوچھ آئی ہوں خان بھائی سے وہ روزانہ وقت پر کام پر پہنچ جاتا ہے اور رہی بننے ٹھننے کی بات تو اس عمر میں تو سب ہی اسی طرح بنتے ٹھننے ہیں اور عارب بھی اگر ایسا کرتا ہے تو بھلا کیا ہے؟ آخر میرا لال ہے بھی لاکھوں میں ایک۔“

عارب حسب معمول پپو کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ورکشاپ جا رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے آتی دو لڑکیوں پر پڑی جن کے ہاتھ میں کتابیں تھیں ان میں سے ایک لڑکی تو معمولی شکل و صورت کی تھی جبکہ دوسری کافی خوش شکل تھی۔ عارب نے اس لڑکی کو گھورنا شروع کر دیا۔

پو نے اس کی حرکت نوٹ کرتے ہوئے کہا۔
 ”اوئے“ کدھر جا رہا ہے؟ ہوش میں آؤ رکشاپ جانا ہے۔“ پو نے عارب کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا اور دونوں درکشاپ کی جانب چل دیے۔
 اب تو یہ روز کا معمول بن گیا، پو بھی عارب کی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھا کیونکہ اس سے پہلے اگر ایک دن عارب اس کے ساتھ درکشاپ جاتا تو اگلے دو تین دن اسے اکیلے ہی جانا پڑتا تھا مگر اب عارب مستقل درکشاپ جا رہا تھا۔ عارب کی اس خوشگوار تبدیلی پر وہ حیرت کے ساتھ ساتھ مسرور بھی تھا لیکن اس وقت اسے شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا جب عارب پورے ایک بجے بن ٹھن کر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوتا اور پو کے تھوڑی بہت دیر کرنے پر شور مچا کر رکھ دیتا۔ وہ لوگ تقریباً روز ہی درکشاپ کے لیے نکلتے اور اسی وقت وہ دونوں لڑکیاں بھی سامنے آتی نظر آتیں۔ پہلے پہل پو پو نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن جب یہ روز کا معمول بن گیا اور عارب کی تراش خراش میں بھی نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی تو یہ بات پو کے ساتھ ساتھ ان دونوں لڑکیوں نے بھی نوٹ کی۔ اب عارب کے گھور گھور کے دیکھنے پر وہ دونوں چونکا ہو کر چلنے لگیں۔ پہلے وہ باتیں کرتی گزر جایا کرتی تھیں لیکن اب وہ ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر خاموشی سے گزر جاتیں۔

ایک دن عارب کو پو نے ٹوک ہی دیا۔ ”اوئے“ چکر کیا ہے؟ بڑا بن ٹھن کے آنے لگا ہے آج کل؟ کیا قلمیں قلمیں زیادہ دیکھنا شروع کر دی ہیں میرے ہیرو؟“ پو نے عارب کو اوپر سے نیچے تک بغور دیکھتے ہوئے کہا تو جواباً عارب مسکرا کر رہ گیا۔ ”اور بات سن“ ان لڑکیوں کو جو تھوڑا گھورتا ہے ناں کسی دن اگر مار پڑ گئی تو میں تو فوراً بھاگ جاؤں گا تو پشٹا رہنا اپنے

کرتوتوں سے، دیکھ میں نے پہلے ہی بول دیا ہے پو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
 ”مجھ سے مجھے یہی امید تھی بھاگ جانا“ نہیں ہے مجھے تیری۔“ عارب نے مصنوعی حنکی کہا۔ ”اچھا بات سن ان لڑکیوں کو جانتا ہے تو اس محلے کی ہیں کیا؟“ ”نہیں شاید ساتھ والے علاقے کی ہیں۔“ نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
 ایک دن تو پو واقعی ڈر ہی گیا جب اس لڑکی پاس سے گزرتے ہوئے عارب کو ایک پرچہ دیا اور عارب نے مسکراتے ہوئے وہ پرچہ جیب میں رکھ لیا۔
 ”اوئے“ یہ کیا ہوا؟“ پو حیران پریشان عارب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لڑکیاں آگے جا چکی تھیں۔
 ”کیا؟“ عارب نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔
 ”یہ کب سے ہو رہا ہے؟ اور تو نے مجھے بتایا نہیں؟“ پو نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
 ”بتانے ہی والا تھا۔“ عارب نے کہا اور رکشاپ کی جانب چل دیا پھر تمام راستے عارب کو تمام تفصیل بتاتا گیا۔

.....
 ”اماں بی! ایک بات کرنی ہے۔“ عارب باورچی خانے میں کام کرتی اماں بی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں بول۔“ اماں بی نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔
 ”ایسے نہیں جب تم کام کر لو گی تو کمرے آ جانا پھر آرام سے بیٹھ کر بات کروں گا۔“ اماں بی سے کہہ کر کمرے میں جا کر بیٹھ پڑا۔

پو میں اماں بی بھی آگئیں۔
 ”ہاں بول کیا بات تھی؟“ اماں بی نے پو کو پوچھتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”اماں بی! وہ.....“ عارب نے جھپکتے ہوئے بات شروع کی اور ادھوری چھوڑ کر اماں بی طرف دیکھ کر ان کے تاثرات کا اندازہ لگانے لگا۔
 ”ہاں ہاں میرے لعل بول کیا پریشانی ہے بتا مجھے میں تیری ماں ہوں۔“ اماں بی نے لاڈ لہا تھا۔
 ”اماں بی! وہ آج کل تم جا رہی ہوں ناں“ اُدھر میرے رشتے کے لیے لڑکیاں دیکھنے۔“ ب نے بغور ماں کو دیکھا۔
 ”ہاں ہاں تو پھر.....“ اماں بی نے اسے ہامیا نظروں سے دیکھا۔
 ”اماں بی! تو وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ..... کہ اب میں نہیں جانا۔“ عارب نے ڈرتے ڈرتے آخر میں مل کر ہی ڈالی۔
 ”کیوں؟“ اماں بی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔
 ”اماں بی! لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔“ ب نے دھیمے انداز میں کہہ کر ماں کا چہرہ دوبارہ

.....
 ”دیکھ لی ہے؟ احماد دیکھ لی ہے۔“ اماں بی کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن کچھ سوچ کر انہوں نے پو چھا۔
 ”ان ہے وہ؟ کس کی لڑکی ہے؟ کچھ بتا تو سہی۔“ اماں بی نے یکدم نرمی سے پو چھا۔
 ”وہ سامنے والے علاقے میں رہتی ہے اس لڑکی بھائی ہیں ماں باپ مر گئے ہیں بھائیوں اور ان کے ساتھ رہتی ہے۔ بڑا بھائی کسی ادارے میں ملا ہے دوسرا جرنل اسٹور چلاتا ہے اور تیسرا

کسی درکشاپ پر کام کرتا ہے اور وہ لڑکی پڑھتی ہے۔“ عارب نے ایک ہی سانس میں اماں بی کو مزید سوالات کی زحمت دے بغیر لڑکی کا پورا بائیو ڈیٹا بتا دیا۔
 ”واہ جی! واہ! کیا خوب رشتہ جوڑا ہے تو نے؟“ خبردار میرے جتنے جی یہ نہیں ہو سکتا۔“ اماں بی یکا یکا طیش میں آ گئیں۔ عارب! اماں بی کا بدلتا رویہ دیکھ کر پہلے تو گھبرا گیا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے پو چھا۔
 ”کیوں کیوں نہیں ہو سکتا؟ ابھی تو تم خود پوچھ رہی تھیں پھر ایک دم ناراض کیوں ہو گئیں؟“ ”بس! بس زیادہ مہذبہ نہ چلاؤ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔“ اماں بی نے دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ سنایا اور کمرے سے باہر جانے لگیں۔
 ”مجھے پتا ہے اماں بی! ہم کیوں انکار کر رہی ہو؟ وہ غریب ہے ناں لیکن میں شادی کروں گا تو صرف رضیہ سے ورنہ نہیں کروں گا اور اب یہ مت بولنا کہ تو میری مری ہوئی شکل دیکھے۔“ عارب نے وہیں کھڑے کھڑے چیخ کر کہا اور پاؤں پشٹا ہوا باہر نکل گیا۔ اماں بی عارب کے جانے کے بعد دوسرے کمرے میں بیٹیوں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور پوری بات لڑکیوں کو بتانے لگیں۔
 ”اماں بی! اگر وہ لڑکی بھائی کو پسند ہے تو تم کم از کم دیکھ تو آؤ کیا معلوم وہ واقعی اچھی ہو۔“ تابندہ کی بات سن کر اماں بی چران پا ہو گئیں۔
 ”تیری عقل پہ پتھر پڑ گئے ہیں کیا؟ ایک ہی بیٹا ہے میرا میرے بھی کچھ خواب ہیں میں تو اپنے بیٹے کا رشتہ کسی کھاتے پتے گھر میں کروں گی۔ میں کیوں جانے لگی ایسوں کے گھر جہاں خالی ہاتھ لڑکی لے آؤں؟“ اماں بی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا تو دونوں بہنیں خاموش ہو گئیں۔

اگلے دن عارب نے پھر اماں سے بات کی۔
”اماں بی! مجھے صاف صاف بتا دو کہ رضیہ کے کھر
رشتہ لے کر جاؤ گی یا نہیں؟“

”ارے لڑکے! کون سی زبان سمجھتا ہے تو ایک
بار تجھے بات سمجھ نہیں آتی کیا؟“ اماں بی نے عارب
کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر بعد میں مجھ سے کوئی شکایت
مت کرنا۔“ عارب نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا
اور باہر نکل گیا۔

صبح سے شام ہو گئی عارب گھر واپس نہ لوٹا تو
اماں بی کو کوشش ہونے لگی۔ اماں بی کے دل میں
طرح طرح کے ہول اٹھنے لگے۔ رات دیر گئے جب
عارب گھر پہنچا تو اماں بی اس کے سر پر کھڑی
ہو گئیں۔

”کہاں تھا اتنی دیر تک؟“

”دوستوں کے ساتھ تھا۔“ عارب نے بے
پردائی سے جواب دیا اور بغیر کھانا کھائے اپنے
کمرے میں چلا گیا پھر اس کا یہی معمول رہا اور اتوار
کے روز تو اماں بی بیچ بچ ہول گئیں جب عارب نے
اماں بی سے کہا۔

”اماں بی! اگر تم اب بھی راضی نہ ہوئیں تو
ٹھیک ہے میں تمہیں ناراض کر کے بھی اپنی خوشی
حاصل نہیں کرنا چاہتا لیکن مر تو سکتا ہوں ناں..... اگر
مجھے کچھ ہو جائے تو معاف کر دینا۔“ عارب نے
اماں بی کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ
رکھ دیئے۔ اماں بی نے عارب کے بھرائے ہوئے
لہجے پر چونک کر اس کی جانب دیکھا تو اس کی
آنکھوں کی نمی اور چہرے کے تاثرات اس کے الفاظ
کی گواہی دے رہے تھے۔ ایک لمحے کو اماں بی لرز کر
رہ گئیں اور چارونا چار نہیں عارب کی خواہش کے
آگے ہتھیار ڈالنے پڑے پھر چٹ پٹکی اور پٹ بیاہ

کے مصداق عارب کی شادی ہو گئی۔

عارب بہت خوش تھا اور رضیہ بھی شادی کے بعد
سسرال والوں کا دل چیتنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی
تھی۔ اماں بی بیٹے کی خند پر رضیہ کو گھر تو لے آئی
تھیں لیکن انہوں نے رضیہ کو دل سے قبول نہیں کیا
تھا۔ وہ بظاہر خوش تھیں لیکن اندر ہی اندر سلگ رہی
تھیں۔ رضیہ کی شکل میں ان کے خوابوں کا خون ہو گیا
تھا جو انہوں نے عارب کے مستقبل کے حوالے سے
دیکھے تھے اور پھر رضیہ کا جہیز بھی ان کی توقع کے
مطابق نہیں تھا، سول میں جلنے والی نفرت کی آگ
ٹھنڈا کرنے کے لیے انہوں نے رضیہ کو تنگ کر
شروع کر دیا۔ اب گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات
پر ہنگامہ کھڑا ہوتا اور ان جھگڑوں سے تنگ آ کر ایک
روز رضیہ غصے میں بھری میکے آ گئی، تاہم اس کے
بڑے بھائی سیف نے سمجھا بھگا کر واپس سسرال بھیج
دیا۔

رضیہ کو اپنے گھر گئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اس
کے بڑے بھائی سیف کو اطلاع ملی کہ رضیہ بری
طرح تھل گئی ہے اور اسپتال میں موت و زندگی کی
سنگٹ میں ہے۔ سیف بھگم بھاگ ہسپتال پہنچا
تھا۔

رضیہ کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھا تھا۔ اس کا آدھ
سے زیادہ چہرہ چمک گیا تھا اور اس کی من موئی
بہن اس وقت خوفناک لگ رہی تھی..... بیٹہ
ساتھ کھڑا سیف اسے دیکھ کر تڑپ رہا تھا اور اب
گھر والے بھی رو رہے تھے۔ رضیہ نے ایک لمحے
سب کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن
آواز نہ نکل سکی۔ وارڈ میں پولیس بھی موجود تھی
رضیہ کا بیان لینا چاہتی تھی مگر بیان دینے سے
ہی رضیہ تمام دکھوں سے آزاد ہو کر اگلے جہان
پہنچ چکی تھی۔ رضیہ کے گھر والے پھوٹ پھوٹ

اس سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتی۔ ”مجھے انصاف
دلاؤ۔“

دوسری طرف اماں بی کے ساتھ بھی یہی صورت
حال تھی ان کی بھی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ رضیہ کی روح
ان کے خواب میں بھی آتی تھی اور انہیں قاتل، قاتل
پکارتی تھی اور وہ گھبرا کر اٹھ جاتی تھی اور پھر ایک روز
تنگ آ کر اماں بی خود ہی تھانے پہنچ گئیں اور پولیس کو
بیان دے کر گرفتاری دے دی۔ عارب کو پتہ چلا تو وہ
دوڑا دوڑا تھانے پہنچا تھا اور لاک اپ میں بند اپنی
ماں کو حیرت سے دیکھا۔

اماں بی نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے
کہا۔ ”بیٹے.....! مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنی لالچ
میں تیرا ہتھ بٹا گھرا جاؤ کر سمجھ رہی تھی کہ سکون سے
رہ پاؤں گی مگر میرا سکون غارت ہو گیا۔ اب رضیہ کی
بے چین روح کو بھی قرار آ جائے گا۔ وہ مسلسل
خواب میں آ کر مجھ سے ایک ہی مطالبہ کرتی ہے کہ
مجھے انصاف دو۔“ اماں بی یہ کہہ کر زار و قطار رونے
لگی تھیں۔ ان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ ”رضیہ!
مجھے معاف کر دو۔ میں نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے
اب مجھے سکون سے سونے دو۔“ عارب ماں کو بلکتا
دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید اب اسے بھی سکون
مل جائے۔

اماں بی عرقید کی سزا بھگت رہی ہیں جبکہ ان کے
بیٹے عارب نے اپنی بہنوں کی شادی کر دی ہے لیکن
خود اس نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔ اس کا کہنا
ہے کہ رضیہ تو ہر دم اس کے ساتھ رہتی ہے۔ شادی کر
کے میں اس کے سر پر سون نہیں لاسکتا۔ اس کی بات
سن کر اکثر لوگ اسے حیرت سے دیکھتے رہ جاتے
ہیں تاہم محلے بھر میں وہ پاگل مشہور ہو گیا ہے کیونکہ
وہ اکثر اکیلا بیٹھا خلاؤں میں گھورتا ہوا کسی غیر مرئی
وجود سے باتیں کرتا رہتا ہے۔

فرح اسلم قریشی

ویران مکان

میں نے دیکھا، اس ویران مکان کی چھت پر بنی
منڈیر پر بہت بڑا کالا بلا بیٹھا ہے، مجھے دیکھ کر وہ
کھڑا ہو گیا اور اپنی زبان نکال کر بچے چائے لگا۔
اس کی زبان اتنی تپتی تھی کہ سانپ کا گمان ہو رہا تھا۔

ان آئینی بلاؤں کا قصہ، جنہوں نے انسانوں کا جینا حرام کر دیا تھا

وہ جگہ زرد رنگ کا ویران مکان تھا جس نے
سانے پھیل کا ایک بے حد پرانا درخت تھا جس کی
چھالیں درخت کے درمیان لگی ہوئی تھیں اسی
پسندیدہ مشغلہ تھا مگر ایک روز بڑی عجیب
درخت کی وجہ سے ہر وقت مکان کے ارد گرد سوکھے ہوئے۔



مسجد کے پیش امام کا سب سے چھوٹا بچہ جس کی
عمر تقریباً چار سال تھی وہ ان خشک پتوں پر پاؤں
رکھ رکھ کر ان سے پیدا ہونے والی آواز سے خوش
ہو رہا تھا کہ اچانک اس نے رونا شروع کر دیا
دوسرے بچوں نے رونے کی وجہ جاننا چاہی تو پتہ
چلا کہ اس کا بابا پاؤں پتوں کے اندر زمین میں
دھس گیا ہے اور کسی طور نکلنے کا نام نہیں لے رہا، محلے
کے بچے بھاگے بھاگے امام صاحب کو بلا کر لے
آئے ان کے آتے ہی زمین نے بچے کا پاؤں
چھوڑ دیا اور وہ امام صاحب کے سامنے دھب سے
گرا۔ امام صاحب اسے اٹھا کر گھر لے گئے مگر بدن
اس کی وہ ٹانگ سوکھتی چلی گئی اور بالآخر وہ اس
ٹانگ سے معذور ہو گیا۔ اس کی ٹانگ چونکہ نیلی
ہو چکی تھی اس لیے سب کا خیال تھا کہ ٹانگ میں
پتوں میں سے کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا ہے
کیونکہ اس درخت کی پڑ چوٹوں، جھینگروں اور
دیگر کیڑوں مکوڑوں کا مسکن تھا جس میں محلے کے
بچے آنا، چینی اور چاول وغیرہ ڈالتے رہتے تھے۔
یہ بات بھی حیران کن تھی کہ چاہے جتنا بھی اناج
ڈالا جائے اگر تھوڑی دیر بعد ہی وہاں دیکھا جاتا تو
وہاں ایک دانے کا بھی نام و نشان نہ ہوتا۔ بچے
جس میں گھنٹوں گھات لگائے بیٹھے رہتے کہ
دیکھیں یہ کیڑے اتنی جلدی اپنا کھانا بلاؤں میں کیسے
لے جاتے ہیں؟ مگر جب تک بچے وہاں رہتے
دانہ جوں کا توں پڑا رہتا اور جہاں وہ چندھوں کے
لیے بھی ادھر ادھر ہوتے دانہ قائب.....

اسی مکان کے دائیں جانب رؤف چاچا کا گھر
تھا جبکہ بائیں طرف خالی پلاٹ تھا جہاں کچھ عرصہ
پہلے تک محلے کے لوگ کچرا ڈالا کرتے تھے مگر پھر
شہری حکومت نے وہاں سے کچرے کا ڈھیر اٹھوایا تو
بچوں کو کھیلنے کی اچھی جگہ میسر آ گئی اس لیے وہاں کچرا

اطلاع

فیصل آباد میں پرچندہ ملنے کی صورت
میں ملک افتخار برادر نیوز ایجنٹ
سے رابطہ کریں۔

ملک آصف: 0333-6539585

ڈالنا بند کر دیا گیا۔ محلے کے زیادہ تر افراد ان پڑھ
تھے حتیٰ کہ دین کی بنیادی باتیں بھی چند ہی لوگوں
کے علم میں تھیں۔ ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر پیش امام
صاحب ہی کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس مضافاتی
محلے کی چھوٹی سی مسجد میں جھاڑو لگانے والے تو بہت
تھے مگر نمازی کوئی کوئی..... یہ وہ لوگ تھے جن کا رشتہ
مذہب سے بے شک کچا تھا مگر عقیدے سے بڑا ہی
پکا۔ عقیدے کی اسی ڈور نے انہیں مذہب سے
مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ اگر کسی کے پیٹ میں درد
بھی ہوتا تو پہلے وہ امام صاحب سے جھڑواتا پھر ڈاکٹر
صاحب کے پاس جاتا۔ عقیدے کی اسی برکت نے
محلے والوں کو ایک دوسرے کے قریب کر رکھا تھا۔
آپس میں لاکھ اختلافات ہوں مگر گھر میں پٹنے
والے بچے کو بھی محلے والے ہی بچانے آ جاتے
تھے۔

رؤف چاچا کے گھر کے ساتھ کن خالہ کا دروازہ
تھا۔ کن خالہ بیوہ تھیں ان کے تین بچے تھے دونوں
بیٹیاں رقیہ اور عظمیٰ جوان تھیں جبکہ سب سے چھوٹا
امجد دس سال کا تھا۔ کن خالہ نے اپنے گھر میں ہی
کریانے کی دکان کھولی ہوئی تھی۔ ان کے میکے اور
سسرال دونوں طرف سے بھی ان کو خاص مدد مل جاتی
تھی۔ کن خالہ کی رقیہ بڑی خوبصورت تھی۔ خاص
طور پر اس کا رنگ اور کالے سیاہ لمبے بال۔ دوسرے

وہ تھی بھی بڑی سلیقہ مند اسی لیے خالہ کو اس کے رشتے کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑی۔ ان کے رشتہ داروں میں ہی رقیہ کا رشتہ طے ہو گیا۔

یہ رقیہ کا رشتہ طے ہونے کے پندرہ دن بعد کی بات ہے کہ اسی محلے میں رہنے والی خالہ شیرین کے بیٹے مقصود نے ان کا دروازہ بجایا۔ اکن خالہ نے دروازہ کھولا تو مقصود کے ساتھ کوئی اجنبی یوزمی عورت کھڑی تھی۔

”خالہ.....! یہ میرے دوست ریاست کی امی ہیں، آپ سے ملنے آئی ہیں۔“ مقصود کے کہنے پر خالہ حیران ہوئی انہیں اندر لے آئیں۔ بات کرنے پر پتہ چلا کہ وہ رقیہ کے رشتے کے لیے آئی تھیں۔

خالہ بولیں۔ ”میری بچی کی تو بات کچی ہو گئی ہے، گیارہویں میں پیار بھی دے دوں گی۔“

بڑی بی مبارک باد دے کر چل دیں مگر خالہ
حیران ہوئی رہیں کہ یہ اگلے محلے سے کیا رشتہ لے
کر آئیں گے؟ جان نہ پہچان؟ مگر انہیں معلوم نہیں تھا
کہ ریاست کا مقصود سے بڑا ارادہ تھا اس لیے وہ
اکثر ان کے محلے میں آتا رہتا تھا، اسی آنے جانے
میں اس نے رقیہ کو کچھ لیا اور تب سے کبھی کبھی کا
آنا جانا روز کا معمول بن گیا تھا مگر اس بات کا صرف
مقصود کو ہی یہ تھا۔

مقصود کو جب خالہ کے انکار کا پتہ چلا تو وہ خود بات کرنے پہنچ گیا اور ریاست کی دھمروں سے تعریفیں کر دیں مگر خالہ جو اس کے اصرار پر لحاظ میں نہیں ہو سکتا۔ کہے جا رہی تھیں آخر میں چہرہ کہ مقصود کو صاف منہ کر دیا اور بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے

محلے کے سارے ہی گھروں میں تیاریاں بھی بڑھتی
ہی جا رہی تھیں کہ یہ ان کے محلے میں کسی بچی کی پہلی
شادی تھی۔ خالہ نے بھی محلے والوں کو رشتہ داروں کی
طرح ہر کام میں شریک کر رکھا تھا۔ کسی گھر میں
جوڑے تنگ رہے تھے تو کسی کے گھر کوئے کنارے
لگ رہے تھے۔ محلے کے نوجوان شادی اور مایوں
والے دن کے لیے مہمانوں کو بٹھانے کے لیے ٹینٹ
لگانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ فیصلہ ہوا، گھر
کے سامنے گلی میں ہی ٹینٹ لگا دیا جائے گا مگر یہ بھی
محض اتفاق ہی تھا کہ ابٹن سے ایک دن پہلے گلی کے
کسٹر بھر گئے اور گنداپانی باہر اٹنے لگا۔ سب پریشان
ہو گئے۔ آخر میں سوچا، اس زرد رنگ کے گھر کے
برابر میں پڑے خالی پلاٹ پر ٹینٹ لگا لیتے ہیں۔
محلے کے تمام لڑکے وہاں کی صفائی میں جت گئے۔
روف چاچا نے جو دکھا تو منع کر دیا کہ یہاں ٹینٹ
نہ لگاؤ۔ پوچھا گیا۔ ”کیوں؟“

تو بولے۔ ”میں کچھ دن پہلے کسی سے مل کر رات کے دو بجے گھر آ رہا تھا تو دیکھا اس ویران مکان کی چھت پر بنی منڈیر پر بہت بڑا کالا بلا بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنی زبان نکال کر چنچے چاٹنے لگا اس کی زبان اتنی لمبی تھی کہ اس پر سانپ کا لکناں ہو رہا تھا پھر وہ بلا اس پلاٹ پر کود گیا۔۔۔“

لڑکوں نے سنا تو ہنسنا شروع کر دیا۔ ”کیا چاہا“
تم بھی..... یہ کوئی بات ہے ڈرنے کی؟ رات کا
اندھیرا تھا سائے کی وجہ سے زبان لمبی نظر آ رہی
ہوگی اور یہ گھر کب سے ویران پڑا ہے۔ ہم نے تو
آج تک یہاں کچھ نہیں دیکھا اور دے بھی مجبوری
ہے پوری گلی گندی ہو رہی ہے اس لیے میںیں تنہو لگا
پڑے گا۔“

لڑکوں نے تنبوا لوں کو بلایا اور مایوں کے لیے

پنڈال سجاد دیا گیا۔ لڑکوں نے پنڈال سجانے میں بڑی محنت کی تھی اس لیے پنڈال بنا بھی بہت خوبصورت جس نے دیکھا تعریف کی۔

شام ہوئی تو مہمان بھی آنا شروع ہو گئے۔ رقیہ کو اس کی سہیلیوں نے موتیا کے پھولوں سے سایا تھا۔ زرد جوڑے میں موتیا کے پھولوں سے بنی رقیہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ابھی رقیہ کو اسٹانچ پر آ کر بیٹھے ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور تقریب میں ٹھوڑی افراتفری سی مچ گئی۔ اچانک ہی رقیہ کی خوفناک چیخ سنائی دی اور پھر فوراً ہی لائٹ بھی آ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ روشنی میں دیکھا تو رقیہ اسٹانچ پر بے ہوش پڑی تھی ہر طرف ہلچل مچ گئی، اسے ہوش میں لانے کی ساری تدبیریں آزمائی گئیں مگر سب بیکار گئیں۔

اچانک مقصود اکن خالہ کے پاس آ کر بولا۔
 ”خالہ.....! رقیہ کو فوراً اسپتال لے چلو۔“

اکن خالہ تو پہلے ہی بدحواس ہو رہی تھیں، فوراً بولیں۔ ”چلو۔۔۔۔۔“ مقصود نے ریاست سے کہا کہ اپنا رکشہ لے آئے، یہیں ریاست کے رکشہ لاتے ہی اکن خالہ رقیہ اور مقصود رکشے میں بیٹھ گئے۔

”خالہ.....! تم امجد کو بتا دو کہ ہم شی اسپتال جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو وہ سامنے کھڑا ہے۔“ مقصود نے اکن خالہ کے بیٹے کی طرف اشارہ کیا اور اکن خالہ جلدی سے اتر کر اس کے پاس دوڑیں۔ اسی اثناء میں ریاست نے رکشہ اشارت کیا اور رقیہ کو لے کر جا اور وہ جا.....

دراصل اکن خالہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مقصود اور ریاست نے اس نازک صورت حال میں کیسا شیطانی منصوبہ بنالیا ہے۔ ریاست کو اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا جو اکن خالہ

غزل

رنگِ محبت سے روح میری سنوار دو
اپنے اسیرِ وفا کو اک شامِ ادھار دو

اپنی کم مائیگی سے رنجور ہے دل ناداں
اپنی قربتوں سے یہ بوجھ بھی اتار دو

فرصت ملے تو آئینہ دل میں ذرا جھانکنا
تپشِ عشقِ پیہم سے ہمیں بھی گزار دو

سنگ و خار کے لاؤ لشکر ہیں سبھی کے پاس
میں دیوانہ ہوں سزائے وصل بار بار دو

عشق مجازی تو ہے راہ سلوک کی پہلی منزل
نوید دل بے قرار کو تابندگی قرار

محمد نویڈ رحمت

میرے شہر کی کہانی

شہر کراچی میں جنم لینے والی کہانیوں کا نیا خاص سلسلہ

ارم زہرا

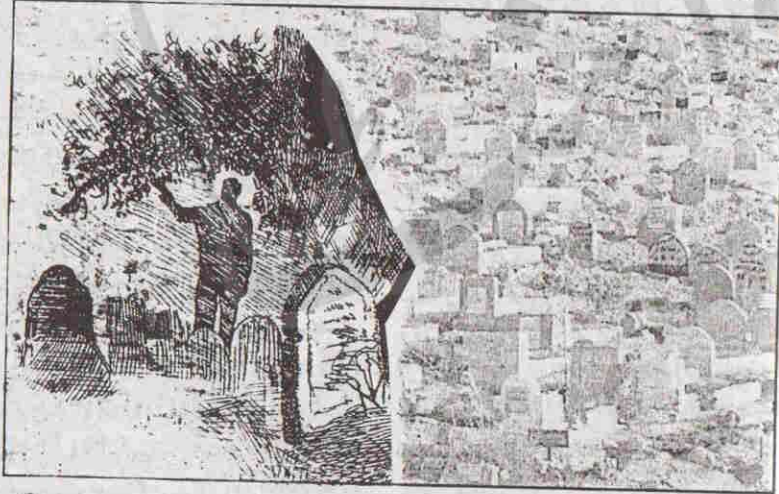


شاہد بخاری کا خیال

مرگ سا مسلط ہے ہر نفس کے چہرے پر
ساز زندگی چھیڑوں سکیوں میں جیٹوں میں

مردہ مردوں کو تنہا رہنے والے ایک ہون پرست کی زندگی کی کہانی

غروب آفتاب کا وقت تھا۔ شہر کراچی میں واقع پاپوش نگر قبرستان میں بھیڑ تھی۔ حسرت ویاس کا ہاں تھا اداسی کی کیفیت ہر چہرے سے عیاں تھی۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہ سب لوگ اپنی ایک عزیزہ کی تدفین کے لیے جمع تھے۔ قبر کھودی گئی، متوفیہ کا آخری دیدار ہوا، ہر آنکھ اشکبار ہوئی، جسے زندگی بھر خود سے قریب رکھا تھا آج اسے پاک کر کے، کفن لینے آخری آرام گاہ



بتایا جس پر رقیہ کا فوراً روحانی علاج شروع کر دیا گیا۔ اس بے چاری کی شادی تو کیا ہوئی، سالوں اس کا علاج چلتا رہا۔ اس کے گھر والے جو پہلے غریب تھے اس کی وجہ سے مفلس ہو گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔

جس رات اس کا انتقال ہوا، ان کے گھر میں بار بار وہ کالا بلا کو دتا رہا جس کے بارے میں رؤف چاچا نے سب کو بتایا تھا۔ غسل دینے والی جب رقیہ کی میت کو غسل دے رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ اس کے جسم پر جگہ جگہ دانٹوں اور نیکل کے نشانات تھے۔ اس حسین، گوری چٹیل کی کارنگ جھلس گیا تھا۔ ادھر ریاست اور مقصود دونوں یکے بعد دیگرے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ یہ رقیہ کے مرنے سے چند دن پہلے کی بات تھی کہ مقصود کی ماں روتی ہوئی سب کے دروازے پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی۔

”ارے دیکھو..... میرا مقصود مر گیا.....“ محلے والوں نے جا کر دیکھا تو اس کی گردن منکے میں پھنسی ہوئی تھی اور دھڑ باہر تھا اور وہ اسی حالت میں مر گیا تھا۔

ریاست پہلے تو کسی شدید قسم کی جلدی بیماری میں مبتلا ہوا، اس کے بعد وہ بھی بہت بری حالت میں اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ ان دونوں کے مرنے کے بعد رقیہ بھی مر گئی۔

رؤف چاچا سمیت بہت سے محلے والوں نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا اور کئی سال تک یہ ہوتا رہا کہ اس ویران گھر کے باہر لگے پتیل کے درخت کی جڑ میں اکثر کوئی کتاب یا بلی اس طرح مردہ حالت میں ملنے جیسے کسی نے ان کی گردن چبا لی ہو.....

اس محلے کی وہ زمین چونکہ الاٹ نہیں تھی لہذا اس جگہ پر بلڈوزر پھیر کر اب وہاں کمرشل پلازہ بنادیا گیا ہے۔

کے انکار کے بعد اسے محسوس ہوئی تھی اور مقصود نے سوچا، بے غیرتی کی اس بھتی گنگا میں وہ بھی ہاتھ دھو لے گا اس لیے وہ بھی ریاست کے شیطانی منصوبے میں شامل ہو گیا۔

وہ رقیہ کو لے کر ریاست کے گھر پہنچ گئے جہاں اس کی اماں اپنی بیٹی کے گھر گئی ہوئی تھی، یوں ریاست کا گھر اکیلا تھا۔ وہ دونوں اسے بری نیت سے اٹھا کر لے تو آئے مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ ان سے بھی پہلے اس زرد رنگ کے ویران مکان میں بیٹا کرنے والی آتش تخلق رقیہ پر بری طرح نذا ہو گئی ہے، اسی لیے تو رقیہ چیخ مار کر بے ہوش ہوئی تھی اور وہ آتش تخلق بھی ان ہی کی طرح شیطان صفت تھی پھر ہلا وہ رقیہ کو ان کے حوالے کیسے ہونے دیتی؟

ریاست کے گھر پہنچتے ہی رقیہ کو ہوش آ گیا تھا اور ریاست نے جوں ہی پیش قدمی کرنا چاہی وہ پھر کر کھڑی ہو گئی اور اس کی آواز بھی بدل گئی۔ اس نے ریاست کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پھینک دیا جس سے ریاست کا دایاں ہاتھ ٹوٹ کر ٹک گیا۔ یہ بی نہیں بلکہ ریاست کے گھر ایک بلی پللی ہوئی تھی۔ رقیہ کے ہوش میں آتے ہی بلی نے پورے کمرے میں چیختے ہوئے دوڑنا شروع کر دیا تھا مگر چونکہ دروازہ بند تھا اس لیے وہ باہر نہ جا سکی۔ رقیہ نے ایک جست میں بلی کو پکڑا اور اس کی گردن چبا گئی۔ بلی کا سارا خون اس نے اپنی زبان سے چاٹا اور جو خون زمین پر گرا تھا اسے کھڑے کھڑے زبان نکال کر چاٹ گئی اس کی اتنی لمبی زبان دیکھ کر مقصود بے ہوش ہو گیا۔ اتنے میں محلے والے بھی پہنچ گئے۔ وہ رقیہ کو لے کر گھر آ گئے اور لڑکوں نے مقصود اور ریاست کو بہت مارا، ان دونوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا شیطانی منصوبہ سب کو بتا دیا بلکہ رقیہ کی حالت کے بارے میں بھی

موسم بہار میں ہوائیں مار گئیں
دور سے جوائیں تھیں و مہدائیں مار گئیں
دیکھ دیکھ کر زندہ رہتے تھے ہم جن کو
اک دن ہم کو وہی ادا نہیں مار گئیں
لحہ لہ یوں تیرے خوابوں کا چل نہ اڑتا تویر
بس کچھ پردہ نشینوں کی بددعائیں مار گئیں

نور خالد

مقدمہ نمبر ۲۰۱۱/۵۱۶۲ زیر دفعات ۲۹۷ (مردوں کی بے حرمتی) ۳۷۶ (مردہ خواتین سے زنا) A/354 اور 377 کے تحت درج کر لیا ہے۔ ملزم نے یہ بھی انکشاف کیا کہ قبرستان جرائم کے گڑھ بنے ہوئے ہیں۔ ان قبرستانوں کے ارد گرد پولیس بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالوں تک قبرستان میں یہ قبیح گناہ ہوتا رہا اور پولیس بے خبر تھی۔ شہر کے وسط میں موجود قبرستانوں میں لاقانونیت کی یہ حالت ہے تو دور دراز کے علاقوں میں کیا صورت ہوگی۔ کراچی میں واقع ۱۸۹ قبرستانوں میں تدفین کا ریکارڈ تک نہیں رکھا جاتا، تاہم شہری حکومت کے شعبہ قبرستان کے انچارج محمود عالم صدیقی نے ہر قبرستان میں ایک رجسٹر رکھوا دیا ہے جس میں انٹری کر کے رسید کاٹ دی جاتی ہے۔ امیراجیم حیدری، عیسیٰ مگزی، کورنگی پاک، کالونی قبرستان، علی اکبر شاہ، کٹھ شیر شاہ، مواچہ کٹھ اور میوہ شاہ قبرستانوں میں انسانی ہڈیاں چوری کرنے کے واقعات، منکشات کا استعمال اور فروخت بھی عام ہے اور کئی افراد پکڑے بھی گئے ہیں مگر صورت حال پھر بھی وہیں کی وہیں ہے۔ یہ تمام گناہ ایک طرف مگر خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کا

پچھے دوڑے اور جب اسے پکڑ کر تفصیلات معلوم کی گئیں تو اس نے بتایا کہ وہ ایک عورت کی قبر میں میت کی بے حرمتی کی نیت سے گستاھا مگر قبر کے اندر لاش کی کھلی آنکھوں سے نکلتی روشنی، بکھرے بال اور دانتوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور باہر آ گیا۔ وہ شخص یہ غیر معمولی منظر دیکھ کر اس قدر خوف زدہ تھا کہ بر ملا اپنے جرم کا اعتراف کر بیٹھا۔ لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا جہاں تفتیش کے بعد کئی حقائق کھل کر سامنے آئے۔ انکشاف ہوا کہ اس قبیح گناہ کا ارتکاب کرنے والے ۲۷ سالہ مجرم محمد ریاض کا تعلق سرگودھا سے ہے اور وہ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ کراچی آ گیا تھا۔ محمد ریاض کے ۳ بھائی اور ۳ بہنیں ہیں جبکہ والدین نصرت بھٹو کالونی میں رہتے ہیں اور اسے اپنے ایک رشتے دار نوشاد کی مدد سے پاپوش مگر قبرستان میں کام پر رکھا گیا تھا جہاں مجرم قبروں پر پانی ڈال کر لوگوں سے اجرت لیتا تھا مگر کچھ ہی عرصے میں اس نے قبرستان کو ہی اپنا ڈیرہ بنا لیا اور گھر جانا چھوڑ دیا۔ قبرستان میں اس کی دوستی نشہ کرنے والے ایک شخص وزیر عرف وزیر سے ہوئی جس نے خواتین کی قبروں کی بے حرمتی کے طریقے بتائے۔ دونوں مل کر یہ کام کرتے تھے مگر کچھ عرصہ قبل وزیر ازیادہ ہیر وٹن پینے کی وجہ سے قبرستان میں ہی مر گیا اور ریاض تنہا ہی یہ فعل کرتا رہا۔ مجرم نے ۸ سال کے عرصے میں ۵۰ سے زیادہ خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ریاض نے بتایا کہ وہ قبرستان میں تدفین کی عمرانی کرتا تھا اور جب کسی خاتون کو دفنایا جاتا تو وہ رات کو سوچ دیکھ کر قبر کشائی کرتا اور موبائل کی ٹارچ جلا کر قبر میں گھس کر لاشوں کی بے حرمتی کرتا۔ یہ گناہ اسی طرح جاری رہتا اگر اس رات قبر کا دل دہلانے والا منظر اسے خوف زدہ نہ کرتا اور مجرم وہاں سے بھاگنے پر مجبور نہ ہوتا۔ ناظم آباد پولیس نے ملزم ریاض کے خلاف

آنکھیں اس وقت بھی نور کا ہالہ بنے روشن تھیں، نکھرے بال اور ظاہر دانت اسے مقصد میں ناکام کرنے کے درپے تھے۔ وہ آنکھیں مرنے کے بعد بھی اپنا تحفظ چاہتی تھیں اور پوچھتی تھیں کہ کیا اس طے شدہ امتحان کے بعد بھی کوئی امتحان باقی ہے؟ کیا حوا کی بیٹی کو مرنے کے بعد بھی ”تحفظ“ میسر نہیں؟ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر لرز اڑا اور بھاگا۔ اگلے چند لمحوں میں قبرستان ”بچاؤ..... بچاؤ.....“ کی چیخوں سے کوں اٹھا۔

انسانوں کی آخری آرام گاہ کے لیے بنائے جانے والے قبرستان اب جرائم پیشہ افراد کی پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں پھر چاہے معاملہ اسلحہ چھپانے کا ہو منکشات کے اڈے چلانے کا کالے جادوؤں کے لیے انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں چرانے کا پیسوں کے حصول کے لیے قبر کشائی کر کے مردے بیچنے کا یا پھر مجرموں کے چھپنے کے لیے محفوظ مقام کا حصول ہو، یہ قبرستان ہر جرم میں سرفہرست استعمال ہو رہے ہیں شاید اس لیے کہ یہاں کے کیلن اب سدا کے لیے خاموش ہو چکے، وہ دنیا کے سامنے ان جرائم کا راز فاش نہیں کر سکیں گے اور شاید اس لیے بھی کہ پولیس اور انتظامیہ جب زندہ لوگوں کا تحفظ ممکن نہیں بنا پا رہی تو ان مردوں کی طرف کس کی توجہ جاتی؟ قبرستانوں میں ان جرائم کے وجود سے تو کوئی بھی ناواقف نہیں مگر ۲۹ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو شہر کے وسط میں واقع ایک قبرستان میں ہونے والے ایک واقعہ نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ برقی رفتار میڈیا نے اس دردناک خبر کو جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دیا جس نے سننے والوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا انسانیت اپنے پست مقام تک پہنچ چکی ہے؟ ہوا کچھ یوں تھا کہ ۲۹ اکتوبر کو کراچی میں واقع پاپوش مگر قبرستان میں ایک شخص چیخا ہوا بھاگ رہا تھا۔ حقیقت دریافت کرنے کے لیے کئی لوگ اس کے

میں اتارا گیا، ڈھیروں دُعاؤں کے ساتھ لحد کے حوالے کیا گیا کہ اب اس نے وہیں رہنا ہے۔ اس صور کے پھونکنے جانے تک جب سب اپنے رُب کے سامنے جواب دہ ہوں گے، جزا پائیں گے اپنے ایک اعمال کی اور سزا پائیں گے اپنے گناہوں کی۔ اس وقت تک یہ قبر ہی وہ ٹھکانہ ہے جو اس فانی دنیا سے لافانی دنیا کی طرف سفر میں اس بے جان جسم کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ اس عورت کو لحد میں اتار کر سلیب رکھی گئی، مٹی ڈالی گئی، پھول رکھے گئے، قبر پر ڈھیروں انوار رحمت اور مغفرت کی دُعا میں کی گئیں پھر تھکے ہارے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی واپسی کو پلٹے اور دور دورے ہوتے ہوتے بالآخر اوجھل ہو گئے۔

قبر کے اندر اب ایک نئے سفر کا آغاز تھا، ایک نیا امتحان ہوتا تھا، زندگی کے ہزاروں سوالوں کے بعد موت صرف تین سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔ ”تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ تمہارا نبی کون ہے؟“

مگر یہ کیا دور بیٹھا ایک شخص چپ کر اس قبر کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔ رات یونہی اپنی تاریکی میں ڈوبتی گئی، شہر نیند کی آغوش میں بے خبر سوتا رہا، مردوں سے آباد یہ قبرستان وحشت کا سماں پیش کر رہا تھا۔ رات کی بڑھتی تاریکی اس شخص کے حوصلے بلند کر رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھا، اپنے قدم اس قبر کی جانب بڑھا تا رہا، چلتے چلتے کبھی دائیں، کبھی بائیں دیکھتا کہ کہیں کوئی نظر اس کا تعاقب تو نہیں کر رہی؟ اس حقیقت سے بے نیاز کہ اس تاریکی میں بھی اس کو تخلیق کرنے والا اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ قبر کے پاؤں والی جانب سے وہ مٹی ہٹاتا گیا اور پھر وہ اس قبر میں موبائل کی روشنی اور گناہوں کی تاریکی سمیت داخل ہوا۔ اپنے ناپاک عزائم کو حتیٰ شکل اپنے لیے جب اس نے لاش کو دیکھا تو وہ مردہ

...اور تم



کاشی چوہان

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت
شاعری سے سجا مجموعہ کلام.....

شاعر کا چہرہ



تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

دو شہرہ اور بھی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی
ڈسکاؤنٹ - کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے
ہاتھ میں - ڈکوی ڈاک خرچ اور ڈکوی دوسرا خرچ -
پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال
نیچے، کتاب آپ کی دلچسپ نگاہیں بچا دی جائے گی۔

دبائے کے لیے

0307-2089080

0345-2540616

اُس کی قبر کے پیروں کی طرف سے قبر کی مٹی ہٹا
کر....." احساسات سے عاری وہ شخص مجھے جہنی
مریض لگا تھا جو اس وقت سپاٹ چہرہ لیے سلاخوں
کے پیچھے کھڑا تھا۔
"وزیر کہاں ہے اب؟" میں نے اگلا سوال کیا
تھا۔

"وہ سلاخوں کی زیادتی کی وجہ سے کب کا
مر گیا....." وہ بوئے اطمینان بھرے لہجے میں بولا
تھا۔
"اتنا قبیح گناہ کرنے کے باوجود تم کتنے
اطمینان سے کھڑے ہو اور ڈھٹائی سے سب کچھ بتا
رہے ہو؟ رات کے اندھیرے میں لوگ قبرستان کی
طرف رخ کرنے سے ڈرتے ہیں اور تم اسی
اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر....."

"ہم تو قبرستان کے پاس ہیں، ہمیں یہ اندھیرا
نہیں ڈراتا اور پھر موبائل فون نارنج کی روشنی میں قبر
کے اندر اترنا آسان ہے اور پھر مردہ عورتوں سے کیا
ڈرتا؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ "میں گزشتہ
آٹھ سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں اب تک ۲۸ سے
زائد خواتین کی قبریں چاک کر چکا ہوں۔" وہ
ڈھٹائی سے بتا رہا تھا۔

"کیا تمہیں موت کا خوف نہیں ہے؟ تمہیں
مخصوص قبریں کھودتے ہوئے ذرا بھی ڈر محسوس نہیں
ہوا کہ تم کتنا گھناؤنا کام کر رہے ہو؟ تم تو جنگل میں
رہنے والے جانوروں سے بھی بدتر ہو تم خود کو انسان
سمجھتے ہو تم جیوان ہو جیوان....." میں غصے میں چیخی
تھی۔ "کتنی بہنیں ہیں تمہاری؟"
"تین بہنیں ہیں میری۔" وہ آہستگی سے بولا
تھا۔

"اگر کل تمہاری بہن کا انتقال ہوتا ہے اور کوئی
اس کی قبر چاک کر کے اس کے مردہ جسم کے ساتھ یہ

سیاہی مل دی ہے۔ یہ شخص دنیا میں مسلمانوں کی جگہ
ہنسائی کا سبب بن گیا ہے اور آج میں اس شخص سے
گفتگو پر مجبور ہوئی ہوں جس کی میں شکل تک دیکھنا
نہیں چاہتی مگر میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی
خاطر حوالات کے دروازے پر کھڑی ہوں اور اس
بے غیرت، کمینہ صفت شخص سے مخاطب ہوں۔
"میری طرف دیکھو....." میں نے اس کے
بھٹکے کو مخاطب کیا تھا۔ "مجھے سچی کہانیاں" کے سلسلے
"میرے شہر کی کہانی" کے لیے تمہارے غلیظ
خیالات جاننے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ کیا نام
ہے تمہارا؟"

"محمد ریاض۔" وہ بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے
بولا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی کہ جن قبروں کی رکھوالی کا
کام تمہیں سونپا گیا تھا؟ تم انہی قبروں کی حتمی
کرنے لگے؟" میری آنسوؤں سے لبریز آنکھوں
میں اس کا سراپا دھندلا نظر آ رہا تھا۔

"ہاں، بس غلطی ہو گئی پہلے تو میرا دوست وزیر
عرف وزیر ایہ کام کرتا تھا، اے نے مجھے اس لت میں
بتلا کیا، اسے کیوں نہیں پکڑا تمہاری پولیس نے؟
کہاں تھیں تم اس وقت؟" وہ اپنی لال بھبھوکا
آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی نظریں کھا
جانے والی تھیں۔

"وزیر.....؟" میں نے نفرت سے اس کے
سراپے پر سوالیہ نظر دوڑائی تھی۔

"ہاں، وہی وزیر جو ہیروئن کے نشے کا
عادی تھا وہ دن بھر نشہ کر کے وہیں قبرستان میں پڑا
رہتا تھا۔ اسی نے تو مجھے اس کام کی طرف راغب کیا
تھا۔ وزیر اور میں دن میں یہ نوٹ کرتے تھے کہ دفن
ہونے والی میت مرد کی ہے یا عورت کی اور جب کسی
عورت کی میت دفن کی جاتی تو ہم دونوں رات میں

واقعہ انسانی عقل اور فطرت سے ماورا ہے۔ ذہن یہ
سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا اس دنیا میں صلیب نازک کو
بھی "تحفظ" مل پائے گا؟ وہی عورت جو ماں
کے روپ میں جنت، بہن کی شکل میں محبت و
شفقت، بیوی ہو تو نصف ایمان کی حفاظت اور بیٹی
کے روپ میں رحمت بن کر برستی ہے، نبھانے پھر بھی
تحفظ کے لیے کیوں در بدر بھٹکتی ہے؟ دنیا میں اس حق
کے لیے جدوجہد کرتے کرتے جب وہ تھک ہار کر قبر
میں سوئی ہے کہ شاید یہاں اُسے سکون مل پائے
مگر اب لگتا ہے کہ اس دنیا میں مرنے کے بعد بھی
اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔

اس شخص کو درندہ کہوں یا شیطان، نہیں، نہیں،
درندہ تو نہیں، یہ شخص تو زندگی کے وضع کردہ اصولوں
سے بھی نیچے جا کر، یہ تو بے غیرتی اور کمینگی کی
انتہاؤں پر ہے۔ میں جوں جوں اس گدھ نما شخص کی
کہانی میں الجھتی جا رہی ہوں، میرے اعصاب شکل
ہوتے جا رہے ہیں۔ جسم پر پکپکاہٹ طاری ہے کہ
چند سطریں لکھنے کے بعد قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ
جاتا ہے۔ یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ ٹی وی چینلوں
اور اخبارات میں قبروں سے مڑے نکال کر ان کے
گوشت کو پکا کر کھانے والے انسان نما درندوں کی
دستاویز پیش کی جا رہی تھیں جنہیں دیکھ اور سن کر
میرے ذہن میں ایک طوفان برپا ہو رہا تھا اور پھر
میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ بعض لوگ قبروں
سے مردوں کی ہڈیاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ ابھی
میں "سچی کہانیاں" کے سلسلے "میرے شہر کی کہانی"
میں انسانی ہڈیوں کے ان بیوپاریوں کا پردہ چاک
کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ پاپوش نگر کے قبرستان
میں ایک ایسا بد بخت، تنگ انسانیت شخص پکڑا گیا ہے
جس نے پاکستان کی پوری سوسائٹی کے چہرے پر

فوج عمل کرے تو تم کیا کرو گے؟“

”میں اسے قتل کر دوں گا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں اٹنے لگی تھیں اور چہرہ جذبات کی حدت سے تپنے لگا تھا۔ ”ایسے شخص کو جان سے مار دینا چاہیے۔“

”اچھا اپنی بہن کی بات آئی ہے تو اسے جان سے مار دینا چاہیے اور تمہارے لیے کیا سزا تجویز کی جانی چاہیے؟“

”میں پھانسی کے لیے تیار ہوں لیکن میں تو یہ کر چکا ہوں اس لیے مجھے معافی مل جائے گی۔“ وہ بہت اطمینان کے ساتھ بولا تھا۔

”تمہیں تو اتنی عبرت ناک سزا ملنی چاہیے کہ پھر کوئی ایسا عمل کرنا تو دور کی بات ایسا سوچنے کے بھی قابل نہیں رہے۔“

”کہہ تو دیا کہ اب دوبارہ ایسا گناہ نہیں ہوگا۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا تھا۔

”تم ہوش میں ہو؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم خود کو انسان کہتے ہو؟ بے غیرت آدمی؟ تم عورت کی تدفین کے بعد وہ وقت جب مردہ فٹار قبر و شہت قبر کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے اس وقت تم اس کے کفن کو ہٹا کر اس کے جسم کی بے حرمتی کرتے ہو؟ ایسا کرتے ہوئے تمہارے اندر خدا کا خوف بیدار نہیں ہوا؟“ میں شدت غم اور غصے سے بے حال ہو چکی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس کا چہرہ ملانچوں سے سرخ کر دوں۔

”اللہ معافی دے۔ مجھے اس کام کی لت وزیرا نے لگائی تھی ورنہ میں ایسا نہیں تھا۔ پولیس کو بھی میں نے یہ بیان دیا ہے کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔“ وہ بے خوفی سے بول رہا تھا۔

”وزیر اکبر سے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”دو سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔“

”کبھی تم پر کسی کو شک نہیں ہوا کہ تم قبرستان میں کس فوج جرم کا ارتکاب کر رہے ہو؟“

”ایک رات میں قبر کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ وہ ایک میں بائیس سالہ لڑکی کی قبر تھی۔ دوسرے دن جب اس لڑکی کے گھر والے قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے تو قبر کھلی ہوئی تھی اور کفن ہٹا ہوا تھا۔ یہ ناقابل برداشت حالت دیکھ کر انہوں نے شور مچایا تو کچھ لوگوں نے مجھ پر شک کرنا شروع کر دیا۔ تب میں یہاں سے بھاگ گیا اور پھر میں دیکھ کر سال سرکودھا رہ کر واپس آیا تھا۔“

”اور تم نے واپس آتے ہی دوبارہ یہ کام شروع کر دیا۔ لعنت ہو تم پر۔“

”ہاں لیکن میں نے کہا تو ہے کہ اب میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں بہت ڈر گیا ہوں۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا تے ہوئے بولا تھا۔

”آخری بار جب تم قبر میں گھسے تھے تو کیا ہوا تھا؟“

”میں مغرب کے بعد اس قبر کی پاؤں کی طرف سے مٹی ہٹا کر سلیب سرکا کے اندر گھسا تو موبائل روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس عورت کے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہے۔ بس میں ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ اب تو میں نے تو یہ کہہ کر لی کہ آئندہ قبر کھودنا تو دوسری قبرستان میں کام کرنا ہی چھوڑ دوں گا۔“

”تم کتنے سفاک ہو اتنا بڑا جرم کر کے کتنی آسانی سے اعتراف کر رہے ہو؟ تمہیں تو کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے کہ وہ تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیں۔“

”بس اب کیا کیا جائے، ہوئی غلطی مان تو لیا میں نے اپنا قصور۔“ وہ ڈھٹائی سے بولتا ہوا سلاخوں

سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں اس پر نفرت بھری نظر اٹاتی باہر آ گئی تھی جہاں ڈی ایس پی صاحب میرے منتظر تھے۔

”ڈی ایس پی صاحب! میں نے ٹارگٹ کلنگ چوری ڈاکے پوری بند لائیں یہ سارے ہی قصبے سے ہیں لیکن ایسی بربریت ایسی سفاکیت اپنی نوعیت کا بالکل ہی عجیب کیس ہے یہ آپ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟“ میں نے ڈی ایس پی کو کریدنا چاہا تھا۔

”میں نے اپنی زندگی میں اس طرح کا واقعہ پہلی بار دیکھا ہے۔ کفن چوڑی دے کی ہڈیاں چوری کرنا اور اسی طرح کی اور بھی واردات تو میں نے دیکھی ہیں لیکن یہ۔۔۔۔۔“

”یہ شخص کہیں پاگل تو نہیں ہے؟“ میں نے ان کی بات کاٹی تھی۔

”نہیں، یہ بالکل نارمل ہے پہلے اپنے عیب چھپانے کی کوشش کرتا رہا بعد میں اس نے اعتراف کر لیا۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ آپ کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟“

”اس پر پہلی دفعہ 297 لگائی گئی ہے جو مرنے کی بے حرمتی کرنے کی ہے جس کی سزا ایک سال ہے۔“

”صرف ایک سال؟“ حیرت میرے چہرے پر نمایاں تھی۔

”جی، دوسری دفعہ اس پر 376 لگائی گئی ہے جو زنا بالجبر کے تحت ہے۔ تیسری دفعہ 377 اُن بچہ مرل یعنی انسان کی فطرت کے برعکس کام کرنے کی ہے اور چوتھی دفعہ 354A ہے اس میں خواتین کے ساتھ زبردستی کرنا شامل ہے۔“

واپسی کے سفر میں بہت سارے سوالات

طلب

زندگی ایک بار ہی ہنسی تھی! بڑے جوش سے بڑی مدت پہلے

اب تو وہ خود ہنسی کی طلب میں ہے

شفیق شکی

میرے دماغ میں کھولیں پیدا کر رہے تھے۔

”کیا محمد ریاض کو اپنے گھٹاؤنے کروت کی سزا ملے گی؟“

”کیا ہمارا قانون اندھا بن رہا ہے؟“

”ریاض جیسے گدھ نما انسان کب تک اپنا گھٹاؤنا کھیل کھیلتے رہیں گے؟“

”ایک ظالم درندے کی حرکت پر ایک عورت کی آنکھوں سے پھوٹنے والی روشنی نے اس معاشرے کے گھٹاؤنے چروں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ یقیناً اسی عورت کی سسکتی ہوئی روح ہے جس نے میگزینوں سال پہلے اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے محمد بن قاسم کو پکارا تھا اور جس کی روح آج ہمارے جاگیردارانہ معاشرے میں بھٹکتی پھر رہی ہے جہاں ہر روز زندہ خواتین کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو مردہ خاتون کے ساتھ اس بد بخت ریاض نے کیا۔

جاگیردار اور وڈیرے خواتین کو کاروباری کے نام پر قتل کر دیتے ہیں باپ اور بھائی غیرت کے نام پر خواتین کے خون سے ہاتھ رنگنے سے دریغ نہیں کرتے اور جن کے پاس یہ وسائل نہ ہوں وہ اپنی ہوس مردہ خواتین کی حرمت کو پامال کر کے پوری کر دیتے ہیں۔

یا الہی! اب محمد بن قاسم کے روپ میں کون نمودار ہوگا جو آج کی زندہ خواتین کے ساتھ ساتھ

مردہ خواتین کی عزتوں کا محافظ بنے گا؟

سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں کی گھسی روداد

شگفتہ شفیق

کراچی کے گینڈا ایک

داغ کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ادیبی شاعرہ اور کہانی کار کا سرگینڈا اور مسافر اور شفیق احمد

18 ستمبر کو صبح صبح اٹھے تو ہمارے بھانجے کاشف نے ایک کمپیوٹر ہمارے لیے آرٹھ کیا جس پر کافی دن کے بعد فیس بک کھولا اور ارم زہرا کے کلمات پڑھے اور جواب لکھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آپا اور بھائی جان کو کہیں مینگ میں جانا تھا سو وہ ہمیں Wall Mart میں drop کر گئے۔ اس دن خوب ہی اچھی طرح وال مارٹ کا سروے ہوا۔ کئی ایک اشیاء بھی خریدیں پھر میکڈونلڈ میں جا کے چپس اور کافی سے ٹھکن اتاری، تقریباً سو ادس بجے ہماری بھانجی نازیہ ہمیں Wall Mart سے واپس گھر لے گئی۔ میں نماز پڑھ کے جلد ہی سو گئی کہ اگلا دن Sunday تھا اور میرا سسرالی ڈے تھا۔ شفیق کے ماموں زاد بھائی وقار اور اُن کی بیگم توحید بے حد محبت اور خلوص سے ملنے والے لوگ ہیں۔ جب بھی پاکستان آتے ہیں کہیں جائیں نا جائیں مجھ سے ضرور ملاقات کرتے ہیں۔ ہماری

ہے؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک میرے cell کی گھنٹی بجی اور میرے خیالات کی رو رک گئی۔ دوسری طرف سے مجھے توحید کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

”شگفتہ بھائی! باہر آ جائیں ہم منتظر ہیں۔“ ہم دونوں خوشی سے گلے ملے راستے بھر توحید اور وقار دلچسپ باتوں سے ماحول کو خوشگوار بناتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم مسی ساگا پہنچ گئے۔ توحید کا آراستہ بھراستہ پارٹنٹ مجھے بہت پسند آیا۔

دوسرے صاحب لگا رہے تھے۔ پروفیشنل اور نفع آدھا آدھا لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ ہم صرف کچن میں ہی گھسے رہیں اُسے بھی ہم تو باہر جا کے جاب کریں گے تاکہ اور لوگوں سے بھی مل سکیں اور ہمارا vision بڑھے۔ اس دوران میں ہی ٹیمینہ اور مشرف بھی وہاں آ گئے تھے ٹیمینہ شفیق کی ماموں زاد بہن ہیں۔ ہمارے ساتھ لُچ میں وہ بھی شریک تھے اور پھر بہت ساری اچھی اچھی خوشگوار باتوں اور یادوں کے ساتھ ہم وہاں سے ٹیمینہ کے گھر کی جانب چلے تھے۔



تسلیم الہی زلفی نے کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم گینڈا کی جانب سے ”جامعہ کراچی ادبی ایوارڈ 2011ء“ دیا

توحید نے بچوں سے ملاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم لوگوں کی بڑی امی ہیں۔“ اس تعارف وغیرہ کے بعد وہ کھانا لگانے لگیں۔ توحید بہت ہی شاندار لک ہے گرین چکن، کوئنٹے، بریانی، نکلے، سویاں اور تاجا نے کیا کیا تھا۔ ہر ایک شے اس قدر لذیذ تھی کہ بے اختیار اسے مشورہ دے بیٹھی کہ تم تو ریسٹورنٹ کھول لو نہ صرف خوب چلے گا بلکہ دوڑے گا جواب اس نے بتایا کہ یہ پیشکش تو اسے پہلے ہی ہو چکی ہے پیسے کوئی

وہاں بے شمار لوازمات سے پُر چائے ملی تھی۔ ٹیمینہ کے شو بہر مشرف سے بہت باتیں ہوئیں اُن دونوں میاں بیوی نے بے حد اصرار کر کے ہمارا کچھ کلام بھی سنا اور بے حد داد دی۔ اس کے بعد ہمیں شفیق کی بھانجی کے ہاں جانا تھا وہاں پر میری اپنی نند نگہت باجی بھی کراچی سے آئی ہوئی تھیں سو توحید اور وقار ہمیں وہاں لے گئے۔ لیس جی، یہ تو ہم بتانا ہی بھول گئے کہ ہماری دیورانی اور نند دونوں نے ہماری

شوہروں کے حقوق ہیں۔ تمام بیگمات اور بچے بے حد حقوق رکھتے ہیں۔ اُن کی کسی بھی کال پر دو منٹ کے اندر پولیس پہنچ جاتی ہے جو دو دھکادو دھک اور پانی کا پانی کرتی ہے۔ بچوں کو مارنے کی صورت میں بچے گھر والوں سے لے لیے جاتے ہیں کہ تم ان بچوں کو مارنے کے اہل نہیں ہو اس لیے سارے کے سارے لوگ بہت ہی محتاط رہتے ہیں۔

تسلیم الہی زلفی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ



مانٹریل میں RCCA.TV کے زیر اہتمام بین الاقوامی شاعرے میں شگفتہ شفیق، ارشد نعیم خان، جمال انجم اور تسلیم الہی زلفی

ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ اس کے بعد دوسری چڑیا اکیلی رہ گئی تھی اس کو دھوپ سینکنے کے لیے باہر رکھا گیا، پتھرے کا دروازہ کھلا تھا وہ اڑ گئی، تب بڑوں نے میکڈونلڈ میں اور نو فرل نے ہر جگہ ”تلاش کم شدہ“ کے اشتہار لگائے اور آخر کار ڈیرہ مینے کے بعد وہ چڑیا واپس آئی تھی۔

یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ کینیڈا میں جانوروں پر بندوں، کتوں، بلیوں کے مزے ہیں، کوئی

انہیں تکلیف پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ جس نے کتے پالے ہوتے ہیں وہ ان کو صبح یا شام سیریں کرانے ضرور جاتے ہیں اور اس دوران میں ہر ایک کے ہاتھ میں پولیٹھین کی تھیلی ہوتی ہے کہ ادھر کتے نے پٹی کی، ادھر انہوں نے اس کو تھیلی میں اٹھایا۔ (مجھے تو یہ نظارہ بے حد غلیظ اور برا لگتا تھا)۔ اکثر اوقات یہ تھیلی ان لوگوں کی جیب میں ہوتی تھی۔

میرے خیال میں کینیڈا میں سب سے کم

آفس دیکھنا ہوتا تھا۔ ایک دن بھابی آفس جو پہنچیں اور دیکھا آفس ورکر حیثیت ہاتھ میں ایک چڑیا پکڑے بیٹھی ہے۔ بھابی کو خاصا غصہ آیا کہ بھئی یہ کیا تماشا ہے؟ چڑیا کو چھوڑو کام شروع کرو لیکن حیثیت تو کام سے ہی انکاری تھی کہ ”یہ تو بے گھر چڑیا ہے یہاں کمرے میں آ کے اداس بیٹھی تھی۔ اب میں نے اسے adapt کر لیا ہے میں اس کو تو میں پالوں گی۔“ تو مرنا، کیا نہ کرتا بھابی اسے پتھرہ دلانے کو لے گئیں۔ پتھرے والے نے ساری روداد سن کر حیثیت سے کہا کہ ”تم کتنی اچھی ہو تمہیں اس چڑیا کا کتنا خیال ہے اس لیے میں تم سے پتھرے کے کوئی پیسے نہیں لوں گا۔“ بلکہ اُس نے اپنے پاس موجود چڑیوں میں سے ایک چڑیا اور gift کر دی کہ دو چڑیاں اکٹھی خوش باش رہیں گی اور چڑیا کو تنہائی نہیں محسوس ہوگی۔ اس طرح ایک چڑیا اور adapt کر لی گئی۔ حیثیت باقاعدہ adoption کے پیسے سامنے کر کے آئی تھی کہ وہ لوگ باقاعدہ گھر آ کے دیکھ سکتے ہیں کہ چڑیوں کو کس طرح رکھا گیا ہے اور پھر جب حیثیت چھٹیوں پر گئی تو چڑیاں بھابی کے گھر آ گئیں اور جب وہ اپنا اقامہ لگانے سعودی عرب جانے لگیں تو چڑیاں بڑوں کو دے دیں۔ بھابی سعودی عرب سے واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ ایک چڑیا نہ جانے کس طرح بیمار ہوئی، اُس کو ایک رات کے لیے Hospitalize بھی کیا گیا۔ اُس 25 ڈالر زکری چڑیا کی ایک رات کی بیماری میں 250 ڈالر خرچ ہوئے لیکن وہ مر گئی تو پڑوسیوں نے باقاعدہ اس کا funeral کیا، سب نے کالے سوٹ پہنے چاروں فیلٹی ممبرز نے ایک دوسرے سے تعزیتی کلمات کہے کہ ”چڑیا بہت اچھی تھی۔ ہم سے بہت محبت کرتی تھی۔“ چڑیا کو بہت پسند کرتے تھے۔“ اور پھر اُس کو عزت و احترام کے ساتھ میڑھیوں کے

بمگر تمخائف سے نوازا۔ ہم نے لاکھ نسخ کیا پر وہ نہ مانیں۔ فرحین کا بے بی بوائے ابھی ایک ماہ کا ہے جس کو اس کی بڑی بہنیں خوشی سے کھلاتی پھر رہی تھیں۔ فرحین نے بازار سے چائینیز منگوا یا ہوا تھا۔ ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی لیکن اُن کی محبتوں کے جواب میں کچھ نہ کچھ دو چار نوالے کھائے، یوں رات گئے فطرت باقی اور اُن کے داماد نے ہمیں آپا کے گھر ڈراپ کیا تھا۔

اگلے دن آپا کے بچوں سے الوداعی ملاقات کچھ اس طرح ہوئی کہ جو جس وقت نظر آ گیا، خدا حافظ کہا، تقریباً تین بجے آپا مجھے اپنی گاڑی میں بھابی کے گھر چھوڑ گئیں کیونکہ آپا کو اگلے ہی دن دو ہفتے کے لیے ابو ظہبی اور پاکستان جانا تھا۔

اگلے دن میں نے بھابی سے کہا کہ بھئی یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی؟ کیونکہ آج میرا دل کوکنگ کرنے کا ہے تب میں نے کالی مسور کی دال، نہاری، کوٹھے، کھڑے مصلے کا گوشت اور سینڈی بنائی۔ یہ کھانا سب کو بے حد پسند آیا تھا۔

مارکھم یونین دل میں بھابی کے گھر کے پیچھے ایک بہت خوبصورت پارک ہے۔ بھابی نے کہا تھا کہ ہم دونوں وہاں چلیں گے۔ بڑا ہی پیارا راستہ تھا، اوپر سے اُس وقت برسات کی ریم جھم سے بے حد روانگ ماحول پیدا کر رہا تھا۔ یہ وسیع پارک بے شمار جھولوں سے سجا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ ”بھابھی.....! ذرا مجھے جھولا تو دینا۔“ کچھ دیر جھولا جھولنے کے بعد ہم دونوں واک کرتے ہوئے واپس آ گئے واپسی پر گرم اور مہکتی ہوئی چائے نے بہت لطف دیا۔ اسی دوران بھابی نے اپنی چڑیا کا قصہ سنایا تھا۔

اُس زمانے میں بھابی کینیڈا میں اپنا rod iron کا بزنس stablsh کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھابی کی غیر موجودگی میں ما بھابی کو

24 ستمبر کو مانٹریل میں بین الاقوامی شاعرہ ہے اور اُس کے لیے میں نے آپ کا نام دے دیا ہے سو آپ کو وہاں ضرور چلنا ہے۔ درمیان میں مانٹریل سے ارشد نعیم صاحب کا فون آیا اور انہوں نے ہمیں شاعرے کی دعوت دیتے ہوئے تاکید کی کہ ”آپ نے ضرور شرکت کرنی ہے یہاں پر سب لوگ آپ کو سننا چاہتے ہیں۔“ ہم نے وعدہ کر لیا تھا کہ ”ارشد بھابی! انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔“

بائیس ستمبر کو میرے پیارے بھائی اور بیٹے کی

سعودی عرب سے آمد تھی۔ میں بھابی اور حسن بھائی کو لینے ٹورنٹو ایئر پورٹ پہنچی تو جہاز کچھ لیٹ تھا سو کچھ وقت ٹم پارٹن پر گزرا اس ٹم پارٹن کی کافی بہت مشہور ہی نہیں واقعی بہترین ہے۔ یہ کافی شاہیں کینیڈا میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی ہیں جو چوٹیں گھٹنے سروں دیتی ہیں اور اپنا معیار انہوں نے قائم رکھا ہے۔ یہ کافی پیٹے ہی ہمارے تو تمام درور نو چکر ہو جاتے تھے اور آنکھیں کھل جاتی تھیں سو ڈونٹ اور کافی انجوائے کرتے ہوئے بھائی کا انتظار کیا تھا۔ گھر واپس آ کے ہم تو اپنے کمرے میں بیٹھ کے اپنی ڈائری لکھنے لگے تھے کیونکہ بھائی لوگ بہت ہی لمبے سفر سے آئے تھے وہ اپنی تسکین مٹانے کو آرام کے لیے کمرے میں چلے گئے تھے۔

23 ستمبر 2011ء کو مسی ساگا میں "Monthly Ambition" کی مدیرہ اسماء وارثی صاحبہ نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ تیز چھاجوں برقی بارش میں مارکسم سے مسی ساگانک کا سفر بھی یادگار رہا۔ دھند، کبر، تیز بارش، خوبصورت بل کھاتی سڑکیں اور 407 روڈ پر میری بھابی برقی رفتاری سے کشاں کشاں مجھے لیے جا رہی تھی۔ گاڑی میں بجتی خوبصورت موسیقی موسم کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

دھلا ہوا سبز، خاموش کھڑے بڑے بڑے اشجار، خوبصورت عمارتیں، کیا عجیب ساں تھا۔ زندگی کا نہ بھولنے والا منظر۔ اتنی تیز بارش میں پاکستان میں یوں سفر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ بھی دو اکیلی خواتین اور اتنی دور کا سفر لیکن یہ کینیڈا ہے یہاں فاصلے اور راستے چاہے کتنے بھی طویل کیوں نا ہوں آسانی سے طے ہو جاتے ہیں۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے برج آئے بادل کے تورخت تھے رکنے والے نہیں محسوس ہو رہے تھے۔ ٹورنٹو

ایئر پورٹ کے نزدیک 4 کلور برج کے نزدیک بے حد ٹریفک تھا اور یہ نتیجے اب ڈکی روڈ آگئی ہے اور اب صرف 2 کلومیٹر دور Mavis ہے اس کے بعد ہی وہ venue ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔

ریسٹورنٹ کے باہر ہی اثر اکبر آبادی اور تسلیم الہی زلفی صاحب بیٹھے تھے۔ اسماء وارثی صاحبہ نے کمال محبت سے شاندار ڈنر اور پھر مشاعرے کا انعقاد کیا تھا۔ جس ہال میں ہم جا کے بیٹھے تھے وہ "آرڈوہیٹی" کہلاتی ہے وہاں لائبریری بھی موجود تھی۔ بہت سارے شعراء اور شاعرات بھی موجود تھے۔ وہاں پر بھی ہمیں پھولوں کے تحفے کے ساتھ ایک "Award of Appreciation" دیا گیا۔ وہاں سے ہم نے بے حد داسمٹی وہاں ہم نے اسماء وارثی سے اُن کی انتہائی خوبصورت غزل اصرار کر کے سنی تھی جس کا مطلع تھا۔

عہد دیپاں ہو گیا
غم کا ساماں ہو گیا

وہ بڑے ترنم سے بہت خوبصورت انداز میں بڑھتی ہیں۔ ڈنر کامیو بھی بہترین تھا اور بعد میں گرما گرم چائے نے برستے موسم میں بے حد لطف دیا۔ یہ تقریب رات بارہ بجے تک جاری رہی تھی۔

مانٹریال میں RCCA.TV اور ہفت روزہ "نوائے پاکستان" کے زیر اہتمام دوسرا بین الاقوامی مشاعرہ 24 ستمبر 2011ء کو تھا، ساتھ ہی تقریب پذیرائی بھی تھی۔ میرے بھائی خاص کمرے لیے سعودی عرب سے کینیڈا واپس آئے تھے کہ میں اُن کے ساتھ مانٹریال جا سکوں۔ (ماشاء اللہ بہت ہی محبت کرنے والا بھائی ہے۔) یہ عایت یہ محبت خدا یا ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ (آمین!) اب گاڑی طویل ترین سڑک 401 ہائی وے پر ہے جب کوئی شہر آ رہا ہوتا ہے تب اس کو مزید چوڑا کر دیا جاتا ہے۔

خوبصورت سڑک ہریالی سے ڈھکے ہوئے دلوں اطراف خوبصورت وادیاں جیسے جنت کا کوئی راستہ ہو۔ ہم لوگ تقریباً بارہ بجے دوپہر روانہ ہوئے تھے۔ مزے مزے کے کھانوں، گانوں اور لطائف نے سفر کا لطف بڑھا دیا تھا۔

کینیڈا میں اب بچوں نے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا ہے۔ چندہ دن جاتے ہیں کہ تمام پتے شعلوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہاں کی خزاں بہار کو مات کرتی ہے۔ بھائی بتا رہے تھے کہ پہلے یہ تمام پتے سرخ ہو جائیں گے پھر تمام کے تمام چمڑے جائیں گے اور پھر برف گرے گی اور پھر یوں معلوم ہوگا کہ جیسے کینیڈا نے پوری کی پوری سفید چادر اوڑھ لی ہے۔ ہر ایک شے پر برف کی سفید چادر کا راج ہوگا۔ "احسن کہہ رہا تھا کہ" پھوپھی! اس قدر یورنگ لگتا ہے برف کا گرنا کہ بس ہر شخص بیٹھا ہوا بورہا ہوتا ہے نہ کہیں زیادہ آنا نہ جانا جب جاؤ تو پہلے برف صاف کرو۔"

مانٹریال کے سفر میں خوبصورت وادیاں تیزی سے پیچھے گزر رہی تھیں۔ میں نے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھا وہی آسمان وہی سورج جو کہ بادلوں کے ساتھ آنکھ پھولی کھیل رہا تھا، کبھی بادلوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی کھل کر سامنے آ جاتا لیکن موسم بے حد خوبصورت، صفائی بے حد شاندار اور سب سے بڑھ کر یہاں کے لوگوں کی توانائیں فالو کرنے کی ادا اُن کو ہم سے ممتاز کرتی ہے اور پھر جب ہم کنگسٹن سے 30 کلومیٹر دور تھے کہ گھٹائیں بھر کے آگئیں اور رم جھم شروع ہوگئی جو اگلے پانچ منٹ کے بعد مکمل تیز ترین بارش میں تبدیل ہوگئی ساتھ مزید کالی گھٹائیں آگئی تھیں۔ بھائی گاڑی کو 140 کی اسپید سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ اچانک ایک ٹریفک پولیس نے سامنے آ کے رکنے کا اشارہ

کیا اور کہا کہ اپنا سس دیں۔ اس نے تایا کہ اس روڈ پر اسپید 80 ہے اور ہم 140 پر جا رہے تھے اور پھر وہ لٹ ہالے میں مشغول ہو گیا۔ پہلے دو ہفتے میں بھائی کا یہ دوسرا لٹ ہے۔ یہ ٹریفک پولیس والے بے شمار جگہ جیسے کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے ریڈار میں یہ بڑی دور سے ٹریفک کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں اچانک سامنے آ کے پکڑتے ہیں۔

مانٹریال میں فرانسیسی زبان کو فوقیت حاصل ہے۔ انگلش جمہوری میں ہی بولی جاتی ہے۔ عموماً عمارتیں فرانسیسی طرز کی ہیں یعنی بالکونیوں کی بہتات ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے۔ جب ہم مانٹریال پہنچے تو شام ہو چکی تھی کیونکہ ہم راستہ بھٹک گئے تھے اگر آپ کوئی ایک روڈ بھی مس کر دیں تب سمجھ لیں کہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو آرام سے چلا گیا۔ جب ہم لوگ راستہ بھٹک گئے تب ارشد نعیم خان بھائی سے cell پر رابطہ کیا اور انہوں نے ہم کو گائیڈ کرنا شروع کیا۔ cell کا رابطہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک ہم اُن سے جانہ لے۔ گاڑی سے اترے تو ارشد نعیم صاحب نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اوپر پارکسٹ میں اُن کی بیگم ریحانہ چشم بردہ تھیں۔ بے حد لذیذ کھانا پکھا ہوا تھا۔ مہمان شعراء جوق در جوق آ رہے تھے اور ڈنر سے مخلوظ ہو رہے تھے یوں تو تمام کھانا ہی بے مثال تھا لیکن "اروی کے پتے" اسپیشل ڈش ٹھہری جو کہ ریحانہ بھابی نے خاص طور پر تیار کی تھی جس کی خوشبو اور ذائقہ اُن کی مٹیوں کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا۔ کھانے سے فراغت حاصل کر کے چائے کا دور چلا گرم بھاپ اڑاتی ہو کئی چائے نے طویل سفر کی ساری تسکین مٹا ڈالی تھی۔ RCCA TV سے فون پر فون آ رہے تھے کہ شعراء جمع ہو چکے ہیں آپ لوگ کب تک پہنچ رہے ہیں؟

سو سب نے بھاگ بھاگ اپنے کپڑے تبدیل کیے اور RCCA TV چینل کے studio پہنچے جہاں بے شمار لوگ جمع تھے۔ خیر، جلد ہی مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی صدارت محترم تسلیم الہی زلفی صاحب نے کی۔ مشاعرے کی نظامت ارشد نعیم خان صاحب کر رہے تھے۔ اس تقریب میں زلفی صاحب کو "Outstanding Dedication to promote Urdu

کمرے میں بیٹھ کے سب کو خوب یاد کیا کہ وہ سب لوگ کتنے مزے کر رہے ہوں گے اور واقعی دوسرے دن یہی پتہ ہوا کہ ندیم قریشی صاحب کے گھر سب نے خوب موبجیں کیں۔ پہلے تو مسز ندیم نے ڈیر سارے کھانے بنائے ہوئے تھے سب لوگوں نے انہیں انجوائے کیا۔ اس کے بعد شاعری اور باتوں میں اُن لوگوں کو یہ علم ہی نہیں ہوا کہ کب صبح ہوگی؟ صبح کا ناشتا کھانے پر بھاری تھا بے حد لذیذ قیمہ



مانٹریال میں ارشد نعیم خان، ریحانہ نعیم، شکفتہ شفیق اور ہاملی

"Literature Western world" کا ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔ رات گئے یہ محفل تمام ہوئی اور میری خوشگوار یادوں میں مزید اضافہ کر گئی کہ یہاں بھی ہمارا کلام احباب کو بہت پسند آیا تھا۔ باہر کے شعراء کا ندیم قریشی صاحب کے ہاں ٹھہرنے کا بندوبست تھا، سو تسلیم الہی زلفی صاحب اُن کی مسز زہت اور اُن کی بہن، اس کے علاوہ اور بھی شعرائے کرام وہاں ٹھہرے۔ میں اپنے بھائی بھائی کے ساتھ Metro Motel میں ٹھہری اور اکیلے

پوریاں، حلوائے نمک پارے، گھریلو بیک کیے ہوئے ٹیک اور مزید لوازمات ہماری اشتہا بڑھا گئے خوب ڈنٹ کرنا تھا کیا تھا اور پھر ارشد نعیم صاحب نے ہمیں مانٹریال کی سیر کرائی تھی۔ ہم سب لوگ دو گاڑیوں میں سوار تھے۔ پہلے ہمیں وہ اندرون شہر لے گئے یہاں زیادہ جہات چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کی تھیں۔ دکانیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں اور گھر بھی چھوٹے تھے۔ سڑکوں پر دونوں طرف گاڑیاں پارک ہوئی تھیں لیکن ساتھ ہی بہت ساری نئی عمارات بھی ہیں

جو کہ ظاہر ہے کہ بہت خوبصورت ہیں۔ جگہ جگہ سائیکلوں کے اسٹینڈ بنے ہوئے ہیں جہاں کچھ ڈالر کے عوض آپ اپنی سائیکل بلا خوف و خطر کھڑی کر کے جاسکتے ہیں۔

مانٹریال میں پارکس جگہ جگہ ہیں۔ یہ شہر بھی قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ اولڈ ٹاؤن میں جگہ جگہ ہوٹلوں کے سامنے میز کرسیاں باہر فٹ پاتھ پر بچھی تھیں اور بے شمار سیاح وہاں انجوائے کر رہے تھے۔ وہاں رنگین گھیاں بھی دیکھیں جن پر ٹورسٹ سیر کر رہے تھے خاص بات یہ تھی کہ گھوڑے بہت صحت مند اور شاندار تھے۔ ماؤنٹ رائل پوائنٹ وہ جگہ ہے جہاں سردی ہو یا گرمی برف پڑے یا بہار کا موسم ہو بے شمار رش رہتا ہے۔ یہ شہر کے قلب میں واقع ہے یہاں کھڑے ہوں تو دور سینٹ لارنس دریا نظر آتا ہے یہاں سے سارے شہر کا حسین نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں نزدیک ہی یہودیوں کا قبرستان ہے جو کہ صفائی اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہم نے میک گل یونیورسٹی بھی دیکھی اور میک گل یونیورسٹی سے یاد آیا کہ RCCA TV کے مشاعرے میں میک گل کے اُردو ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ محترم آصف افتخار صاحب بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی ایک انتہائی خوبصورت نظم سنائی تھی اور بے حد داد پائی تھی۔

ماؤنٹ رائل کے نزدیک ایک چرچ ہے یہ ایک پر شکوہ مقام ہے اور یہاں بے شمار زائرین آ کے اپنی دلی تمنائیں پوری ہونے کی دعائیں بڑے یقین کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ چرچ سینٹ جوزف آندرے نے 1912ء میں بنانا شروع کیا تھا اور 1918ء میں یہ بن کر تیار ہوا تب تک پادری صاحب وفات پا چکے تھے۔ ابھی ہم چرچ سے آگے روانہ ہوئے تھے کہ تب ارشد نعیم بھائی کا فون آیا کہ

آپ کو واپس گھر آنا ہوگا کیونکہ کچھ شعراء ہم سب لوگوں کے لیے اپنی کتابیں دے کر گئے ہیں سو ہم لوگ واپس بھائی ارشد کے اپارٹمنٹ کی جانب چل دیے۔ مجھے کتابیں ملنے کی خوشی تو بہت ہوئی لیکن ایک اور خوشی اس پر بھاری تھی کہ ریحانہ بھائی سے ہم الوداعی ملاقات نہ کر سکے تھے سو جا کے اُن کی خاطر تواضع اور محبتوں کا شکر یہ ادا کیا اور یہ وعدہ کرتے ہوئے جدا ہوئے کہ

بھرمیں گے گر خدا لایا

اب ٹورنٹو یونیورسٹی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مطلع ابر آلود نہیں تھا، موسم صاف تھا، جگہ جگہ ٹم بارش کی کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے رات تقریباً ساڑھے نو بجے واپس ٹورنٹو پہنچے۔ اس طرح یہ سہانا سفر ایک شاندار پکنک کا روپ دھار گیا۔ بھائی کو بے حد چٹکے چھوڑنے کی عادت ہے اس لیے مزید سونے پہ سہا کر رہا۔ رات کو بھائی وے پولیس بھی غائب تھی اس لیے بھائی نے خوب ہی تیز گاڑی ڈرائیو کی اور ہم کم وقت میں ٹورنٹو پہنچ گئے۔

بھائی نے کہا کہ اس وقت گھر میں جا کے کون کچن میں گھسے گا، سو پٹنہ کباب ہاؤس کی طرف گاڑی موڑ دی گئی۔ وہاں کا کھانا بے حد لذیذ تھا، کچھ کھایا، کچھ بچوں کے لیے بندھواوا اور گھر واپس چل دیے۔ گھر پہنچ کر خوب گرم پانی سے دیر تک نہائے اور فریش ہو گئے پھر اپنی تھکا شدہ نمازیں ادا کیں۔ اللہ کی بے شمار نعمتوں کا شکر بجالائے اور میٹھی نیند سو گئے۔

کینیڈا میں ہالووین کی آمد آمد ہے تمام بڑے Malls پر خوفناک اشیاء کے بڑے بڑے اسٹالٹج لگے ہیں۔ ویسپاٹر ڈریسز، چڑیلوں کا کیٹ اپ، خون، دانت، کھوپڑیاں، ہر طرف ان کی بہار ہے۔ میری

بٹی کا MBBS کا last year ہے تو ان کا الوداعی دیک ہوتا تھا جس میں ایک دن 'کریزی ڈے' بھی رکھا جاتا تھا۔ پاکستان سے کینیڈا آتے وقت اس نے مجھ سے یفرامش کی بھی کہ کچھ خوفناک چیزیں لے کر آئے گا میری کوئی دوست و سپاڑ بننا چاہتی ہے تو اسی لیے ان اسٹار کے کئی چکر لگائے لیکن میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں اس لیے ان میں سے کچھ بھی نہ خرید سکی۔ میں نے فون پر اس سے کہا تھا کہ "تم 'مالن' بن جاؤ نایا 'ڈنگ ڈونگ بلی' یہ خوفناک چیزیں دیکھ کر تو کراہیت آتی ہے۔"

آج CN ٹاور جانے کا پروگرام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے اونچے ترین ٹاور میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ 1976ء میں بنایا گیا ہے۔ اس ٹاور کو 40 مہینوں میں مکمل کیا گیا۔ ٹاور میں ایک ریسیورنٹ ہے جس کا نام "360" ہے۔ اس میں کھانے کا بہترین انتظام ہے۔ GN ٹاور میں اوپر جانے کے لیے لفٹ استعمال کی جاتی ہے جو کہ برق رفتار ہے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ CN ٹاور کی اونچائی 1,815 فٹ ہے۔ اسکاٹی بوٹ مزید اوپر کی منزل پر ہے جہاں سے شہر کا خوبصورت منظر دل کو بھاتا ہے۔ اسکاٹی بوٹ پر 300 میٹر سے کچھ زیادہ حصے پر شیشے کا فرش ہے۔ اکثر کوریاں اس شیشے پر لیٹ کر تصاویر کھینچا رہی تھیں اس شیشے پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں تو لگتا ہے زمین پر آگئے اور سر بھی بے حد چمکاتا ہے۔ بہت سارے لوگ مارے ڈر کے شیشے پر نہیں چڑھ رہے تھے بلکہ محض دور سے ہی دیکھ رہے تھے۔ میں جب اس پر کھڑی ہوئی تو اس وقت تو مجھے ڈر نہیں لگا لیکن جب میرے پیچھے محسن نے اس پر دو تین چپ لگائیں۔ ہائے..... دل دھک سے ہو گیا..... "نہیں کرو محسن.....! یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے....."

اور میں نہ نیچے گر جاؤں۔"

"ارے نہیں پھوپھی.....! اس پر 40 بڑے Hippopotamus بھی کھڑے ہو کر گویں تب بھی یہ ان کا وزن برداشت کر لے گا۔" محسن جو مجھے ڈرانے میں کامیاب ہو گیا تھا خوشی سے بولا تھا۔ CN ٹاور کے سامنے ایک عظیم الشان عمارت راجرز سینٹر ہے یہاں پرائمرین اینیما اپوارڈ بھی ہوئے تھے۔ اس میں آکس ہائی بھی مچلی جاتی ہے۔

اب میری پاکستان واپسی میں دو دن رہ گئے ہیں۔ کچھ چاکلیٹس اور تھوڑی بہت خریداری کرنے Wall Mart گئے۔ بے منٹ کاؤنٹر پر کھڑی تھی کہ برابر والے کاؤنٹر پر کھڑی خاتون نے اچانک آواز لگائی۔ "آپ کا نام گلشنہ شفیق ہے؟" "جی جی ہاں! لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟" "آپ پاکستان سے آئی ہوئی شاعرہ ہیں نا؟ آج کل بہت سے اخبارات میں آپ کی تصاویر دیکھی ہیں اس لیے پوچھ لیا۔" بعد میں علم ہوا کہ وہ خاتون شبنم راشد خود بھی شاعرہ ہیں اور تمام اخبارات میں شاعری سے متعلق نیوز پڑھتی ہیں۔ ان سے یوں اچانک مل کے بہت اچھا لگا تھا۔

27 ستمبر کو ایک اور پروقار اور سادہ تقریب میں محترم تسلیم الہی زلفی صاحب نے کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا کی جانب سے ہمیں "Jamia Karachi Adabi Award" عنایت فرمایا۔ جب میں کراچی سے کینیڈا آ رہی تھی میرے پاس "میرا دل کہتا ہے" کی بہت ساری copies تھیں اب جبکہ میں واپس کراچی آ رہی ہوں تو بے شمار دوستوں کی خوبصورت کتابیں میرے ساتھ ہیں جو کہ ان کی گرم جوشی اور

محبوبوں کی سدا یاد دلاتی رہیں گی۔ شعیب صادق کی کتاب "چوتھا آدمی" تو میں نے فوراً ہی پڑھ لی تھی کیونکہ ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں اور بہت ہی اچھی اور پرتاثیر کہانیاں ہیں۔ انہوں نے اپنی یہ کتاب مجھے مائٹریال میں دی تھی جو کہ مجھے بے حد پسند آئی۔ ارشد فصیح خان کی "اذان" شاعری کی بے حد خوبصورت کتاب ہے وہ جس قدر پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایم اکرم بٹ صاحب کی کتاب "کرب ذات" بھی بہت اچھی لگی۔ یہ ان کی خوبصورت غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کا ایک بہت ہی خوبصورت شعر آپ سب کی نذر ہے۔

یہ کیا کہ خواب تو دیکھے تھے چند ہی میں نے مگر جو زخم گئے تو کوئی شمار نہ تھا؟ اثر اکبر آبادی کی "جذبات اثر" اطہر رضوی صاحب کی "دلنشین یادیں" مہرمان لوگ درخشاں صدیقی کی "صبح درخشاں" بہت پسند آئیں۔ محترم تسلیم الہی زلفی صاحب نے اپنی کتاب "تہا پرندے کی اڑان" اور "میری کتابیں" (جو کہ تصنیفات کا مجموعہ ہے) کمال مہربانی سے عطا کیں جو میں بار بار پڑھتی ہوں اور ان کے خوبصورت کلام سے محظوظ ہوتی ہوں۔

جو میں نے گھر بنایا تھا میرا کہاں ہوا تنگ کہاں رکھے تھے بسیرا کہاں ہوا باہر نکل کے دیکھا تو ہرست دھوپ تھی لیکن ہمارے گھر میں سویرا کہاں ہوا؟ کینیڈا میں میرا قیام تقریباً ایک مہینہ رہا۔ احباب کو مزید یاد رکھنا چاہتے تھے لیکن بی بی کی پڑھائی کا ہرج ہور ہوا تھا کہ میرے گھر کے تینوں چیلنس حضرات بہت چھوڑ ہیں۔ (یعنی میرے میاں اور دونوں بیٹے) تب میں نے سب سے جانے کی اجازت

مانگی تھی۔

میرے بھائی بھابی اور احسن یحییٰ اور محسن نے میرا بے حد حساب خیال کیا، بہت سیریں کرائیں اپنے ہر کام کو چھوڑ کے میرے ہر فنکشن میں مجھے ہر جگہ لے گئے۔ اللہ پاک ان کو سدا شاد و آباد رکھے اور یہ محبتیں سدا قائم و دائم رکھے۔ (آمین!) میں اپنے تمام احباب خصوصاً محترم تسلیم الہی زلفی صاحب اور "Urdu Society of Canada" کی شہر گزار ہوں جنہوں نے کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا کی دعوت پر ویزہ بھیج کر مجھے کینیڈا بلایا اور اس قدر پذیرائی کی کہ ان کی محبتوں پر آنکھیں نم ہیں اور دل اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہے۔ الحمد للہ میرے تصور کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا کہ میری کتاب "میرا دل کہتا ہے" اس قدر لوگوں کو پسند آئے گی اور یوں اس کی سائنس کی جائے گی۔ میں کہ ایک طفل کتب اور لوگوں کی اتنی پذیرائی۔

"بے شک خدا مجھے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے۔" اور بس جی یہ میں نے سوٹ کیس اپنا کینیڈا۔ صبح یحییٰ سے الوداعی ملاقات ہوئی تھی اور محسن سے بھی صبح ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دونوں بچے اپنی یونیورسٹی اور اسکول گئے ہوئے تھے۔ بھابی بھائی اور میں تیزی کے ساتھ ایئر پورٹ روانہ ہوئے۔ ذرا سی دور ہی گئے تھے کہ مجھے یاد آیا کہ میری رسٹ وایج ٹیکل پر رکھی رہ گئی کہ وضو کے لیے اتاری تھی۔ میں نے کہا کہ بھائی! گاڑی واپس لے لو واپس جا کے فنافٹ گھڑی اٹھائی اور پھر تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ بھائی نے کہا کہ "گنا ہے آج تم جا نہیں سکو گی۔"

ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بھائی.....! اب ایسا نہیں بولیں میں نے ایک دم گھر جانے کا مانڈ

بنالیا ہے۔“ سارے راستے دعائیں کہیں اور بھائی سے بھی کہا کہ دعا کرو کہ آج جہاز کچھ لیٹ ہو جائے اور جناب ہماری ساری دعائیں اللہ پاک نے قبول کر لیں۔ ہمارا سامان بک ہو گیا اور ہمیں پور ڈنگ پاس مل گئے تب بھائی کے گلے لگ کر بہت شکریہ ادا کیا کہ میں نے تم کو خوب ہی بڑی رکھا۔ بھائی کو بہت پیار سے دیکھ کر اللہ حافظ کہا اور اندر چلی گئی۔

بھائی نے کہا تھا کہ جب سب کچھ clear ہو جائے تب فون کر دینا تب ہم جائیں گے۔ سیکورٹی چیک اور امیگریشن سے فارغ ہو کر ہم نے اپنا Hand Carry لیا اور اندر کی جانب چل دیے۔ ڈیوٹی فری شاپ سے ایک دو چھوٹی چھوٹی اشیاء خریدیں اور گیٹ نمبر 32 کی جانب چل دیے۔ آخر کار انا ونسنٹ ہوا اور ہم جہاز میں سوار ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ الوداعی نظروں سے کینیڈا کے ایئر پورٹ کو دیکھا اور پھر اپنے PIA کے مہربان عملے کو نشست نمبر بتایا اور اپنی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ ہمارے برابر والی نشست خالی تھی سوزے میں اپنی وہ کتابیں وہاں رکھ دیں جو کہ ہم راستے میں پڑھنے کے لیے ہاتھ میں لے آئے تھے۔ ہمارے برابر میں خالی سیٹ کے بعد ڈاکٹر چوہدری محمد سعید صاحب براجمان تھے۔ ہمارا راستے کا سفر انتہائی خوشگوار گزرا۔ ڈاکٹر چالڈا اسپیشلسٹ ہیں اور سعودی عرب میں چاب کرتے ہیں۔ اُن کی فیملی بھی میرے بھائی کی فیملی کی طرح ٹورنٹو میں رہائش پذیر ہے۔ راستے میں ہماری بہت ہی اچھی گفتگو رہی۔ آخر میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا کہ تمہیں بھائی کو بتا دیجیے گا کہ اُن کی تندوں میں ایک اور ننگا اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ فلامیٹ لاہور کو touch کرتی ہوئی کراچی جانی تھی لیکن ہم کو یہ ہی معلوم تھا کہ ہمارا امیگریشن

کراچی میں ہی ہوگا پر ایسا ہوا نہیں لاہور ایئر پورٹ سے ہمیں اپنا سارا سامان دوبارہ بک کرانا پڑا۔ لاہور ایئر پورٹ پر پورٹر نے سامان پر لگے ہوئے ٹیگ وغیرہ جلدی جلدی نکال دینے تب میں نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ یہ سب دوبارہ لگا دیں۔“ اُس پورٹر نے کچھ Tags تو لگا دیئے لیکن کچھ بھاڑ دیئے تھے۔ اب مجھے یہ پریشانی تھی کہ کراچی ایئر پورٹ پر سامان کے لیے تنگ نہ ہوتا پڑے؟ لیکن میرے ہم سفر سعید بھائی نے بہت تسلی دی کہ میں یہاں موجود ہوں اور اُس وقت ہی کراچی میں اپنے گھر جاؤں گا جب آپ کو اپنا سامان مل جائے گا۔

میں سوچتی ہوں کہ میں اپنے رب کا کس طرح شکر ادا کروں جو مجھ پر اس قدر مہربان ہے جو انسانوں کے روپ میں فرشتے بھیج دیتا ہے جیسے اُس وقت میری پریشانی میں ڈاکٹر چوہدری سعید میرے لیے سائبان بن گئے۔ ہمارا امیگریشن بھی لاہور میں ہی ہوا تھا۔ اب سامان کراچی کے لیے بک ہو چکا تھا۔ فی الحال ایک گھنٹے کی فرصت تھی۔ سب سے پہلے تو ایک کپ چائے پی پھر کراچی میں شفیق اور بچوں سے بات کر کے تمام پچویشن بتائی۔ انہوں نے کہا کہ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لاہور میرا انتہائی پسندیدہ شہر ہے۔ میرے دو تاتیا لاہور میں رہائش رکھتے تھے۔ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے البتہ میرے ڈھیر سارے نزنز ہیں لیکن موبائل دیکھا تو کسی کا بھی نمبر نہیں تھا کیونکہ دوسری sim میں تھے لیکن ایک پیجے نادر کا نمبر یاد تھا سو اُسے فون کیا اور اُس سے کہا کہ ہمیں ایک دولوکوں کے نمبر send کر دو تو جناب اس کے بعد اپنے دو تایا زادوں سے خوب ہی گپ شپ لگائی۔ گھت باجی کہنے لگیں کہ بس میں تو تمہیں لینے ابھی آ رہی ہوں۔ ایک دن ٹھہر جاؤ لیکن میں بھی چالاک ہوں

پہلے سامان بک کر آیا تھا پھر فون کیا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ جلد ہی لاہور کا چکر لگاؤ گی۔ وہ لوگ خوب ناراض اور خوش تھے۔ ناراض یوں کہ میں لاہور کی کیوں نہیں؟ اور خوش اس لیے کہ وہ میرے Canada trip کی تفصیلات Face book پر دیکھ چکے تھے۔

شفیق کو لاہور کا بتیسا بہت پسند ہے، سولاہور

اُن کو گلے لگاتے ہی سنرکی ساری پریشانیاں اور تھکن اڑن چھو ہو گئیں۔ فرخ اور شفیق گاڑی لینے چلے گئے اور تب اچانک سعید بھائی نظر آئے اور انہوں نے کہا کہ بہن! آگئے آپ کے بچے؟ سو کنزل اور شہریار کو اُن سے ملایا، اُن کا بہت شکریہ ادا کیا اور دل میں ڈھیروں خوشگوار یادیں لیے اپنے زندگی کے ہم سفر شفیق کے ساتھ بچوں کو بانہوں میں لیے گھر کی



گفتہ شفیق کے اعزاز میں یونیورسٹی آف کراچی گریجویٹس فورم کے استقبال کا ایک گروپ فوٹو

ایئر پورٹ سے یہ سوغات لے لی پھر انا ونسنٹ ہوئی کہ کراچی جانے والی پرواز تیار ہے سو پھر جہاز میں سوار ہوئے اور آخر کار اپنے پیارے کراچی پہنچ گئے۔ کراچی ایئر پورٹ پر ایک صاحب نے مجھ سے tag کے بارے میں پوچھا کہ میرا سامان اُس سے ملا سکیں۔ میں نے سچ بتا دیا کہ لاہور ایئر پورٹ پر پورٹر نے لائسنس کی بنیاد پر tag بھاڑ دیا تھا تب انہوں نے ادائے بے نازی سے فرمایا۔ ”جائیں میم.....“ اور ہم شکریہ ادا کر کے باہر کی جانب لپکے جہاں شفیق، کنزل، فرخ اور شہریار میرے منتظر تھے۔

جانب روانہ ہو گئے۔
کون کی کو یاد
ہمیشہ کرتا ہے؟
پر دل ہمارا
ہم سے یہی کہتا ہے
آپ کی باتیں آپ کی یادیں
دل میں رہیں گی
رات گئے چپ چاپ
دل پر دستک دیں گی

گفتہ شفیق۔ کراچی۔

فیضان عثمانی

زندگی لکھ رہا ہوں میں

حامد علی سید کا خیال

زباں رکھتے ہیں پتھر بھی چٹانیں بولتی ہیں
جو چروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

سچی کہانیاں کے دیرینہ لکھاری کی زندگی سے جڑی کہانی خود اپنی زبانی

اپنے بارے میں بولنا، کہنا یا کچھ بتانا کس کو اچھا نہیں لگتا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو، جو اسے ناگوار تصور کرتا ہو یا غلط گردانتا ہو۔ اس کے باوجود ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اپنی خوبیوں سے زیادہ خامیوں پر بولنے، بات کرنے یا کچھ کہنے اور سننے کو اچھا سمجھتے ہیں جنہیں تعریف سے زیادہ تنقید پسند ہوتی ہے اور تنقید سننے کا حوصلہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بس ایسے ہی لوگوں میں مجھ تاجیز کا بھی شمار ہوتا ہے اور یہاں میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ..... میری ذات میں موجود خامیوں کی تعداد خوبیوں سے کئی گنا زیادہ ہے اگر خوبیوں اور خامیوں کو ترازو میں رکھا جائے تو خامیوں کا پلڑا بہت بھاری ہوگا، برائیوں کا اچھائیوں پر بکثرت غلبہ ہے اور میرے گناہ میری نیکیوں پر دن بدن حاوی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھ جیسا گناہ گار خطا کار انسان

بھلا اپنے بارے میں کسی کو کیا بتائے گا!! میں تو ہر وقت اپنے کیے گئے گناہوں پر توبہ اور جانے انجانے میں آگے کوئی غلطی نہ ہو جائے اپنے پروردگار کے حضور دعا اور معافی کا طلب گار رہتا ہوں..... میں شاید کسی اور صورت میں اپنی ذات کے حوالے سے کچھ لکھنے بیان کرنے کی ہمت نہ کرتا مگر جب میرے قابل عزت و احترام استاد ناصر بھائی نے مجھے فون کر کے کہا کہ ”میری کہانی میری زبانی“ کے لیے لکھ کر بھیجو تو میں ان کا کہنا ٹال نہ سکا اور میرا قلم فوراً ہی میری سوچ، خیال اور یادوں کے سہارے کاغذ پر میری زندگی کے حالات و واقعات کو الفاظ کی شکل دینے میں مصروف ہو گیا۔

میں 14 ستمبر 1976ء بروز پیر صبح کے وقت اس دنیا کے خوب صورت ملک پاکستان ممبئیوں اور پر خلوص لوگوں کے شہر حیدرآباد میں پیدا ہوا..... میں

اپنے رب ذوالجلال کا شکر ادا کرتا ہوں اور دم تک کرتا رہوں گا کہ اس نے مجھے ایک ان گمرانے میں پیدا فرمایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کا شرف بخشا اور دعا یہی ہے جب موت آئے تو میرے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق اور زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد ہو،

میں کچھ بہن بھائیوں میں میرا نمبر چوتھا ہے، دو اور ایک بھائی مجھ سے بڑے اور ایک بھائی اور بہن مجھ سے چھوٹے ہیں..... بچپن کب آیا اور بخت ہو گیا؟ کچھ پتہ ہی نہیں چلا..... میری بہن محترمہ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب دے وہ ہمیں بچپن میں ہی اس دنیا کی چلیلائی ہو میں اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی..... مجھے آج تک 8 اگست 1983ء کی وہ یاد ہے جب میری والدہ کا جسد خاکی اسپتال میرے گھر کے دروازے پر آیا تھا اور ہمارے گھر صاحب ماتم مجھ گئی تھی۔ ہم بہن بھائی اس حقیقت یقین ہی نہیں کر پارہے تھے کہ..... آنا فانا ہماری جس نے صبح ہمیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے لے کر بھیجا تھا وہ ہم سے بہت دور ایسے مقام پر جا رہا ہے جہاں سے نہ کوئی واپس آیا ہے اور نہ ہی کبھی آئے گا۔ موت برحق ہے مگر کبھی بھی زندگی کی یہ بات اس سوچ کا روپ دھار کر گھٹنوں اور اس رشتی کے کہ..... ”ہم اتنی جلدی متا کی چھاؤں سے محروم ہوں ہو گئے۔“ مگر آخر کار تو یہ رب کا نکت ہے کہ وہ ہمارے دل میں جو کمال وحشی ہوتے ہیں۔

ہمارے والد صاحب کا کردار، میری زندگی میں ات زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ آج جو میرے اندر ات ارادی، حوصلہ، ہمت اور مثبت سوچ ہے وہ بہ ان کی ہی مہر ہون منت ہے۔ والد صاحب نے

ہی ہمیں عزم و حوصلے سے زندگی گزارنے کے طریقے سکھائے، یہ ان کا دیا ہوا اعتماد اور اعتبار ہی ہے جو آج ہم اس مقام پر موجود ہیں..... نہ جانے وہ وقت کب اور کیسے گزرا جسے طالب علمی کا خوب صورت دور کہا جاتا ہے..... کب کلاس ون میں داخل ہوئے اور کب ایم اے، بی ایڈ کر لیا۔ یہ سب میرے والد کی دی ہوئی تربیت، یقین اور اعتبار کا نتیجہ ہے کہ..... جو آج میں اور میرے بھائی بہن بڑے سے بڑے حالات و واقعات کا بہت ہمت و حوصلے کے ساتھ سامنا کرتے ہیں۔ میرے والد صاحب ایک انڈیل شخصیت ہیں وہ ہر روپ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ چاہے وہ ماں باپ کے لیے بیٹے کا روپ ہو یا چھوٹے بھائی کے لیے بڑے بھائی کی شکل میں ہو یا پھر اولاد کے لیے ایک ہمدرد اور مخلص باپ کا چہرہ ہو، دادا اور نانا کا رشتہ ہو، یا کسی رشتے دار کے لیے رشتے داری کا معاملہ میرے والد صاحب نے ہر لحاظ سے ہر شے سے انصاف کیا ہے ہر کسی کے ساتھ مخلص اور ہمدردی کے ساتھ بھلا کیا تو..... کبھی زبان پر نہ لانا ایسے انسان ایسے باپ کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

میں نے اسکول لائف سے لے کر یونیورسٹی لائف تک بہت سوشل زندگی گزاری ہے۔ کبھی کسی کو دکھ، تکلیف، پریشانی یا مصیبت میں دیکھا تو اس کے دکھ، درد، پریشانی، مصیبت کو اپنی ذات سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ محسوس کر کے اس کو دور کرنے کے لیے ہر وقت آگے آگے ہوتا، یہ ہنرمیں نے اپنے والد محترم سے ہی سیکھا ہے یا پھر Abu Bin Adham کے سبق سے کیونکہ واقعی جو لوگ دوسروں کے کام آتے ہیں اللہ پاک ان سے خوش اور راضی رہتا ہے۔ ان کی ہر مشکل میں مدد کرتا ہے۔

میری بڑی بہن جو آج اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنی خوشی زندگی گزار رہی ہیں ان کا کردار ہم بہن بھائیوں کی تربیت میں بڑا اہم ہے، انہوں نے ہمیں اس وقت بڑی بہن کے ساتھ ساتھ، ماں کی ممتا اور محبت بھی دی، جب وہ خود بھی ماں کے سائے اور محبت سے محروم ہو چکی تھیں۔ میرا ذہن بچپن سے ہی مذہبی تھا۔ علماء کرام کی صحبت میں پڑھنا، اجتماعات میں شرکت، دینی اور اصلاحی کتابیں پڑھنا، ناول جو پڑھے وہ بھی اصلاحی تھے یوں ذہن کے در سے جھکتے ہی چلے گئے، سوچ بھی ہمیشہ مثبت رہی اور کردار بھی..... ”اگر آپ کے ساتھ کسی نے برائی بھی کی ہے لیکن جب اس کو آپ کی ضرورت پڑے تو اپنی اچھائی سے اس کا دل برائی اور نفرت سے خالی کیا جاسکتا ہے۔“ یہ سوچ زندگی کے سفر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے..... گھر، خاندان، دوستوں، ملنے والوں میں، ہر کسی کی پریشانی دور کرنا ان کے کام آنا

کہ..... ہماری ذات سے اگر کسی کو فائدہ ہوتا اچھا ہے، یہ سب ہماری بڑی بہن کی تربیت شامل ہے، اسی لیے اب کسی کے دکھ کو محسوس کرنا اس کے ساتھ ہمدردی کرنا ہمیں بہت اچھا لگتا ہے ویسے بھی ہمارا مذہب خیر خوانی کا ہی درس دیتا ہے..... کہ دوسروں کے کام آؤ۔ مطالعے کا شوق مجھے بچپن سے ہی ہے بلکہ ہمیشہ پڑھتے ہی دیکھا، ہماری والدہ مرحومہ کو کسی لکھنے لکھانے کا شوق تھا اور پھر اپنے ہر دلچسپ محترم شمیم الدین عثمانی (شمیم حسنین) جو کہ میرے لیے ہمیشہ سے قابل عزت و قابل احترام ہیں اور رہیں گے ان کو شاعری کرتے دیکھا، مشاعروں میں آتے جاتے دیکھا۔ اپنے گھر میں مشاعروں کا انعقاد ہوتا اور بڑے بڑے شعراء حضرات کی آمد ملاقات، (جن میں خلش مظفر، صراح شاہ اثر، عالم

عابد، رعنا ناہید رعنا، مرحوم محسن بھوپالی اور دیگر ملاقاتیں آج بھی یاد ہیں) یہ سب دیکھتے ہوئے نالے کا ذہن بنا اور دل لکھنے لکھانے کی طرف مائل کیا۔ طالب علمی کے دور میں ہی تاریخی ناول، ادبی موضوعات پر کتابیں اور بڑے بڑے ادیبوں کے ناول زیر مطالعہ ہو گئے تھے..... میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ..... جو بچے نصابی سرگرمیوں میں بہت نہیں ہوتے وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے ہوتے ہیں..... کلاس دن سے میز تک لے کر پڑھائی میں استادوں کا بہت زیادہ منظور نظر رہا تو ایسا بھی نہ تھا کہ ہر وقت استادوں کے زیر نصاب رہتا، یہ ہی وہ دور تھا جب میں نے اپنے والدہ کو الفاظ کی شکل دے کر صفحہ قرطاس پر روشناسی سے کلا پیلا کرنا شروع کیا۔

حیدرآباد کے معروف شاعر اور ادیب جناب اسد سلیم نے حیدرآباد سے اسکول میگزین کے نام سے ایک بچوں کا پرچہ نکالا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب حیدرآباد کے حالات بڑے پُر آشوب اور کھٹن مٹن تھے۔ مہینے کے تیس دن میں بیس روز شہر میں کرفیو کا عذاب سہتا پڑتا تھا۔ اس دور میں بچوں کی تفریح کے لیے جناب محسن سلیم کی یہ کاوش لائق تھی۔ میری بچوں کے لیے لکھی گئی پہلی کہانی کی اسی پرچے میں لگی تھی۔ اس وقت میں 6th اس کا طالب علم تھا۔ اس طرح محسن سلیم واقعی بڑے محسن ہوئے، جو مجھے لکھنے کی طرف لائے۔ ان کی کہانی والا ماہنامہ بچی کہانیاں 1990ء میں ہر ماہ شروع کیا اور 1991ء ماہ اکتوبر کے شمارے میں میری پہلی کہانی شائع ہوئی۔ عنوان تھا ”نارا“ اس وقت میں کلاس IX میں تھا۔ میرے والدین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے کہانی لکھی

ہے اور میرے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے..... جنوری 1992ء میں میری دوسری تحریر ”کچھ بھی حاصل نہ ہوا“ چھپی تھی..... 1993ء میں ”بچی کہانیاں“ کے دفتر جانا آج تک میرے ذہن کے یادوں والے سنہری خزانے میں محفوظ ہے۔ جب میں پہلی بار اپنے Brother in law جاوید رضا ہاشمی کے ساتھ ادارے میں ملاقات کے لیے گیا تھا اس وقت ادارے میں جن لوگوں سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ محترم انکل دانش دیروہی مرحوم، اس وقت کے ایڈیٹر جناب سلیم فاروقی، پرویز بلگرامی، سلیم آؤر، سیما غزل، مصطفیٰ چاند اور جناب شاہین مرزا صاحب سے ملنا باتیں کرنا اور ان تمام حضرات کا خلوص مجھے آج تک یاد ہے۔ بچی کہانیاں کے جتنے بھی ایڈیٹر رہے ان میں جتنی اچھی اور طویل وابستگی میری ناصر رضا بھائی سے رہی ہے شاید ہی کسی سے رہی ہو یا آگے ہو پائے..... 2003ء میں ناصر بھائی سے مجھے اپنی وہ پہلی ملاقات اب تک یاد ہے جسے میں نے اپنے یادوں کے خزانے میں آج تک محفوظ رکھا ہوا ہے۔

میں پرویز بلگرامی بھائی سے ملنے بچی کہانیاں کے دفتر گیا تھا۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ..... پرویز بھائی بولے تھے..... ”آؤ تمہیں تمہارے شہر حیدرآباد کی ایک شخصیت سے ملواؤں..... پھر وہ مجھے ناصر بھائی کے کمرے میں لے گئے تھے۔ اس وقت ناصر بھائی مجھ سے جس محبت بھرے لہجے اور رویے کے ساتھ ملے تھے..... میں وہ انداز آج تک نہیں بھول سکا..... اس دن جو میں نے ناصر بھائی کا ہاتھ پکڑا تھا تو اب یہ دوستی اور بھائی پن کا ہاتھ، جب تک سانس کی ڈور چل رہی ہے میرے ہاتھ میں رہے گا۔ میں نے

پرویز بھائی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔۔۔۔۔ مگر ناصر بھائی کا کسی کو کچھ سمجھانے کا دھیما اور بزرگانہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔ وہ الفاظ کی ادائیگی جس خوب صورت انداز میں موقع محل کی مناسبت سے کرتے ہیں وہ میرے لیے باعث تقلید اور ناصر بھائی کے لیے لائق تحسین ہے۔

کہانیاں لکھنا ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس شوق کی تکمیل میں مشکلات خصوصاً تنگ دماغی وقت حائل ہوتی رہی ہے۔ اب تک میں نے جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں ان سے مطمئن تو نہیں ہوں مگر میں اپنی تحریر ”کچھ حاصل نہ ہوا“ کو پسندیدہ قرار دیتا ہوں۔ میری اس کہانی کو قارئین نے بھی بہت پسند کیا تھا۔ لکھنا دراصل لکھنے والے کے لیے اپنے اندر کی محنت نکالنے کا باعث ہوتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے، مطالعہ کرنے سے انسان کے ذہن میں علم کے نئے دروازے ہوتے ہیں۔ اچھی تحریر کے لیے الفاظ کا اچھا برعکس چناؤ بھی ضروری ہے، بڑے لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بشری رحمن، محی الدین نواب، عمیرہ احمد وغیرہ کی تحریریں مجھے بہت پسند ہیں۔ سچی کہانیاں کے لکھاریوں میں سلیم فاروقی، پرویز بکرمی، بیسما غزل، منورہ نوری، فلیس، فیصہ خانم اور شہباز عثمانی کی تحریریں ہمیشہ اچھی لگیں۔ موجودہ وقت میں جو لکھ رہے ہیں ان میں مجھے سب سے زیادہ بہن رانیل محفوظ عطاری کی کہانیاں پسند ہیں۔

زندگی سے جڑی کہانیوں کے موضوع کو شروع سے آخر تک خوبصورت جملوں کے ساتھ گرفت میں رکھنا رانیل عطاری کا خاصہ ہے۔ کاشی چوہان، عکاشہ سحر ایمان، رونی مریم حمید، ارشد جواد، ارشد علی ارشد، روشانہ سبحین، شازی، محمد فہیم اور مینا تاج وغیرہ

موجودہ وقت میں میرے پسندیدہ رائٹرز میں ہیں جن کی تحریریں سچی کہانیاں کے صفحات کو چار لگا دیتی ہیں۔ اشعر جواد کی تحریر ”اے خدا تو ہی میرے ذہن پر آج تک نقش ہے۔ خاص کر اس کردار ارسلان بھائی بہت مدت تک میرے ذہن میں چھایا رہا۔ ارشد علی ارشد کا ناول ”عشق سمندر“ مجھے بہت پسند آیا اس کے اختتام نے مجھے رلا دیا تھا یہاں میں اپنے دوست لکھاریوں سے ملاقاتوں ذکر نہ کروں تو کچھ گفتگو رہ جائے گی۔ اشعر جواد میری دوستی کو ایک وقت ہو گیا، میں نے اشعر کو ایک اچھا مخلص ہمدرد اور زندگی کو جسنے مسکراتے گزرا۔ والا انسان پایا ہے۔۔۔۔۔ 2006ء میں سچی کہانیاں کے دفتر میں ناصر بھائی کے کمرے میں ہونے والی میری اشعر سے پہلی ملاقات کافی دلچسپ تھی۔ جب ناصر بھائی نے پہلی والے انداز میں میں کہا تھا۔۔۔۔۔ ان کو پیچھاؤ، یہ ہیں محسن نقوی کے چاہنے والے۔۔۔۔۔“

تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا اشعر جواد۔۔۔۔۔ 2008ء میں، میں اور اشعر کرنل رفیق ایس ایم مرحوم سے ملنے ان کے گھر گئے تھے۔ مجھے آج تک کرنل صاحب کی شفقت اور محبت یاد ہے، ان کے گھر سے واپسی پر ہم دونوں کافی تاغم ”کالا پل“ پر بیٹھے اپنی اپنی سنتے سنتے گزرا تھا۔۔۔۔۔ اور باتوں میں ہمیں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا تھا۔ پھر جب ہم ایک دوسرے سے رخصت چاہ رہے تھے تو اس وقت اشعر نے محسن نقوی مرحوم کی غزل ”جب تیری دھن میں جیا کرتے تھے سناٹی تھی تو اس وقت دل و ذہن کی کیفیت اور موسم سب کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا تھا۔۔۔۔۔ کرنل افکل کا میرے ویسے میں آنا بھی میرے لیے باعث اختصار رہے گا۔ ملت گارڈن ملیر میرے گھر میں جب تک آباد سے آپا صنف

ملطانیہ کا عجمت عائشہ کے ساتھ آنا اور چائے کے دوران بلند والہا قہقہوں اور لطیفوں سے محفل کو کثرت و زعفران بنانا مجھے آج تک یاد ہے۔ 2009ء میں میرے گھر پر ہونے والی محفوظ عطاری اور اشعر جواد سے ملاقات بھی میرے لیے یادگار ہے۔

میری شادی کو اب تقریباً پانچ سال ہونے والے ہیں اور میں اپنی زندگی کو خوب انجوائے کر رہا ہوں چند ماہ پہلے میں ایک بیٹے کا باپ بنا ہوں۔ اللہ پاک نے بڑے صبر، دعا اور آزمائش کے بعد مجھے یہ لازوال دولت جس کو دنیا ”اولاد“ کہتی ہے عطا کی ہے، بیٹے کی پیدائش نے میری شخصیت اور خیالات کو کافی حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر ہم مثبت سوچ رکھیں اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے عقیدے پر مضبوطی سے گامزن رہتے ہوئے سچے دل و دماغ سے اللہ پاک سے دعا کریں تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری دعائیں ضرور سنتا ہے۔۔۔۔۔ میرے بیٹے کا اس دنیا میں آنا بھی میری اس سوچ سے تعلق رکھتا ہے، میں اور میری بیوی چار سال تک انتظار کی کڑیاں لگن لگن کر گزارتے رہے اور رب کائنات سے اولاد کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ اسی دوران گزشتہ سال محرم الحرام پر مدنی قافلہ راہ خدا میں نیکی کی دعوت دینے کے لیے نکلے، میری وابستگی ان لوگوں سے ہے تو کافی پرانی مگر میں نے زندگی میں پہلی بار کسی قافلے کا مسافر بن کر سفر کیا تھا۔۔۔۔۔ سنا تھا کہ اگر سچے دل اور خلوص نیت کے ساتھ راہ خدا میں نیکی کی دعوت کے لیے مدنی قافلے میں سفر کیا جائے تو دل کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں اللہ تعالیٰ دیر نہیں کرتا۔ اس سفر سے پہلے دل میں دعا کی تھی کہ۔۔۔۔۔ اے پاک پروردگار! میں تیری اور تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لیے یہ نیت لے کر اس قافلے کا مسافر بننا ہوں کہ تو

دلوں کا حال جانتا ہے۔ اسی کے وسیلے تو میری دلی تمنا بھی پوری کر دے۔ میری آزمائش ختم کر دے، مجھے بھی اولاد بھی نصبت سے سرفراز کر دے۔۔۔۔۔ قارئین کرام! آپ یقین کریں، سفر کے تینوں دن آٹھ تا دس محرم میرے دل سے یہی دعائیں نکلتی رہی تھیں اور آٹھ گھنٹوں میں آنسو آتے رہے تھے۔

وہ میرا رب سب کے دلوں کا حال جاننے والا ہے اور جب اس کو سچے دل سے پکارا جائے تو وہ کیوں کسی کی پکار کو رد کرے گا؟۔۔۔۔۔ جب میں اس قافلے کے اختتام کے بعد گھر گیا تو وہ خوشخبری جس کے لیے برسوں انتظار کیا تھا، وہ خوشی والی خبر جس کے لیے اتنی دعائیں کی تھیں، میری منتظر تھی۔ اللہ تعالیٰ کو بندے کی عاجزی انکساری اور بندگی پسند ہے لیکن آج کا انسان دنیا میں اپنے آنے کا مقصد بالکل بھول گیا ہے۔ اسی لیے تو ہم اپنے مقصد اور منزل سے دور ہو گئے ہیں۔

آج جب میں خدا کی قدرت سے باپ کے منصب پر فائز ہو چکا ہوں تو اپنے والد کی اکثر اوقات یہی بات یاد آتی ہے کہ۔۔۔۔۔ ”بیٹا جب باپ بنو گے تب پوچھیں گے تم سے“۔۔۔۔۔ اور واقعی آج پتا چلتا ہے کہ اولاد کے لیے ماں باپ کی تڑپ کیا ہوتی ہے، ان کی نصیحتوں میں کیسی کیسی حکمتیں اور محبتیں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ہم نادان پیمان ہی نہیں پاتے۔

اب میں یہاں اپنی زندگی کی اس جاری کہانی کا لفظی اختتام کرتا ہوں، میں نے اپنے حوالے سے جو بہتر جانا لکھ دیا۔ آخر میں آپ تمام قارئین سے بس یہ کہنا ہے کہ۔۔۔۔۔ اپنے والدین کی قدر کریں، ان کی عزت کریں، زندگی کے سفر میں، یقین، نیک اعمال اور بزرگوں کی دعاؤں کو زور اور راہ کے طور پر ساتھ رکھیں پھر دیکھیں منزل کیسے آپ کے قدم چومتی ہے۔

□ اشعر علی بخاری۔ کراچی۔

○ بابائی! السلام علیکم! ہمارے نانا کا گھر راولپنڈی میں ہے جو پہلے ہماری نانی کے نام تھا۔ ہمارے نانا 1998ء میں انتقال کر گئے تھے اور نانی اُن سے پہلے انتقال کر گئی تھیں۔ ہماری والدہ اُن کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اب اُس گھر پر ہمارے نانا کے رشتے داروں نے قبضہ کر لیا ہے۔ پنڈی میں ہمارے جو پڑوسی ہیں اُن کا بیٹا کراچی میں ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ گھر اُن لوگوں کے نام ہو گیا ہوتا تو وہ یہ گھر بھی کاچ کر چلے گئے ہوتے۔ یہ گھر اُن کے نام نہیں ہوا ہے۔ RDA میں میرا جاننے والا ہے جو ہم سے پیسے لے کر اس گھر کی ڈپٹی کیٹ فائل نکلا دے گا۔ باباجی! ہم نے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ بندہ ہماری رقم کو کھا تو نہیں جائے گا؟ پہلے بھی کافی لوگوں نے ہمارے پیسے کھا لیے ہیں اور اگر ہم یہ کوشش کریں تو ہمارا گھر ہمیں واپس مل سکتا ہے؟ آپ کوئی وظیفہ بتادیں یا جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔

☆ بیٹے! اشعر! کسی کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر خود چاکر کام کروا سکتے ہو تو کرواؤ ورنہ کسی وکیل کا بندوبست کرو۔ اس طرح تو لوگ دھوکہ دیتے ہی رہیں گے۔ والدہ سے کہو بکثرت منصور من اللہ وفتح قریب پڑھیں اور دُعا کریں۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ آسیہ۔ سحرات۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرے شوہر ایک انتہائی سلیبے ہوئے بے حد اچھے انسان ہیں۔ وہ ہم گھر والوں کے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں لیکن ایک مسئلہ ہے کہ اُن کا نماز میں دل نہیں لگتا وہ نماز پڑھنے میں بے حد کوتاہی سے کام لیتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت بھی نہیں کرتے حالانکہ اُن کے والد

صاحب (مرحوم) حافظ قرآن اور ایک عالم باہل تھے۔ میرے شوہر کے باقی بھائی بہت نمازی اور پرہیزگار ہیں۔ آپ پلیئر میرے میاں جی کے لیے دُعا فرمادیں اور مجھے کوئی ایسا عمل بتادیں جس کے ورد کرنے سے اللہ تعالیٰ اُن کو بلکہ ہم دونوں کو ایسا بنا دے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو پسند آجائیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر لاہور میں جاب کرتے ہیں اور مجھے اور بچوں کو ساتھ نہیں رکھتے جبکہ میں گجرات میں رہتی ہوں۔ میں اُن کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ آپ کوئی وظیفہ بتادیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی وسیلہ بتا دے کہ ہم ساتھ رہیں۔

☆ بیٹی آسیہ! خوش رہو۔ اپنے شوہر کے لیے دُعا کیا کرو کہ اللہ انہیں بھی نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نماز فجر کے بعد 99 بار سورۃ آل عمران آیت 39 تا 40 پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رخسانہ۔ ننگانہ صاحب۔

○ باباجی! السلام علیکم! میرا نام رخسانہ ہے۔ مجھے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے بہت شرم آ رہی ہے۔ میں بی اے کی طالبہ ہوں اور میں میٹرک ہی سے کسی لڑکے سے محبت کرتی ہوں اُس لڑکے کا نام امتیاز ہے۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن میرا رشتہ نہیں مانگتا۔ سات آٹھ سال سے وہ مجھے باتوں ہی باتوں میں ٹالتا رہتا ہے کہ ہمیں ابھی سے شادی نہیں کرنی چاہیے حالانکہ اس کی عمر 36 سال ہے اور میری عمر 22 سال ہے۔ اس کے 4 بھائی اور 3 بہنیں ہیں۔ سارے بھائی ڈاکٹر ہیں لیکن وہ سارے اتنی زیادہ عمر ہونے کے باوجود شادی نہیں کرتے اور نہ ہی بہنوں کی شادیاں کرتے ہیں۔ ویسے میرے گھر والے بھی اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے کیونکہ اُن کی ذات آرائیں

ہے اور ہماری مغل ہے۔ باباجی! میں اُس کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی اُس نے مجھے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ آؤ ہم کورٹ میرج کر لیں لیکن میں اپنے والدین کی عزت کو بھی خاکی میں ملنے دوں گی اس لیے میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی لیکن اُس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتی وہ میری زندگی ہے میں نے اس کو حاصل کرنے کے لیے بہت باتیں بہت طعنے سنے ہیں بہت کچھ برداشت کیا ہے لیکن اب میں بے بس ہوں میرے گھر والے جلد سے جلد میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ باباجی! آپ مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے امتیاز کا تبادلہ لاہور میں ہو جائے اور وہ رشتہ بھی بھیج دے اور میرے گھر والے بھی راضی ہو جائیں۔ باباجی! آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھے گا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی آپ کے لیے دُعاے خیر ہی کرتی رہوں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔

☆ بیٹی رخسانہ!.....

اِنَّ يَكْفُرُ الْاَوَّلِيْنَ كَقَوْلِ الْاَوَّلِيْنَ
بِاَصْحَابِهِمْ لَمَّا تَبَوَّءُوا الْاَوَّلِيْنَ
رَبَّهُمْ لَمَّا تَبَوَّءُوا الْاَوَّلِيْنَ
لَقَدْ كُنْتُمْ فِيْ اَشْكُوْا

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 33 بار پڑھو اور آخر درود شریف پھر دُعا کرو۔ اللہ سے بہتری کی دُعا کیا کرو۔

□ زبیدہ علی بخاری۔ کراچی۔

○ باباجی! السلام علیکم! اللہ آپ کو آجر دے جو آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں اور اللہ نے آپ کو وسیلہ بنا کے بھیجا ہے۔ باباجی! میری اور بھائی کی شادیوں کا مسئلہ ہے۔ کئی جگہ بات بنتے بنتے ختم ہو جاتی ہے نجانے کیا کار کاٹ ہے؟ اگر بے تو ہرائے کرم کوئی وظیفہ یا تعویذ بتادیں۔ ہماری عمریں نکلی جا

رہی ہیں۔ میرا دوسرا مسئلہ میرے بھائی کا ہے اس کو دو سال پہلے بخار ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی جو کہ نہیں لگانی چاہیے تھی۔ بھائی کو لقمہ ہو گیا تھا۔ ایک آنکھ بھی بند ہو گئی ہے۔ باباجی! اس کا کوئی تعویذ ہوتا ہے یا اگر کوئی وظیفہ ہے تو وہ بھی بتادیں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ (آمین!)

☆ بیٹی زبیدہ! میں تعویذ بنا کر دوں گا۔ تم مجھے براہ راست یعنی جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھو۔

□ محمد اعظم۔ ننگانہ صاحب۔

○ باباجی! السلام علیکم! میرا بھائی بہت زیادہ شکی طبیعت کا مالک ہے۔ وہ ہم پر بہت شک کرتا ہے اور مارتا پینتا بھی ہے حالانکہ میرے بھائی نے برادری سے باہر اپنی پسند کی شادی کروائی ہے۔ میری بھابھی بہت اچھی اور بہت صبر والی بھی ہیں۔ بھائی بھابھی کو اُن کی والدہ کے پاس بھی نہیں جانے دیتا بلکہ کہیں بھی لے کر نہیں جاتا ذرا ذرا سی بات پر شک کرنا اور گالی گلوچ دینا اس کا کام بن گیا ہے۔ آج سے چار سال پہلے بھائی کی ناراضگی بڑی بہن سے ہو گئی تھی بھائی نے آج تک بابجی سے بات تک نہیں کی اور نہ ہی اس کے شوہر کو بلایا ہے۔ میرا بھائی بی اے پاس ہے اور شریف بھی ہے لیکن شک اتنا کرتا ہے کہ اگر کوئی دروازے پر دستک دے تو ہماری شامت آجاتی ہے۔ بہت غلط گالیاں دیتا ہے۔ اگر بھابھی بھائی کو سمجھانے کی کوشش کریں تو اُن کی پٹائی تک کر دیتا ہے۔ ہمارا صرف ایک ہی بھائی ہے۔ ہم 5 بہنیں ہیں۔ میرے امی ابو بھائی کی وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ مجھ سے اُن کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ میری امی اُس کی وجہ سے ہر وقت بیمار رہتی ہیں۔ وہ میرے امی ابو کا بھی کہنا نہیں مانتا۔ کئی عاملوں کو دکھایا ہے۔ اسے بھیجن ہی سے تعویذ ڈالے گئے ہیں لیکن اس کا کوئی تو نہیں کرتا۔ ہم نے

بہت پیسے برباد کیے ہیں، تو پہلے ہی غریب بندے ہیں۔ آپ حساب لگا کر بتائیں کہ میرے بھائی کو کیا مسئلہ ہے؟
☆ بیٹے اعظم!

يَقْرَأُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْ
مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

مندرجہ بالا آیت نماز فجر اور عشاء کے بعد 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فریدہ خاتون۔ کراچی۔

○ محترم جناب باباجی! السلام علیکم! میں ماہنامہ ”چی کہانیاں“ کی مستقل قاری ہوں۔ لوگوں کے مختلف مسائل اور ان کا حل پڑھتی ہوں لیکن پہلی بار اپنا مسئلہ بیان کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے اور آپ لوگوں کے مسئلے قرآن و سنت کی روشنی میں حل کرتے رہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری پانچ سال قبل شادی ہوئی تھی۔ پانچ سال تک میرے شوہر نے کسی قسم کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔ گھر کا راشن پانی اور دیگر اخراجات میرے گھر والے اٹھاتے تھے۔ اس کے باوجود میرے شوہر نہایت بدذہبی، بدتمیزی، بداخلاقی اور کالم گلوچ کرتے تھے وہ بدذہبی میں یہاں تحریر نہیں کر سکتی۔ یہ سب کچھ میں نے پانچ سال تک برداشت کیا اور خدا سے یہی دعا کرتی رہی کہ اس شخص کو میرے حق میں بہتر کر دے۔ وہ مجھے جلا کر مار دینے کی دھمکی بھی دیتا تھا، رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا اور چھوٹ بھی نہیں رہا تھا۔ بالآخر میں نے تنگ آ کر خلع لے لی لیکن مجھے اس بات پر ہر وقت پشیمانی رہتی ہے میں نے خلع کیوں لی؟ مجھے صبر کرنا چاہیے تھا۔ مندرجہ بالا صورت حال کے باوجود اس شخص کا خیال

ذہن سے نہیں نکلتا اور یہ احساس رہتا ہے کہ میں غلط کیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا خیال ذہن سے نکل جائے اور میری دوسری جگہ شادی ہو جائے۔ اس شخص سے میری کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ برائے مہربانی مجھے ایسا کوئی وظیفہ بتائیں کہ میرے دونوں مسئلے باآسانی حل ہو جائیں اور مجھے سکون مل جائے۔

☆ بیٹی فریدہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ (آمین!) نماز کی پابندی رکھو اور دُرو شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد سورۃ بقرہ آیت نمبر 13، 101 بار پڑھو اور دعا کرو۔ بیٹی! بہت ہمت اور صبر سے کام لو۔ یاد رکھو! انسان اتنی ہی مشکل اٹھاتا ہے جتنی اس کو اللہ ہمت عطا کرتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں جلد بازی باعث نقصان ہوتی ہے۔ چلتے پھرتے یہ اسلام کا بہت ورد کیا کرو۔

□ شرجھاں۔ وزیر آباد۔

☆ بیٹی شرجھاں! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ تم نے کئی مسائل لکھے ہیں لہذا ایک مجرب وظیفہ تحریر کر رہا ہوں پابندی کے ساتھ کرو۔ انشاء اللہ معاملات طے پائیں گے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو۔ یا حی یا قیوم! برحمتک استغیث اول و آخر دُرو شریف پھر حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ بیٹی! یاد رکھو! اللہ کی ذات پر پختہ ایمان ہی تمہیں کامیابی دلائے گا۔ دین میں بھی اور دنیا میں۔ زندگی میں صرف ایک اصول اپنانے والا بہت آسودہ رہتا ہے اور وہ ہے کہ کسی کے لیے کبھی دکھ اور اذیت کا سبب مت بنو۔ اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دو سب اچھا ہوگا۔ مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

Hyd-A.A. □

☆ بیٹی! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرو شریف بہت پڑھو۔ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔ خیال رہے وظیفہ مکمل ہوتے ہی کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ N.T.۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرو شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! ”چی کہانیاں“ کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□ ارم۔ سکھر۔

☆ بیٹی ارم! تم اپنی خوراک متوازن کرو۔ جب تک صحت اندرونی طور پر اچھی نہ ہو چہرہ بال بال کیسے جاندار ہوں گے؟ تم اپنی خوراک کا خاص خیال رکھو۔ دودھ اور مچھلی بہت استعمال کرو۔ وزن کا بے تحاشہ بڑھنا بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ ہارمون ڈس آرڈر ہو گیا ہے۔ پہلے کسی اچھی ڈاکٹر سے رجوع کرو۔ بکثرت یا شافعی کا ورد کرو اور چھل قدمی ضرور کیا کرو۔ کم از کم آدھا گھنٹہ ہفتہ میں 4 دن۔

□ رحمان علی۔ پشاور۔

○ باباجی! میں نے سال بھر پہلے اپنی بیوی کے لیے آپ سے تعویذ لیا تھا وہ اور میں ہم اولاد نہ دینے چاہتے تھے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں صحت مند اولاد عطا کی۔ آپ کو اطلاع دینے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ پیدائش کے بعد بچے کو قیران ہو گیا تھا، ہم سب اس میں الجھ گئے۔ اب وہ اچھا ہے مگر آپ کا عطا کردہ تعویذ کھو گیا۔ باباجی! اس بات کو لے کر ہم سب بہت پریشان ہیں۔ میں نے حسب استطاعت صدقہ نکال دیا ہے۔ اب آپ بتائیے مزید کیا کریں؟ کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟

☆ بیٹے رحمان! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے

تمہاری دعا قبول کی۔ بس یہ خیال رکھا کرو کہ اطلاع دینے میں تاخیر نہ ہو۔ بہر حال تم نے رقم خیرات کر دی ہے کافی ہے۔ اللہ کا شکر خوب ادا کرو۔ بچے کا نام بہت اچھا اور با معنی رکھنا۔ اس کی پرورش عین اسلامی خطوط پر کرنا، یہ بہترین شکرانہ ہوگا۔

□ سلسلی پرویز۔ لاہور۔

○ باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ نماز پابندی سے ادا کرتی ہوں مگر پھر بھی دل بہت پریشان رہتا ہے۔ ہر وقت مایوسی طاری رہتی ہے۔ گھر کا ماحول بھی عجیب سا ہے۔ شوہر میری کوئی بات مانتے ہی نہیں، بہت اکھڑے اکھڑے سے رہتے ہیں۔ مجھے بہت رونا آتا ہے۔ بچے بھی گھر سے باہر خوش رہتے ہیں۔ باباجی! میں لوگوں کے گھروں کا اطمینان دیکھتی ہوں تو دل بہت روتا ہے۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟ صدقہ خیرات بھی کرتی ہوں۔

☆ بیٹی سلسلی! تمہارے مسئلے ہی میں تمہارا جواب پوشیدہ ہے۔ سوچو جب تم خود ہر وقت تناؤ کا شکار رہو گی تو سارے گھر پر اس کا اثر پڑے گا۔ شوہر اور بچے بھی اسی لیے گھر میں خوش نہیں رہتے۔ تم صرف اپنے آپ کو بدلوسب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ حالات کیسے بھی ہوں، مطمئن رہا کرو۔ مشکل میں چننے چلانے والے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔ نماز فجر، ظہر اور عشاء کے بعد ایک ایک تسبیح دُرو شریف کی پڑھو اور دعا کرو۔ بروز جمعہ گھر میں کھیر یا علوہ بنا کر اس پر حضور اکرم کے نام کی فاتحہ دو اور یہ بیٹھنا سب گھر والوں کو کھلاؤ، خود بھی کھاؤ۔ صدقہ خیرات کرتی ہو بہت اچھی بات ہے۔ ہر نماز کے بعد ایک بار سورۃ الناس ضرور پڑھا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔



□ فرحانہ۔ مقام نامعلوم۔

○ باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند اور خوش رکھے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر پلیر والا کام کرتے ہیں وہ غصے کے بہت تیز ہیں جبکہ ہمارے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ کرائے کا گھر ہے۔ پلیری تو ہوائی روزی ہے۔ میں سلائی کرتی ہوں۔ باباجی! غصہ تو ہر آدمی کرتا ہے لیکن میرے شوہر کے ساتھ الگ ہی مسئلہ ہے وہ دیکھتے ہیں کہ ہر مہینے ہم پر قرضہ چڑھ جاتا ہے۔ ان کی ہوائی روزی ہے کبھی ملتی ہے کبھی نہیں لیکن پھر بھی میری سلائی کو برا کہتے ہیں۔ باباجی! کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے تو بہتر ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے خود محنت کر لے۔ سلائی کی صورت ایک ہنرمیر سے ہاتھ میں ہے میں نے تین سال پہلے بھی سلائی چھوڑ دی تھی لیکن قرضہ بہت چڑھ گیا تھا۔ میرا گھر چلانے کے لیے میری بہن میری مدد کرتی تھی مگر مجھے بہت شرم آتی تھی۔ آپ یقین کریں پچھلے سال عید پر بچوں کی کوئی چیز نہ خرید سکے۔ میرے شوہر نے گھر کے حالات دیکھتے ہوئے مجھے دوبارہ سلائی کی اجازت اپنی مرضی سے دے دی لیکن اب بھی جب وہ غصے میں آتے ہیں تو میری سلائی مشین اٹھا کے پھینک دیتے ہیں حالانکہ میں سلائی والا کام کرنے کے باوجود گھر صاف رکھتی ہوں کھانا بھی وقت پر تیار رکھتی ہوں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان کو یہ دیکھ کر شرمندگی ہوتی ہے کہ میری بیوی گھر چلانے کے لیے سلائی کرتی ہے۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیے کہ میرے شوہر کا غصہ کم ہو جائے اور وہ یہ بات سمجھ لیں میاں بیوی گاڑی کے دو پیسے ہیں۔ اس مہنگائی کے دور میں دونوں کو مل کر گھر چلانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ایسی کوئی دُعا بتائیے جس کے پڑھنے سے میرے شوہر کی آمدنی میں برکت اور اضافہ ہو

جائے تاکہ میں سلائی چھوڑ دوں۔ میں اپنی خوشی تو انہیں ناراض نہیں کرتی۔ باباجی! آپ اپنی بیوی دُعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھا کریں۔ میں یہ باتیں ماں باپ بہن بھائی سے نہیں کر سکتی ہوں آپ سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ مجھے جواب رسالے ہی میں دیجیے گا۔

☆ بیٹی فرحانہ! خوش رہو۔ نماز کی پابندی کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مندرجہ ذیل آیت ہر نماز کے بعد 700 بار پڑھو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

اللَّهُ أَكْبَرُ، اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ، دَمِینِ بِاَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَنَفَاكَ السَّلَامُ تَبَارَكَتْ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

□ شاہ جہاں نیگم۔ خیرپور۔

○ باباجی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سکھ میسر نہیں۔ میری 5 لڑکیاں ہیں سب شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لکھی ہیں قبول صورت ہیں پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ باباجی! میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ بچیوں کے والد تو ہیں نہیں۔ میں بھی نہیں رہی تو ان کا کیا ہوگا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھ نہیں سکتی۔ یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی شاہ جہاں! اللہ تمہاری دُعا جلد از جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ کبھی بھی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرارت کا ہے چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی! صرف ایک لمحے کے لیے

سوچو تم بچیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہو تو وہ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچیوں کے لیے بہترین اسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اس پاک ذات پر مکمل بھروسہ رکھو۔ مجھ سے تعویذ منگو اگر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ فرحانہ شیخ۔ مسقط۔

○ باباجی! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔

میری نوکری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اس لیے دیر ہوئی کہ کام نیا تھا لہذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ میں نیند بھی صرف 4 گھنٹے کی لیتا تھا مگر اب اللہ کا شکر ہے پہلا ڈرافٹ گھر بھیجا تو امی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرو اور پھر باباجی کو خط لکھو۔ بس باباجی! اسی طرح دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔

☆ بیٹی فرحانہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب درست سمت کوشش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹے! والدین کی بہت خدمت کرنا۔ انہی نے تمہاری پرورش بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع مت دینا۔ میری دُعا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

□ ترنم جہاں۔ سیالکوٹ۔

☆ بیٹی ترنم! اللہ تمہیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسہ رکھو وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فیصلہ کرو گی اس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو جو شخص تمہیں تمہارے والدین سے متفرک کر سکتا ہے وہ تم سے کبھی بھی محفل نہیں ہوگا۔ اب بھی وقت ہے اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔

□ شبانہ شاہد۔ قصور۔

☆ بیٹی شبانہ! بنا نماز کی پابندی کے اللہ تعالیٰ کی رضا کیسے حاصل کر سکتی ہو؟ اپنی زبان پر قابو رکھو اصل میں یہ سب مسائل کی وجہ ہے۔ غصہ آنا فطری عمل ہے مگر اس پر قابو پانا چاہیے۔ تم ہر نماز کے بعد مندرجہ ذیل آیت 700 بار پڑھا کرو۔

اَللّٰهُمَّ بِحَبْلِیْ اِذِیْہِ مِنْ کِیْثًا وَ یَعْدِیْ اِیْہِ مِنْ یُّدِیْہِ

مدت 41 دن ہے۔

□ سارہ۔ اسلام آباد۔

☆ بیٹی سارہ! دُعا مانگنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ انسان بہت کم عقل ہے وہ اپنی زندگی میں مسائل خود ہی پیدا کرتا ہے پھر انہیں حل کرنے کے لیے دُعا میں کرتا ہے۔ رَبِّ الْعِزَّتِ بہتر جانے والا ہے کہ اس کے بندے کے لیے کیا بہتر ہے۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سورۃ آل عمران آیت ۱۱۳ ایک سو تیرہ بار پڑھو اور دُعا کرو۔ اپنے آپ کو بد قسمت کہنا سب سے بڑی کم نصیبی ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو اس کا ہو میو پیٹھک علاج کرو! آفاقہ ہوگا۔ مجھے ۴۱ دن بعد مطلع کرو۔

□ نادیرہ۔ حیدر آباد۔

☆ بیٹی! کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن پر سختی سے عمل در آمد ہی نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔ تمہیں غلطی کا احساس ہے تو بہتر ہے کہ فوراً یہ کام ترک کر دو۔ جتنا وقت ضائع کرو گی اتنی ہی بات خراب ہوتی چلی جائے گی۔ فون اٹھانا چھوڑ دو اور رات میں اٹھا کر نیچے رکھ دیا کرو۔ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار ضرور کیا کرو۔ ایک ماہ بعد پھر مطلع کرو۔

□ وقار علی۔ ٹھٹھہ۔

☆ بیٹے! تمہاری نوکری بحال ہوگئی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ قرآن کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، اس میں بھی تھوڑے ہاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے۔ بہر حال تم ہر نماز کے بعد ۱۰ دفعہ یا غنی کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی پریشانی بیان کرو۔ میں بھی دعا کروں گا۔

□ عالیہ عباسی۔ کراچی۔

☆ بیٹی! تمہاری پریشانی بجا ہے۔ تمہارا شوہر انتہائی غیر ذمہ دار آدمی ہے۔ بہر حال جو بھی ہو رہا ہے تمہیں انہی حالات سے جنگ کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہو۔ یساوکیل کا مستقل ورد کرو۔ نماز مغرب کے بعد آیت الکرسی کا ۱۰۱ مرتبہ ورد کرو۔ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔ مدت ۳۱ دن ہے۔

□ کاشف عابدی۔ جھنگ۔

☆ بیٹے! کاشف! تم سختی لڑ کے ہو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ نماز کی پابندی کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ کام میں چاہے کتنی دیر لگے مگر ایمان کو ڈگمگانا نہیں چاہیے۔ نماز مغرب کے بعد سورۃ النحل کی تلاوت کرو اور دل میں کوئی وسوسہ نہ لاؤ۔ یہ وظیفہ ۳۱ دن کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

□ ساجدہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور اس کی آزمائش دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو مال و متاع دے کر دوسرے خالی ہاتھ۔ ان دونوں صورتوں میں بندے کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میری دلی دعا ہے کہ تمہاری پریشانی دور ہو۔ تم نماز عصر کے بعد یا غنی کا ورد کرو اور پھر نماز فجر میں یہی ورد صدق دل سے کرو۔ کرم ہوگا۔ ورد کی مدت ۹۰ دن ہے۔

□ عذرا جمال۔ راولپنڈی۔

☆ بیٹی عذرا! ہر کام کے لیے پروردگار نے وقت مقرر کیا ہے، انشاء اللہ تمہاری امیدیں پوری ہوں گی۔ میں تو ایک حقیر فقیر بندہ ہوں۔ سننے والا تو اوپر ہے اور وہ ضرور سنتا ہے۔ ہم ذرا بے صبری دکھاتے ہیں۔ انسان کمزور ہوتا ہے اس لیے جلد ہی گھبرا جاتا ہے۔ تم آیت کریمہ کا ورد کرتی رہو اور ہر نماز کے بعد ۱۱ دفعہ دُرود شریف پڑھو۔ انشاء اللہ وہ ضرور سنے گا۔

□ نیلوفر سید۔ دادو۔

☆ بیٹی! اللہ تعالیٰ تمہیں شفا دے۔ حد سے زیادہ پریشانیاں انسان کو بیمار کر دیتی ہیں اور تمہارے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ سرورِ بلند پریشکی زیادتی سے ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔ یہ پریشانیاں انسان کی زندگی کا حصہ ہیں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بے شک پریشانیوں کی رات بڑی لمبی ہوتی ہے۔ یہی انسان کی آزمائش کا وقت ہے جو صبر اور شکر کے سہارے انشاء اللہ گزر جائے گا۔ بچپن کے مسئلے بھی وہی غفور الرحیم حل کرے گا۔ ہر نماز کے بعد سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ۲۱ مرتبہ یا نذو پڑھ کر آنکھوں پر پھیر لیا کرو۔

□ امینہ۔ راولا کوٹ۔

☆ بیٹی! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہلڑکی کو گھر دے جہاں وہ عزت سے رہے لیکن معاشرے کی خرابیوں نے انسان کو حیوان بنا دیا ہے۔ صرف دولت ہی عزت کی نشانی بن گئی ہے مگر پالنے والا رب بے نیاز ہے۔ اس در پر دولت مند اور غریب کی ایک ہی حیثیت ہے۔ جہیز مانگنا تو لعنت ہے۔ بیٹی! تم پریشان مت ہو۔ ہر دم دُرود شریف پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ نماز پابندی سے پڑھو۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سورۃ کوثر ۳۱-۳۱ بار پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔



عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں جاکتے ہیں

انتخاب

محنت کا پھل

شام ہوئی، ایک غریب کسان پھٹے پرانے اور بوسیدہ لباس میں لمبوس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے دروازے پر آٹھرا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور پٹ کھٹنے پر مسکراتا ہوا اندر آگیا اور آگ کے نزدیک اپنے بچوں کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی وفا شعار بیوی نے پرانا دسترخوان بچھا کر معمولی سا کھانا سامنے رکھا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر ایک ٹٹمٹاتے ہوئے چراغ کے سامنے سب مل کر بیٹھ گئے۔ رات کا ابتدائی حصہ گزرنے کے بعد سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور میٹھی نیند کی آغوش میں مدھوش ہو گئے۔ رات گزر گئی۔ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ غریب کسان اپنے مالک حقیقی کا نام لے کر جاگ اٹھا۔ بیوی نے بچوں کے ساتھ مل کر باسی روٹی کے چند ٹوٹے جلدی جلدی نکل لیے اور کندھے پر مل رکھ کر کھیت کو روانہ ہوا تاکہ اپنی پریشانی کے پسینے سے اسے سیراب کر کے اپنی محنت کا پھل ان سرمایہ داروں کے دسترخوان پر

چن دے جنہوں نے گزشتہ رات شراب کی بد مستی اور ناچ گانے والی رنگینوں میں بسر کی۔

عظیم جبران کی کتاب ”آنس اور مسکراہٹ“ کا اقتباس انتخاب: عمران ہارون چھوٹائی۔ کراچی رفاقت

دوست سے گفتگو حکمت و دانائی کے رموز آشکار کرتی ہے۔ ہمارے ظاہر و باطن کا نکھار بحال، ہم نفس سے متاثر ہوتا ہے۔ ہماری عبادت بھی رفاقت سے سعادت حاصل کرتی ہے۔ ہماری تمام دعائیں اجتماعی ہیں اور اجتماع کی بنیاد رفاقتوں سے قائم ہے۔ وہ انسان جس نے رفیق سے وفائے کی۔ کسی سے وفائے نہیں کر سکا، نہ دین سے، نہ خدا سے، نہ خود اپنے آپ سے۔ عظیم انسان حبیب پر غیر متزلزل اعتماد کے سہارے عظیم ہوتے ہیں۔ انتخاب رفیق سے پہلے تحقیق کر لینا جائز ہے لیکن کسی کو دوست کہہ لینے کے بعد اسے کسی آزمائش سے گزارنا بددیانتی ہے۔ دوست کے ساتھ ایک ہی سلوک روا رہے اور وہ وفا ہے۔ وفا کرنے والے کسی کی بے وفائی کا گلہ نہیں کرتے۔ اپنی وفا کا تذکرہ بھی وفا کے باب میں

جنا ہے۔ رفاقت قائم رکھنے کے لیے انسان کو نہ ختم ہونے والا حوصلہ ملا ہے۔ رفاقتیں گردش حالات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ رفاقت صوبوں کی گھاٹیوں سے گنگائی ہوئی گزرتی ہے۔

واصف علی واصف کی کتاب ”دل دریا سندھ“ سے اقتباس
انتخاب: شعیب محی الدین۔ لاہور

کالی بلی

ملک صاحب کی وسیع و عریض حویلی میں یوں تو کئی انسان اور جانور پل رہے تھے لیکن موٹی کالی بلی ایک عرصے سے وہاں مقیم تھی۔ شاید وہ اپنی نسل کی قدیم ترین مخلوق تھی جو حویلی کے نمک پر پل رہی تھی اور دل و جان سے اس کی وفادار اور خیر خواہ تھی۔ وہ زیادہ سوشل نہ تھی۔ بس ایک چکر حویلی کا لگاتی جیسے صبح صبح ہر کسی کو سلام کر رہی ہو، پھر مٹی کے مخصوص پیالے میں پڑے ہوئے دودھ کو لپ لپ کر کے پی جاتی اور یوں ناشتے سے فارغ ہو کر مونچھوں پر زبان پھیرتی حویلی کے جنوب مشرقی کونے میں دبک کر بیٹھ جاتی۔ دوپہر تک وہاں استراحت کرتی، پھر کھانے کے لیے اٹھتی اور جو کچھ مل جاتا، صبر شکر کر کے کھا لیتی اور پھر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹ جاتی۔ وہ گھر والوں کو تنگ کرتی نہ چھوٹے بڑے جانوروں کے معاملوں میں دخل دیتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ تارک الدنیا ہے جو اپنا وقت مراقبہ اور عبادت میں گزارنا چاہتی ہے۔ جانوروں میں غالباً وہ سب سے زیادہ نیک اور پرہیزگار بھی جاتی تھی اور ملک صاحب کے بیٹے اور پوتے اسے احترام سے گریڈا (Grandma) کہتے تھے۔ اتنی حلیم الطبع، خاموش اور نیک بلی پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس بلی میں ایک ہی نقص تھا کہ جب حویلی میں کوئی ناچاز بات یا ظلم ہوتے دیکھتی تو مہر سکوت توڑ کر فریاد ضرور کرتی۔ کبھی دھیمی آواز میں اور کبھی چیخ چیخ کر پتا نہیں شاید یہ بلی اپنے

پیٹ کے دریا بھوک اور پیاس کی وجہ سے بللاتی ہو لیکن وہاں کے باشندوں خصوصاً نوکروں کا خیال تھا کہ یہ صرف ناپسندیدہ کاموں پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

مرحوم صدیق سالک کی کتاب ”ایمر جنسی“ سے اقتباس
انتخاب: نور کھلو۔ حیدر آباد

مقصد حیات

فطرت نے ہر انسان کو ذہن اور جسم دیا ہے۔ سورج سب کے لیے روشنی کا پیامبر ہے۔ ہوا سب کے لیے موجود ہے۔ جب بارش برتی ہے تو امیر کا محل بھی بھیگ جاتا ہے اور غریب کا جھونپڑا بھی۔ انسان کی پیدائش کا عمل ایک ہے اس کی موت کا عمل ایک ہے۔ بھوک سب کو لگتی ہے، خشکی سب کو محسوس ہوتی ہے۔ دکھ کا احساس سب کے لیے تکلیف دہ ہے، خوشی کی کیفیت سب کے لیے یکساں ہے۔ فطرت کی نعمتیں سب کے لیے عطیہ ہیں۔ جب فطرت کا سلوک مادر مہربان کی مانند مساوی ہے، جب فطرت کے نزدیک سب انسان برابر ہیں تو محض حادثہ پیدائش کی بنیادوں پر کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ بچے نہیں ہوتے جنہیں مائیں چٹائی پر جنم دیتی ہیں؟ کیا وہ انسان نہیں ہوتے جو فریبوں کے گھر جنم لیتے ہیں؟ اگر کوئی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پیدا ہوتا ہے تو اس حادثے میں اس کا اپنا کیا کمال؟ وہ جھونپڑے میں بھی اگ سکتا تھا۔ یہ تفریق چند انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔ امارت اور غربت خدا نے نہیں بنائی۔ خدا اتنا بے انصاف نہیں ہو سکتا۔ یہ تفریق سماج نے پیدا کی ہے۔ یہ غیر فطری غیر اخلاقی اور غیر انسانی تفریق ہے۔ اسے ختم کرنا ہوگا۔ اسے مٹانا ہوگا تاکہ نسل آدم اس کرہ ارض پر سکون سے سانس لے سکے۔ فطرت کے رازوں کو سمجھ سکے کائنات کی قوتوں پر قبضہ پا

سکے۔ یہی مقصد حیات ہے۔

رجب انوری کی کتاب ”جھوٹے روپ کدش“ سے اقتباس
انتخاب: عبدالعزیز جی۔ آچکوال

فرض

ستراط نے کہا، ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ صبح اور غلط میں تیز کرے اور اپنے انفرادی استدلال اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے درمیان حد فاضل قائم کرے۔ نہ صرف یہ کہ انسان خود ہر چیز کی کسوٹی ہے بلکہ ہر انسان بجائے خود اپنے لیے بھی ایک کسوٹی ہے۔

ایس ایم شاہد کی کتاب ”مغربی سیاسی افکار“ سے اقتباس
انتخاب: شاہد فراز۔ جب

افسوس کی آواز

باتوں سے خوشبو آئے

☆ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آیا کرو، جانے کس بھیس میں خدال جائے۔
☆ حسرتوں کے جھوم اور خوشیوں کے تلاطم میں ماں کی عظمت کو دیکھو۔
☆ خوب صورتی کی تلاش میں ہم چاہے پوری دنیا کا چکر لگا آئیں اگر وہ ہمارے اندر نہیں تو کہیں نہیں ملے گی۔

☆ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ ہر ایک سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

☆ قدرت نے دل و دماغ کو اونچی جگہ دی ہے۔ اس لیے جذبات کو ہر حالت میں دماغ کے تابع رکھنا چاہیے۔

☆ ادب انسان کا وہ حسین زیور ہے جو اس کا دل اور ذہن سنوارتا ہے۔

☆ علم دلوں کو روشن ذہن کو منور اور آنکھوں کو

شاد کرتا ہے۔

مرسلہ: مسرت گیلانی۔ کراچی
گر کی باتیں

☆ ایک عورت اپنے بیٹے کو کھنڈ بنانے کے لیے 20 سال لگاتی ہے دوسری عورت اسے صرف 20 منٹ میں بے وقوف بنا دیتی ہے۔

☆ غریب ایک طرح کے ہوتے ہیں اور امیر ہر طرح کے۔ غریب کے بچے اور امیر کے رشتہ دار زیادہ ہوتے ہیں۔

☆ خدا سے صلہ رکھنا کہ آخرت سلامت رہے۔ لوگوں سے صلہ رکھنا کہ دنیا پر باد نہ ہو۔

☆ دنیا ایک بازار ہے جو غریب بند ہو جائے گا۔

☆ دنیا میں لوگ بہت زیادہ لیکن انسان نہایت کم ہیں۔

☆ ایک باپ اپنے سات بیٹوں کی پرورش کرتا ہے لیکن افسوس سات بیٹے ایک باپ کی خدمت نہیں کر سکتے۔

☆ لوگ تنقید سن کر اپنی اصلاح نہیں کرتے مگر تعریف سن کر اپنے آپ کو تباہ ضرور کر لیتے ہیں۔

☆ جو شخص گناہ کرتے ہوئے بے گناہ دہاوا دے گا، وہ جہنم میں جائے گا۔

مرسلہ: کامران خان۔ اسلام آباد
یاد رکھنے والی باتیں

☆ سارے لوگ آسانیاں نہیں دیتے اور سارے مشکلین بھی نہیں پیدا کرتے، کچھ سب کی تکریم کرتے ہیں اور کچھ دو جملوں میں ہی دل توڑ جاتے ہیں۔

☆ دل بچھ جائے تو شہر ترنا کے چراغاں سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

☆ جب تم خدا سے محبت کرو تو یہ نہ کہو کہ وہ

میرے دل میں ہے بلکہ یہ کہو کہ میں اس کے دل میں ہوں۔

✽ جب آپ کے کسی بھی عمل سے دوسروں کی آنکھوں کے جگنو بجھ جائیں اور ان آنکھوں میں خوشیوں کی رقی کی بجائے ویرانیوں کا بسیرا ہو جائے تو جان لیجیے کہ اس کی ویران اور بے نور آنکھوں سے آپ کے دل کی ویرانی کا راستہ شروع ہوتا ہے۔

مرسلہ: فیصل عزیز۔ حیدر آباد

اقوال زریں

- ✽ تمہارے ایمان کی نشانی سادگی ہے۔
- ✽ اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو ماضی کو بھول جاؤ۔
- ✽ لڑائی سے زیادہ طاقت محبت میں ہے۔
- ✽ غرور کو اپنے جسم سے نکال دو۔
- ✽ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
- ✽ دوست نماد ثمن سب سے خطرناک ہے۔
- ✽ ایک جاہل عقل مند ترین ہے اگر وہ خاموش رہتا ہے۔

✽ تنگ ذہن ہمیشہ تنگ راستوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

✽ محبت کا ایک لمحہ نفرت کے سو برسوں پر بھاری ہے۔

مرسلہ: قرۃ العین نذیب۔ ملتان

اچھی باتیں

✽ میں نے شجرِ علم کا میوہ توڑ لیا ہے، جس میں لکھا ہے کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

✽ طویل گفتگو ایک تو متکلم کی حیثیت سے پردہ اٹھا دیتی ہے دوسرے سننے والے کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے اس لیے حسنِ کلام یہی ہے کہ کم اور ٹھوس ہو۔

✽ ایسی چیز پر تکبر کرنا جو نہ تمہارے پاس رہے گی نہ تم اس کے پاس، جہالت و نادانی ہے۔

✽ لوگوں سے اس طرح میل جول رکھو کہ تم سے ملیں تو خوش ہوں اور تم مر جاؤ تو تمہارے لیے رونیں۔

✽ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستے مل جاتے ہیں۔

✽ اپنی شخصیت سنوارنے میں اور زندگی بہتر بنانے میں اتنے مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کرنے کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہ بچے۔

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

مسکراہٹیں

پاگل

ایک پاگل دوسرے پاگل کو کہنے لگا، کل میں امریکہ کے سارے کارخانے خرید لوں گا۔
دوسرا پاگل میں بیچوں گا ہی نہیں تو، تو کیسے خریدے گا۔

مرسلہ: شہریار مظفر۔ کراچی

مشورہ

جہاز میں پاگلوں کا بہت شور تھا۔ کچھ پاگل جہاز میں ہاکی کھیلنے لگے۔ جہاز کا پائلٹ تنگ آ چکا تھا۔ آخر ایک پاگل نے کہا جہاز میں ہاکی کھیلنا منع ہے۔ کچھ دیر بعد ایئر ہوسٹس آئی تو کہنے لگی یہ پاگل کہاں گئے تو ایک پاگل کہنے لگا وہاں ہاکی کھیل رہے تھے۔ میں نے جہاز کا دروازہ کھول کر مشورہ دیا کہ جاؤ باہر گراؤنڈ میں جا کر کھیلو۔

مرسلہ: حافظ عبدالرحمن۔ کراچی

پیٹ کا درد

ایک شخص کو پیٹ میں درد کی شکایت تھی۔ وہ ہسپتال گیا اور نرس سے پوچھا ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔

نرس نے جواب دیا وہ آپریشن روم میں ایک آدمی کے پیٹ سے بچی نکال رہے ہیں جو ایک ہفتے پہلے آپریشن کے دوران اس کے پیٹ ہی میں بھول گئے ہیں۔

مرسلہ: امتیاز۔ کراچی

شاعر

ایک بس میں دو آدمی سفر کر رہے تھے، ایک نے کہا، میں شاعر ہوں۔

دوسرے نے منہ پھیرتے ہوئے کہا، میں بہرہ ہوں۔

مرسلہ: عمران خان۔ لاہور

عشق

ایک شخص نے بس میں بیٹھتے ہوئے اپنے قریب کے ایک شخص کو مایوس اور افسردہ دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا: ”کچھ یوں لگتا ہے جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور نا کام ہو گئے۔“

”میں نے زندگی میں ایک ہی بار عشق کیا تھا اور بد قسمتی سے کامیاب ہو گیا۔“

مرسلہ: امجد۔ کوئٹہ

بزمِ آوازیں

☆

کچھ بھی کر گزرنے میں دیر کتنی لگتی ہے برف کے پتھلے میں دیر کتنی لگتی ہے اس نے ہنس کے دیکھا تو مسکرائے ہم بھی ذات سے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تنگ لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے بات جیسی بے معنی، بات اور کیا ہوگی بات سے مکر نے میں دیر کتنی لگتی ہے زعم کتنا کرتے ہو اک چراغ پر اپنے اور ہوا کے چلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

جب یقین کی بانہوں پر رشک کے پاؤں بڑ جائیں چوڑیاں بکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے (نوٹی گیاتی)

حسن انتخاب: شرجیل اقدس۔ جبک آباد

☆

ساتھ چلتے جا رہے ہیں پاس آسکتے نہیں اک ندی کے دو کناروں کو ملا سکتے نہیں دینے والے نے دیا سب کچھ عجب انداز سے سامنے دنیا بڑی ہے اور اٹھا سکتے نہیں اس کی بھی مجبوریاں ہیں، میری بھی مجبوریاں روز ملتے ہیں مگر گھر میں بتا سکتے نہیں کس نے کس کا نام انٹوں پر لکھا ہے خون سے اشتہاروں سے یہ دیواریں چھپا سکتے نہیں آدمی کیا ہے گزرتے وقت کی تصویر ہے جانے والے کو صدا دے کر بلا سکتے نہیں اس کی یادوں سے منہ لگتا ہے سارا دن پیار کی خوشبو کو سینے میں چھپا سکتے نہیں پتھروں کے پرتوں میں آنسوؤں کو کیا رکھیں پھول کو لفظوں کے گلوں میں کھلا سکتے نہیں

(بشیر بدر)

حسن انتخاب: صائمہ خان۔ راولپنڈی

☆

کاش ہم کھل کے زندگی کرتے عمر گزری ہے خود کشی کرتے کون دشمن تری طرح کا تھا اور ہم کس سے دوستی کرتے بھگ گئے کتنے چاند سے چہرے دل کے صحرا میں چاندنی کرتے عشق اجرت طلب نہ تھا ورنہ ہم ترے در پہ نوکری کرتے اس تمنا میں ہو گئے رسوا

اک تیرے جانے کے بعد

زندگی کے رنگ ہیں یہ یا میری قسمت کا کھیل؟
رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں اک تیرے جانے کے بعد

یوں تو زندگی، دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے مگر کبھی موت کے مہیب سائے اس طرح زندگی کے شجر سے مسرتوں کے برگ خزاں میں بدل دیتے ہیں کہ ہر شجر ہجر لگتا ہے۔ جینا بے مقصد نظر آتا ہے مگر چونکہ زندگی عطیہ خداوندی ہے اس لیے سانس گنتا ہی زندگی ٹھہرا، تو پھر شاید میں بھی اپنی بہت پیاری چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں والی بہن کو کھو کر زندہ ہوں۔ جو کشمکش زیست سے بالآخر ہار کر موت کی وادیوں میں بسیرا کر بیٹھی۔ زندگی کا کس قدر اذیت ناک لمحہ تھا جب اپنی گڑیا جیسی بہن کو (جس نے خود اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر مجھ سے بہت سی گڑیاں لی تھیں) مٹی کی آغوش کے سپرد کیا تھا۔ تب وہ بہن جسے میں نے جھولے دیئے تھے جسے اپنے بازوؤں میں لے کر پیار سے ہوا میں اچھالا کرتا تھا۔ اسے اپنے ہی ہاتھوں سے اس لمحہ میں اتارنا، آہ اک قیامت تھی جو کئی برس گزرنے کے بعد بھی میرے دل میں پھانس بن کر اٹکی ہوئی ہے۔ وہ بہن کہ جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے رخصت لے لی۔ جس کے آنکھ میں کھلنے والے چار پھول، ابھی زندگی کی بہاروں کے منظر ہی تھے کہ خزاں کے بے رحم ہاتھوں نے وہ گلشن زیست اجاڑ دیا۔ میری پیاری بہن! تم نے زندگی میں جتنی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلیں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں حج کی ادائیگی سے بھی سرفراز کیا۔ تمہارے قدم ریاض الجنت کو تو چھو بیچکے ہیں۔ تمہاری آنکھوں اور قدموں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے سو یقیناً خوش گمانی ہے کہ رب العزت نے تمہاری لحد کو بھی جنت کا گوشہ بنا دیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اور ہم سب کو لواحقین کو بھی اپنے مقرب بندوں میں شامل کرے، آمین۔

سو گئی ہے ساری دنیا اک تیرے جانے کے بعد
سب جہاں پہ ادا سی اک تیرے جانے کے بعد

یکطرفہ محبت

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں یہ محبت کیوں ہوتی ہے؟ انسان تو ایسے بھی جی سکتا ہے پھر محبت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ محبت ہنستے کھیلنے انسان کی زندگی میں آگ لگا دیتی ہے لیکن یہ پھر بھی ہو جاتی ہے۔ کوئی اسے مٹا نہیں سکتا کوئی اس جذبے کو دبا نہیں سکتا۔ ہر دور میں اس نے خون بہا دیئے۔ ہر دور میں اس نے پاگل بنا دے اس نے مجنوں کو بلی کی تہج میں مار دیا۔ اس نے مانیوال کی سوئی کو دریا میں بہا دیا۔ اس نے کسی کو پتوں کی جدائی میں ننگے پاؤں تپتے صحرا میں دوڑا دیا۔ اس نے ماروی کو عمر کے قلعے میں قید کر دیا پھر بھی یہ محبت ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی بے درد ہوتی ہے۔ محبت کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک دوطرفہ اور ایک یکطرفہ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ یکطرفہ محبت ہوتی ہے اس میں انسان نہ جیتا ہے نہ مرنے سے بس ہمیشہ اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اس محبت میں تو جینا محال ہو جاتا ہے۔ جو اس یکطرفہ محبت کے عذاب سے گزرتے ہیں وہی اس کا درد جانتے ہیں۔

دنیا کے اس شہ نے اجد کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
خود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں
(اجہد اسلام آباد)
حسن انتخاب: فیضان عثمانی۔ کراچی

☆

تم میرے پاس رہو
میرے قاتل، میرے دلدار، میرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیر رات چلے
مرہم مشک لیے، بشر الماس لیے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، لگاتی نکلے
درد کے کاسی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ سکنے لگیں
آس لیے

اور بچوں کے بلکنے کی طرح ٹٹٹلے
بہرنا سودگی مچلے تو مٹائے نہ سنے

جب کوئی بات بنائے نہ بنے

جب نہ کوئی بات چلے

جس گھڑی رات چلے

جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیر رات چلے

پاس رہو

میرے قاتل، میرے دلدار میرے پاس رہو

(فیض احمد فیض)

حسن انتخاب: قرۃ العین زینب۔ ملتان

☆☆☆

ہم بھی جی بھر کے عاشقی کرتے
حسن اس کا نہ کھل سکا محسن
تھک گئے لوگ شاعری کرتے
(محسن نقوی)
حسن انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

☆

باندھ لیں ہاتھ پہ سینے پہ سجائیں تم کو
جی میں آتا ہے کہ تعویذ بنا لیں تم کو
پھر تمہیں روز سنواریں، تمہیں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلیں سا لگائیں تم کو
کیا عجب خواہشیں اٹھتی ہیں ہمارے دل میں
کر کے مناسا ہواؤں میں اچھالیں تم کو
اس قدر ٹوٹ کے تم پر ہمیں پیار آتا ہے
اپنی بانہوں میں بھریں، مار ہی ڈالیں تم کو

(سید وحی شاہ)

حسن انتخاب: آصف اقبال۔ نواب شاہ

☆

ہر پل حیاں میں بسنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں
ساری بات تعلق کی ہے جذبوں کی سچائی تک ہے
میل دلوں میں آجائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں
منظر منظر کھل اٹھتے ہیں پیرائیں کی قوس و قزح سے
موسم تیرے فہم پڑنے سے اور سہانے ہو جاتے ہیں
جھوپڑیوں میں ہر اک تنہی پیدا ہوتے مل جاتی ہے
اسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہو جاتے ہیں

ان مسلمانوں میں کون سا ایسا جذبہ اور عظیم الشان مقصد ہے جس کے لیے یہ لوگ دنیا کی تمام خواہشات اور تہنوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے تین سو تیرہ کو ہزاروں کے مقابل میں لاکھڑا کیا تھا؟ وہ کون سا جوش تھا جس نے مجاہدوں کو دریاؤں اور سمندروں میں کودنے، تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کرنے اور برف سے ڈھکے ہوئے فلک یوس پہاڑوں کو روندنے کی قوت دی تھی۔ ان تمام سوالوں کا جواب ایک مسلمان سپاہی ہی دے سکتا ہے۔ وہ جواب ہے ”اللہ اکبر!“ اسے جذبہ ایمان کہتے ہیں۔ اس جذبے کو قائم رکھنا اب ہم تمام مسلمانوں کا اولین فرض ہے۔ اس عظیم جذبے کی وجہ سے ہی ہمارا پیارا ملک پاکستان قائم رہ سکتا ہے اور اسی جذبے کی وجہ سے ہی ہم اپنے دشمن کو شکست دے سکتے ہیں۔ اے اللہ! میرے ملک کے ہر بچے کو ایسی ماں عطا فرما جیسے شیخو سلطان، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد، سلطان محمود غزنوی، ظہیر الدین بابر، اورنگ زیب عالمگیر، محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی تھیں کیونکہ ایک ماں ہی اپنی اولاد کی درست تربیت کر سکتی ہے اور پھر وہ فرد اپنی قوم اور وطن کے لیے بہترین معمار ثابت ہوتا ہے پھر اس کی اولاد بھی نیک صالح ثابت ہوں گی اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہے گا اور ملک و قوم کی حالت بھی سدھرتی چلی جائے گی۔

میری ماں میرے لیے اصول خزانے سے کم نہ تھی۔ ماں میری آنکھیں ہر وقت آپ کو تلاش کرتی ہیں۔ اے کاش! آپ مجھے دوبارہ مل جائیں تو میں سب کچھ چھوڑ دوں اور آپ پر قربان ہو جاؤں۔ ماں آپ کی یادیں ایسی ہیں جن کو بھول جانا میرے بس میں نہیں۔ میری نس نس آپ کو پکارتی ہے ماں آپ کے لیے تاروں سے خوش مانگی تھی۔ نہ جو جس میں کوئی غم اللہ سے آپ کے لیے وہ زندگی مانگی تھی۔ مجھ سے چھڑ گئیں اب تو بس آپ کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ ماں میں زندگی کی راہوں پر چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ اے اللہ! مجھے ہمت اور حوصلہ دے۔ ماں! آپ کے بغیر زندگی دیران لگتی ہے میں بہت اداس رہتی ہوں۔ دل نہیں لگتا تاماں! میں کیا کروں؟ آپ کی مسکراہٹ میرے دل کی بہار تھی۔ اب مجھے کسی چیز کی تمنائیں، مجھے سب پاگل کہتے ہیں۔ ہاں میں پاگل ہی تو ہوں آپ کے پیار اور محبت میں۔ مجھے لکھنے کا شوق نہیں ماں آپ کے پیار کے لیے یہ سچے الفاظ لکھ رہی ہوں۔ اپنے غم کو بھلانے کے لیے وقت بہترین مرہم ہے میں وقت کے زیر علاج اپنا غم بھولنے کی کوشش کروں گی۔ کہتے ہیں غم ہٹانے سے ہلکا ہو جاتا ہے اس لیے اپنے سچے جذبات کو لفظوں کی زبان دے کر اپنے دل کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں یہ الفاظ لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگی ہوئی ہے۔ ماں! آپ کو میں زندگی کی آخری سانس تک یاد رکھوں گی۔

آپس میں اتحاد اور محبت زندگی میں شامل نہ ہوں تو انسان بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس چھوٹی سی کہانی سے باخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک خوبصورت گنے جنگل میں تین گائے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک گائے کالی، دوسری بھوری اور تیسری گائے چھوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ سفید دودھ کی طرح تھی۔ دونوں گائے اس کا بہت خیال رکھتیں پروہ اپنے حسن پر بہت غرور کرتی اور دونوں گائے کو بے عزت کرتی رہتی جس پر وہ دونوں

گائے اس کی بات کا برا نہ مانیں بلکہ چھوٹا جان کر معاف کر دیتیں۔ ایک روز ایک شیر جنگل کے اس طرف نکل آیا جہاں تینوں گائیں رہا کرتی تھیں۔ جنگل کے بادشاہ شیر نے بہت کوشش کی پروہ ایک گائے کو بھی نہ کھاسکا۔ آخر شیر نے ایک ترکیب سوچ لی اور سفید گائے سے دوستی کر کے ان کے ساتھ رہنے لگا۔ کالی اور بھوری گائے نے سفید گائے کو بہت سمجھایا کہ شیر کو ساتھ نہ رکھے پروہ نہ مانی وقت گزرنے لگا۔ ایک دن شیر کو کہیں کھانا نہ ملا اس نے چالاکی سے سفید گائے سے کہا۔ ”تمہاری خوب صورتی اور مزید بڑھ سکتی ہے۔“ شیر کی بات پر گائے مسکرا کر بولی۔ ”اچھا وہ کیسے؟“ شیر بولا۔ ”دیکھو ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے اور بھوکا رہنے سے تم کمزور ہو جاؤ گی پھر تم بری لگو گی کیوں نہ ہم بھوری گائے کو کھالیں ویسے بھی وہ تمہاری خوب صورتی سے چلتی ہے۔“ سفید گائے نے شیر کی بات مان لی اور بھوری گائے کو جنگل کے راستے کی طرف لے گئی جہاں شیر پہلے سے تاک میں بیٹھا تھا اس نے بھوری گائے پر حملہ کیا اور دونوں نے بھوری گائے کھالی۔ کالی گائے کو جب خبر ہوئی کہ بھوری گائے صبح سے نکلے ہے اور اب تک گھر نہ آئی تو وہ پریشان ہو گئی اس نے سفید گائے سے کئی بار بھوری گائے کے بارے میں سوال کیا پروہ انکار کرتی رہی کہ وہ بھوری گائے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ کچھ دن بعد شیر کی نیت کالی گائے پر لگ گئی۔ اس نے پھر ایک طریقہ سوچا اور سفید گائے کے پاس آ بیٹھا۔ ”تم اتنی خوب صورت گائے ہو یہ پورا گھر تو صرف تمہارا ہونا چاہیے تمہاری کالی گائے تمہاری خوب صورتی میں داغ کی طرح ہے۔“ شیر کی بات پھر سفید گائے کے دل کو لگی اس نے شیر کا ساتھ دیا اور شیر نے کالی گائے بھی کھالی۔ سفید گائے بہت خوش تھی کہ اب گھاس کا یہ پورا گھر اس کا اپنا ہے اور کوئی اس سے جتنے والا نہیں ہے۔ چند روز بعد شیر کا سفید گائے کو کھانے کا دل کیا اس نے کہا: ”میں یہاں صرف تمہیں کھانے آیا تھا پر تمہاری دونوں ساتھی گائے نہیں مجھ سے بچاتی رہیں اب وہ دونوں نہیں ہیں اب میں تمہیں کھا جاؤں گا۔“ اور شیر نے سفید گائے پر حملہ کر دیا۔ مرتے مرتے گائے سوچنے لگی اگر میں نے اتحاد برقرار رکھا ہوتا اور دونوں ساتھی گائے سے محبت کی ہوتی تو وہ دونوں آج زندہ ہوتیں میں نے انہیں کھو دیا اور میری سزا بھی یہی ہے کہ مجھے شیر کھا جائے۔

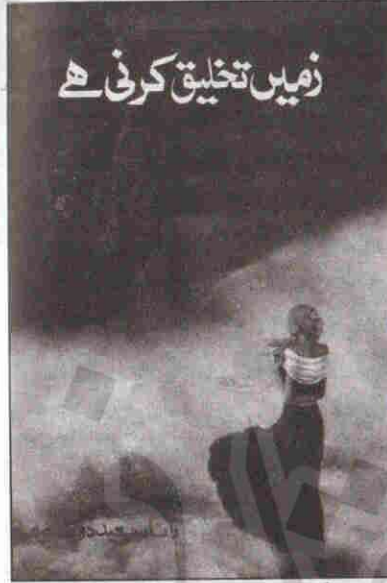
ایک سردرات میں بے وجہ ہی ایک عجب بے نامی اداسی، یا سیت سارے وجود میں در آئی ہے۔ نہ جانے کیوں..... ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کچھ کچھ تو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ شاید موسم کی یہی خوبی ہے کہ شہر ناہیں، رنگ بدلتا ہے۔ ہر پل نئے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ایسے میں دھندلے سائے، اجنبی ہیولے سے لگتے لگتے ہیں۔ دل کش مناظر آنکھوں میں جپتے ہیں۔ محفل سے تنہائی، شور سے خاموشی، روشنی سے اندھیرے پھیلے لگتے ہیں جب آنکھوں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ اجالے کا سامنا کر سکیں۔ جسم و جاں پر ایسی افسردگی و قنوطیت سی سوار ہے۔ شاید اب کے پھر موسم بدلا ہے اور یہی تصویر جس میں رنگ بے تھے اب لے رنگ سے لگتے ہیں۔ دنیا سے کنارہ کر لینے کی خواہش انگڑائیاں لیتی ہے۔ آہ وہ تمبر کی اٹھارہ تاریخ..... جو لگن کی خوشی کے احساس سے لبریز، خواہشات کے صحرا میں نکلنا کا مزہ سنا کر پھر ایسے گم ہوتے ہیں کہ پھر ل نہیں پاتے۔ یہ سوچ کر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آب حیات کا چشمہ پھر بہہ سا جاتا ہے۔ میرے آنسو آنکھوں کی سرحد پار کر کے مجھ پر میری بے بسی عیاں کر دیتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ

کوئی صدمہ ضروری تو نہیں ہے
پوچھی روئے کو بھی جی چاہتا ہے

عصر حاضر کے توانا لہجے کے خوبصورت شاعر

رانا سعید دوشی

عکاسہ شحر



ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کے لہجے کا اعتماد اور آواز کا استحکام بھی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ ان کی غزل اور نظم میں گہری فنی ریاضت کا پتہ ملتا ہے۔ مصرعوں کی ساخت، خیال کی وسعت، بحر کے انتخاب اور لفظوں کی نشست و برخاست میں ایک خاص قسم کا سلیقہ اور برتاؤ ہے۔

رانا سعید دوشی لفظ کی حرمت اور تقدس کا پاس جانتے ہیں۔ ان کا کلام ہمیں حرف لفظ مصرعے اور شعر کے تقدس سے آشنا کرتا ہے۔

میری کہاں بساط جو لکھوں تری صفات
برکت اتار خود ہی مری بات بات میں

☆

در نبیؐ یہ رومال میرا رکھ دینا
قطار طول بھی پکڑے تو میری باری رہے

☆

لفظ جب خون میں تر ہو کے معافی مانگے
کر بلا پھر کوئی تیروں کی کہانی مانگے
پیار کا لفظ ہی صحرا کی طرح ہوتا ہے
لب مجلس جاتے ہیں، کیسے کوئی پانی مانگے
سعید دوشی کی شاعری اپنے عصر کی نمائندگی
کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے سے بہت آگے
کا سفر طے کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ”زمین تخلیق کرنی
ہے“ کی غزلیں نئے علامہ درموزئی تراکیب اور نئے
لب و لہجے کی بنا پر ایک منفرد اسلوب کی غماز ہیں
شعری کیونٹس بھی خاصا وسیع ہے۔

کب تجھے کوئی تری خاک سے پہچانتا ہے
وقت ہر شخص کو پوشاک سے پہچانتا ہے
بھولتا کب ہے کوئی اپنی بنائی شے کو
کوزہ گر ہے وہ مجھے چاک سے پہچانتا ہے
ان کی فکری صلاحیت بے حد دلکش دل آویز اور
فکرا انگیز ہے۔ تجربے کی آج اور مشاہدے کی روشنی
نے رنگ تغزل کو دوا آتشہ کر دیا ہے۔ سعید دوشی کے
کلام میں سبھی موسموں کے رنگ موجود ہیں
لطافت، شگفتگی، تازہ کاری، جدیدیت، روایات کا
احترام۔

کیوں کرتا ہے کم ظرفوں سے تو تکرار سمندر
جیسے گزرے خاموشی سے وقت گزار سمندر
ایسے دیکھا کرتا تھا میں اس کی جھیلی آنکھیں
جیسے کوئی دیکھ رہا ہو پہلی بار سمندر
جتنی آسانی سے میں نے تجھ کو پار کیا ہے
کیا تو کر سکتا ہے ایسے مجھ کو پار سمندر؟
میں سیراب کروں صحرا! میری آنکھ میں آؤ
پیار تمہاری ہے ہی کتنی بس دو چار سمندر
انسانی کم مائیگی ہو یا اس کم مائیگی کی دریافت
وہ ہر مضمون کو بڑی نفاست سے بیان کرنے کے

ہنر سے واقف ہیں۔ ان کی غزل کے اندر پانی
جانے والی روانی اور بہاؤ کی کیفیت دل و روح کو
مضطرب کرتی ہے۔

کہاں کسی کی حمایت میں مارا جاؤں گا
میں کم شناس مروت میں مارا جاؤں گا
میں مارا جاؤں گا پہلے کسی فسانے میں
پھر اس کے بعد حقیقت میں مارا جاؤں گا
میں درغلیا ہوا لا رہا ہوں اپنے خلاف
میں اپنے شوق شہادت میں مارا جاؤں گا
مجھے بتایا ہوا ہے مری چھٹی جس نے
میں اپنے عہد خلافت میں مارا جاؤں گا
مرا یہ خون مرے دشمنوں کے سر ہوگا
میں دوستوں کی حراست میں مارا جاؤں گا
نہیں مروں گا کسی جنگ میں، یہ سوچ لیا
میں اب کی بار محبت میں مارا جاؤں گا
ہر شعر ایک کہانی، زندگی کے تمام تر موضوعات کا
احاطہ کرتی ہے لا زوال غزل کتنے رنگوں کو اپنے اندر
سمیٹے ہوئے ہے۔ فغسکی بے ساختہ پن، فطری سوز،
جمالانی کیفیت، جدید اسلوب، احساس کی نزاکت،
وسیع کیونٹس۔

.....

شاعری میں وقت کے تقاضے مد نظر رکھتے
ہوئے کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، یہ تبدیلیاں
شاعری کے زندہ ہونے اور عصری تقاضوں سے قدم
سے قدم ملا کر چلنے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ جہاں
نیک سعید دوشی کی نظم کا تعلق ہے اس میں سب سے
پہلا تاثر داخلی و خارجی مشاہدہ اور حسیت کا ہے۔ ان
کی نظموں میں علمی وسعت کا انعکاس بھی ملتا ہے اور
انسانی زندگی کے مسائل کا پرتو بھی۔ فطرت کے

رنگوں سے تشکیل پانے والے مناظر بھی ہیں اور نفسیات کے بطون سے پھوٹنے والے ہولے بھی۔ اصل میں نظم پھیلاؤ میں اختصار کے مجرہ کا تقاضہ کرتی ہے اور نظم کا جو شاعر اس اعجاز کا حامل نہیں وہ زیادہ دیر تک اس میدان میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ یہ اعجاز شاعر کو اپنی ذات کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ سعید دوشی کو اس اعجاز پر بھی گرفت حاصل ہے۔ جدید اور خوبصورت نظم کہتے ہیں۔ کچھ نظموں میں فلسفیانہ لمس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی نظم کے خیال میں غیر معمولی فعالیت اور شدید اضطراب کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ سعید دوشی کی نظم نئی نئی راہیں تلاش کرتی ہے۔ اکثر جگہوں پر ان کا استفہامیہ انداز فکری تحرک کا باعث بنتا ہے۔ ان کی نظموں میں تجربات کی ایک خوبصورت دنیا آباد ہے۔ ”جدائی کے لیے شرط“ سے چند لائیں

میں چولستان کا اک ریتیلیا ٹیلہ

ٹور گستان روہی کا

ہماری پیاس

بس.....

اک لہر قلمزم کی

میں تیری ذات کے صحرا میں کچھ ایسے

بکھر جاؤں کہ مجھ کو

کوئی یکجا کرنا چاہے بھی

تو وہ یکجانہ کر پائے

رنگارنگ موضوعات کو فنی اعتماد اور ادبی معیار کے ساتھ پیش کرنا سعید دوشی کی نظموں کی پہچان ہے۔ ان کی نظموں میں درد کی ایک ایسی حرارت کیفیت ہے جو ان کے ہم عصر شعراء میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ ”جولائی کی دوپہر“ کاش میں بھی زمین میں اگتا بے سمت مسافت، زمیں تخلیق کرنی

ہے جاتے رہتا، تمہیں گرمی نہیں آتی، چائلڈ لیئر تو تلے جگنو، ابھی موسم نہیں بدلا، کفن میں جب ہوئی تو جدائی کے لیے شرط اپنی آنکھیں واپس لے جا وائٹ کالز ندامت کی ردا اتری یہ کیا کھیل ہے؟ تجھے کئی نہیں ملتی شامل، ہر نظم کی ایک الگ چاشنی ہے ہر روپ دل آویز، ان نظموں میں سعید دوشی نے کئی روپ اختیار کیے ہیں ہر روپ کی اپنی ایک کشش ان کی علمی وسعت کا اندازہ نظموں کے عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

”کفن میں جیب ہوتی تو“ اس نظم کی چند لائیں ملاحظہ ہوں۔

کفن میں جیب ہوتی تو

مرے پس ماندگان مجھ کو کبھی مرنے نہ دیتے

اور میں

مرنے کے لیے سو سو جتن کرتا

اگر میں خودکشی کرتا

تو میری لاش کو کچے سے لٹکا چھوڑ دیتے

اور مجھے مردود کہہ کر فاتحہ خوانی پہ

پابندی لگا دیتے

ان کی نظموں میں دریاؤں جیسی گہرائی اور روانی ہے، خوبصورت تراکیب، تشبیہات و استعارات کا برخل استعمال سعید دوشی نے زندگی کے ورق ورق کا مطالعہ کھلی آنکھوں سے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی راہیں خود ہموار کی ہیں، نئے مضامین، نئی فکر، نئے خیال نئے اسلوب اور نیا اظہار انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے شعری قالب میں ڈھال دیا۔

آئے مجھ سے خوف کھاتے ہیں

تو نے پتھر بنا دیا مجھ کو

تو نے مشہور کر دیا ورثہ

کوئی بھی جانتا نہ تھا مجھ کو

☆

میں پانی پانی ہوتا جا رہا ہوں
مجھے اتنی پشیمانی بہت ہے
اک لمحے میں کتنی صدیاں ہوتی ہیں
کتنا جی سکتا ہوں میں اک لمحے میں
واپس آنے میں صدیاں لگ جائیں گی
اتنی دور گیا ہوں میں اک لمحے میں

☆

فقیری تو نہیں جو تجھ کو دے دوں
خدائی بانٹنے کی چیز ہے کیا؟

☆

اوڑھ لی میں نے زمیں جسم کے اوپر میرے دوست
اور کرتا بھی میں کیا تجھ سے بچھڑ کر میرے دوست
تو بس اک بار مرے پیار کی حامی بھر لے
جو بھی ہو آگے مرا اپنا مقدر میرے دوست

☆

یہ آسمان میرا مستقل ٹھکانہ ہے
مگر زمیں پہ بھی صدیوں سے آنا جانا ہے
میں پچھلی بار یہاں قیس بن کے آیا تھا
نجانے اب کے محبت نے کیا بنانا ہے؟

☆

مرا تو عشق وہاں داؤ پر لگا ہوا تھا
یہاں ہر اک کو ایمان کی پڑی ہوئی تھی

☆

کچھ نہ بن پایا تو کشتوں میں خود کو ڈالا
خالی جانے نہ دیا گھر سے سوالی میں نے
الفاظ کے برتاؤ سے جوی پختہ کاری ان کے کلام
کا خاصہ ہے یہ پختہ کاری محض کرافٹ کے تقاضے

بھانے سے وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے سوتے اس یقین سے پھونٹے ہیں جو شاعر کے لہجے کو متزلزل نہیں ہونے دیتا۔ سعید دوشی کے کلام میں تیزی سے بدلتا ہوا منظر نامہ انسان کی انسان کے ہاتھوں تذلیل اور منافق معاشرے میں فرد کے داخلی تضادات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

سعید دوشی اس عہد کے توانا شاعر ہیں، ان کے ہاں عصری شعور آگے اور زمانی وجدان کی کبھی کیفیات نظر آتی ہیں۔ ان کے اشعار کے آئینے میں ہر شخص اپنا اور اپنے عہدہ کا چہرہ دیکھ سکتا ہے..... سماجی و معاشرتی معاملات کے ساتھ سعید دوشی نے فکر و احساس کے کئی پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔

پیاس جب توڑتی ہے سر پہ مصیبت کے پہاڑ
کوئی چشمہ میری آنکھوں سے ابل پڑتا ہے
ان کا توانا اور دھیما لہجہ شائستگی کا مظہر ہے۔ بے کلمی اداسی، لنگھتی ادھورے خواب، چراغ، چشمہ، سمندر، مٹی، جزیئرے، مون، جگنو، صحرا، بارش، ساون، فطرت اور حقیقی زندگی کے تمام تراستارے ان کی شعری کائنات میں شامل ہیں۔

”زمیں تخلیق کرنی ہے“ کی مجموعی فضاء حقیقت پسندی، منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ موجودہ شعری منظر نامے میں بہت کم شعراء کو غزل و نظم پر دسترس حاصل ہے۔ ان چند گنے چنے ناموں میں ایک نام رانا سعید دوشی کا بھی ہے۔ اس ایک مضمون میں ان کے فن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ خدائے حرف و قلم ”زمیں تخلیق کرنی ہے“ کہ خالق کو مزید کامیابیاں اور کامرانیاں عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆☆☆

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

میشم علی آغا..... صغیر سلطانہ جیکب آباد
سوچتا ہوں کہ اگر قرب میسر ہوتا
سانس لینے میں مجھے کتنی سہولت ہوتی
خالق ارض و سما اک گلہ ہے تجھ سے
اس کو اک بار تو چھوٹنے کی اجازت ہوتی
میشم علی آغا، قیصر پرویز راجپوت، جیکب آباد
مجھ کو اتنا عزیز ہی سو تشنگی لیے
چپ چاپ ہر فرات سے آگے نکل گیا
یہ عشق میرا مسئلہ تھا ہی نہیں، سو میں
اس ساری واردات سے آگے نکل گیا
اجمل سراج..... رابعی، ایبٹ آباد
شکستہ دل ہمارا ہو رہا ہے
سمندر کیوں کنارہ ہو رہا ہے؟
یہ آنکھیں کیوں چمک آئی ہیں یکدم
یہ دل کیوں پارہ پارہ ہو رہا ہے؟
اوم پر بھاکر..... راشد رفیق، کراچی
تمہارے بعد بھی یہ زندگی محسوس ہوتی ہے
شبِ فرقت میں بھی کچھ روشنی محسوس ہوتی ہے
سردار آصف..... نیسہ شاہین، دادو
جانتا ہوں کہ کیا بچا مجھ میں
نہ تو پتھر نہ آئینہ مجھ میں
دیکھ پھر کس طرح میں پھیلوں گا؟
پہلے تو آگ تو لگا مجھ میں
منظر حقیقی..... انشین بدر، جہلم
ہر اک زت میں شکستہ آرزو کا گھر چمکتا تھا
ہمارے آسمان پر درد کا سورج چمکتا تھا
راشد جمال فاروقی..... گل رعنا، ٹھوکی
بد کوئی کے سب شیوہ گراں شہ کے مصاحب
حق کوئی کی پاداش میں ہم شہر بدر ہیں

حسن جلیگانی..... مہدی صن، روہڑی
یہ جانتے تھے وہ خنجر چمکا کے لائے گا
مگر اسے بھی گلے سے لگایا ہم نے
سمیٹ لائے سمندر سے ریت کا دریا
چلو کہ اپنا آئینہ تو پالیا ہم نے
عطاء الرحمن طارق..... سکن اعجاز، میاری
میری ہستی جل تو ہونے دے
تو مجھے آب و گل تو ہونے دے
میری نیندوں کو بے نیاز نہ کر
روشنی منتقل تو ہونے دے
راشد انور راشد..... انوشہ صدیق، جھنگ
اڑتی رہتی ہے سدا خط، دیران میں خاک
آگئی چپکے سے اب کے مرے دالان میں خاک
مطمئن تھا میں کہ طوفان تجھے عرصہ ہوا
غور سے دیکھا تو قابض تھی دل و جان میں خاک
کاشی چوہان..... شہر بانولا، ہور
زہر پھرنی تھیں وہ جو کانوں میں
لگ گئی آگ آن زبانوں میں
ساقی فاروقی..... امیہ شاہ، صادق آباد
وہی آنکھوں میں اور آنکھوں سے پوشیدہ بھی رہتا ہے
مری یادوں میں اک بھولا ہوا چہرہ بھی رہتا ہے
کرشن کمار طور..... اشعر جبران، مرید کے
بدل گیا ہے زمانہ، لوگ کہتے ہیں
مری نظر میں تو دنیا مگر وہی کچھ ہے
اجمل سراج..... رخشندہ علی، شہدادپور
بات کیا دل سے گزر جاتی ہے
موج ساحل سے گزر جاتی ہے
ختم ہوتا ہی نہیں ہے یہ سفر
راہ منزل سے گزر جاتی ہے

اوم پر بھاکر..... عبدالنجان، ٹھٹھہ
اُن کے آنے کی خوشی میں ہم نے
زخمِ دل خوب سجا رکھا ہے
رات کو چاند نے سونے نہ دیا
دن کو سورج نے جگا رکھا ہے
ارشاد نظر..... راحت خان، ساہیوال
زندگی، تیری آبرو ہم سے
لوگ ملتے ہیں با وضو ہم سے
ہنس کے بولا وہ خوب رو ہم سے
کون ملتا ہے ہو بہو تم سے
خورشید اکبر..... سبن اشعر، ملتان
دشت بولے کہیں صحرا، کہیں پانی بولے
جس طرف دیکھوں، ادھر ایک روانی بولے
عقیل شاداب..... نور فاطمہ، خانیوال
تری دہلیز پر سر رکھ چکا ہوں
میں اپنے دل پہ پتھر رکھ چکا ہوں
گیا ہے چھوڑ کے جس دن سے کوئی
میں تنہائی کو نوکر رکھ چکا ہوں
کاشی چوہان..... عالم خان، لائل پور
مسئلہ دل قبول وردگانہ تھا
مسئلہ تھا تو اپنے قد کا تھا
احمد نواز..... عصمت جہاں، حیدر آباد
دور آشوب سے جواشے ہیں
وقت کا انتخاب ہیں ہم لوگ
اجمل سراج..... شاز یہ عرف، چوکی
خوف انجانا ٹھہر گیا ہے
دل ویرانہ ٹھہر گیا ہے
اب میری دہلیز پہ آ کر
ایک زمانہ ٹھہر گیا ہے
سیفی سرخسی..... شیخ تاج، پشاور
سوکھا ہوا حجر تھا مجھے ٹوٹا ہی تھا
میرے عزیز، ساتھ ترا چھوٹا ہی تھا

رکھی تھی شرط کس لیے تھی ارے چلوں؟
جب قافلہ ہمارا اسے لوٹا ہی تھا
شاہد فیروز..... مسلم خان، ڈیرہ اسماعیل خان
میں نہیں، میرا گھر ہے پتھر کا
اس لیے کچھ اثر ہے پتھر کا
اس کے ہاتھوں نے قہر ڈھایا ہے
کس نے بولا یہ شہر ہے پتھر کا
اسد اللہ اسد..... فتنی اسلم، حاصل پور
مجھے راہوں میں تنہا چھوڑ کے اب جا رہے ہو تم
تمہیں اپنے کئے وعدے نبھانے بھی نہیں آتے
پروین شاکر..... عمر الحسن، کراچی
جلتو کون دن میں پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
احمد فراز..... شراز خان، خان پور
سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے؟
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا
خالد یوسفی..... سلمان عمرانی، سہاول
دوست سارے ہیں مگر درد آشنا کوئی نہیں
کس کو حالِ دل سناؤں سوچتا رہتا ہوں میں
جان کاشمیری..... تنویر فاطمہ، کراچی
وہ پھول جو تقسیمِ لطافت نہیں کرتا
کھلتا ہے مگر کھل کے قیامت نہیں کرتا
آپس میں الجھنے کے سزاوار ہیں عاقل
پاگل کبھی پاگل کی شکایت نہیں کرتا
علی اختر اختر..... غمیر الدین، کراچی
کب تک یہ اجتناب، یہ صبر آزما جواب
اب لطف ہے اسی میں کہ پردہ اٹھائیے

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔
شاعر کے نام کے بغیر شعر شامل اشاعت نہیں کیا
جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

فاطمہ بلگرامی

جس کی آنکھوں میں خواب بے پناہ تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا کھرا ہوا لمحہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

جس کی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تھریلر سلسلہ

والٹراسٹریٹ کا اسٹاپ آگیا تھا۔ مجھے یہیں اترنا تھا۔ میں ایگزٹ ڈور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے جسم پر اور کوٹ تھا اور اس پر برساتی تھی۔ پھر بھی سرد ہوانے نیچے اترتے ہی حراج پوچھ لیا۔ تیز ہوا شتر کی طرح ہر موئے تن میں چبھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ روٹی کے گالے سے اڑتے برف کے ذرات خوش نما لگے۔ جھل ملانی سفید چادری چھائی نظر آ رہی تھی۔ لوگ چھتریوں لگائے۔ رین کوٹ پہنے آ جا رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے ہوتا ہوا اس بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ کارڈ پر یہیں کاپتا تھا۔ تیسری منزل کے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ نظر آ گیا۔ اس کے برابر میں ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ دوسرا آدمی خباثت والے چہرے کا تھا اس لیے میں نے پہلے آدمی کو مخاطب کیا "کیا آپ ہی مسٹر جوین الفارڈ ہیں؟"

"جی ہاں..... آپ شاید لارڈ ڈلفی کے....." اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹی۔
"جی ہاں... آپ نے صحیح پہچانا۔"

"میرا اسٹنٹ کاغذات تیار کر چکا ہے۔ آپ دستخط کر دیں اور جتنی جلد ہو قبضہ حاصل کر لیں۔"
"مگر میں ان کاغذات پر نو دستخط کرنا چاہتا ہوں اور نہ جانکا در قبضہ۔"

میری بات پر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ "آپ کو معلوم ہے یہ جانکا در کتنے کی ہے؟ مسٹر ڈیوڈ! پورے ستر لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی ہے؟"

"کتنے ہی کی کیوں نہ ہو مجھے نہیں لینا۔" میں نے صاف بات کی۔
"اگر آپ نہیں لیں گے تو یہ وصیت کے خلاف بات ہوگی۔" وکیل نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔

”آپ ایسا کریں کہ یہ جائیداد میری این جی او کوڈنٹ کر دیں۔“ وکیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔
 ”فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”عجب پاگل شخص ہے۔“ وکیل کی بو بواہٹ مجھے صاف سنائی دے گئی تھی مگر میں رکنا نہیں۔ دفتر سے نکل کر
 باہر آ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ساؤتھ ہال کی طرف جاؤں مگر میں نے سوچا کہ ایک عرصہ ہو گیا ہے اسچر صدیقی
 چچا کی طرف گیا نہیں آج وہاں کا ایک چکر لگا آؤں۔ اسی خیال سے میں اس طرف جانے والی بس کے انتظار
 میں ٹریبل پر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

ڈوریل بجاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی شہلا چچی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے چہکارتے
 ہوئے بولیں۔ ”ارے آج اتنے دنوں بعد کیسے راستہ بھول پڑے۔ ہم تو تمہاری شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس
 گئے ہیں۔“
 ”بس چچی جان، مصروفیت ہی اتنی ہے کہ کہیں آنے جانے کا سوچ کر ہی رہ جاتا ہوں۔ امی کے بعد میں
 بہت زیادہ اپ سیٹ ہو گیا ہوں۔ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا۔“ میں نے کہا تو وہ بھی افسردہ ہو گئیں۔ پھر بولیں
 ”کیا اندر آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اندر تو آؤ۔“
 میں اندر داخل ہوا تو ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھے چچا جان نظر آ گئے۔ میں نے سلام کیا تو وہ دعا دیتے ہوئے
 بولے ”بیٹا مجھے تو تم سے شکایت ہے ہی مگر شہلا کو بہت زیادہ ہے۔ بوڑھی ہو گئی ہے نا۔“
 ”بوڑھے تم ہوئے ہوئے ہوئے کیوں ہونے لگی۔“ شہلا چچی مصنوعی غصے میں بولیں اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

شہلا چچی میرے لیے بہت اہم شخص میں انہیں ناراض کیسے کر دیتا اسی لیے جلدی سے بولا ”چچی جان کو مٹالینا
 کون سا مشکل ہے۔ آپ مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتیں۔“
 ”جمل شیطان کہیں کا۔“ شہلا چچی نے میرے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔
 چپت اگر ہلکے سے پڑے تو پیار کا پرتو اور اگر زور سے پڑے تو دشمنی کی ابتدا۔ اس چپت میں پیار تھا۔ وہ پیار
 جو بچپن سے مجھ پر نچھاور ہوتا آیا ہے۔ میں نہال ہو گیا۔ ہنستے ہوئے بولا ”بس اسی چپت کی لالچ میں تو میں آج آیا
 ہوں کتنے دن ہو گئے آپ نے چپت نہیں ماری۔“
 ”اب تو بوڑھی تو ہو گیا ہے۔“ چچی نے پیار سے سر سہلا کر کہا۔
 ”پہاڑ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے آسمان سے نیچا ہی رہتا۔ آپ میرے لیے شفقت بھر آسمان ہیں۔“ میں
 نے ان کے آگے سر جھکا کر اداکاری کے انداز میں مکالمہ بولا تو چچا نے فس کر کہا:
 ”کیا ادب اسے آ رہے ہو۔ یہ ڈاکا لگ کیوں پھینکا جا رہا ہے؟“
 ”دراصل میرا موڈ خراب ہو گیا۔ اسی کچی کو چچی جان کی ہلاوت میں دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صبح ہی
 صبح وکیل کا فون آ گیا تھا۔ اس سے مل کر رہا ہوں۔“
 ”اس نے کیا کہا؟“ چچا جان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
 ”وہی مرنے کی ایک ٹانگ بہت بڑی جائیداد ہے لے لو۔“
 ”اس جائیداد پر تمہارا حق بنتا ہے تمہیں لے لینا چاہیے۔“ چچا نے غصے سے لہجے میں کہا۔

”نہیں! میں اس جائیداد کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا۔“ میں نے صاف لہجے میں کہا۔
 ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس جائیداد کی مالیت ستر لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی ہے یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ تم
 ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی گزار رہے ہو ایک ایک پیسے کے لیے ترستے ہوئے زندگی گزار چکے ہو پھر
 بھی؟“ چچا کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”جی ہاں! پھر بھی لارڈ ڈلفی کی جائیداد پر میں تھوکتا ہوں۔“ میرے الفاظ سے نفرت عیاں تھی۔
 ”آخر کب تک تم نفرت کی آگ میں جلتے رہو گے کچھ بھی ہو اب لارڈ ڈلفی اب اس دنیا میں نہیں
 رہے۔ ان کو معاف کر دو۔“

”اگر میری ماں نے انہیں معاف کر دیا ہوتا تو شاید میں بھی معاف کر چکا ہوتا۔“ میرے لہجے میں درد سمٹ آیا۔
 ”میری واقعی مریم تھی، حضرت مریم کی طرح معصوم۔ وہ ایک رحم کے جذبے سے سرشار عورت تھی۔ اگر وہ
 آج رہتی تو تمہیں بھی یہی مشورہ دیتی کہ تم لارڈ ڈلفی کو معاف کر دو۔“
 ”امی جان اب اس دنیا میں رہی نہیں اس لیے ان کا ذکر اب فضول ہے۔“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔
 ”تمہارے اس پاگل پن کا علاج اب تمہاری چچی ہی ڈھونڈیں گی۔ یہ بتاؤ کہ آئندہ کا پلان کیا ہے۔ کیونکہ
 اب تو تم نے تعلیم بھی مکمل کر لی۔ کس کے ساتھ مل کر کام شروع کرو گے؟ کسی انگریز کے ساتھ یا صفدر اینڈ کمپنی
 میں شامل ہو جاؤ گے۔“
 ”فل الحال میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“
 ”دکرا؟“

”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں لندن میں پلا بڑھا ضرور ہوں مگر مجھے اس سرزمین سے کبھی پیار نہ تھا۔ اس ملک کو اپنا نہیں سمجھا کیوں کہ میرے دل و دماغ پر شروع سے پاکستان چھایا رہا ہے۔ بچپن سے میں اسی ملک کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرے لبوں پر ہر وقت بس ایک ہی دعا ہوتی تھی کہ میں ایک بار صرف ایک بار اس پاک سرزمین کو دیکھ لوں۔ اس سرزمین کو بس کے حصول کے لیے ماؤں نے اپنے جگر کوٹے، بہنو نے اپنی آنکھوں کوٹی، ننھے ننھے بچوں کے گلے کاٹے گئے۔ جوانوں کے امنگوں بھرے سینے چھیدے گئے۔ جسے اسلام نام پر حاصل کیا گیا ہے۔“

”تو کوئی تم نے پاکستان جانے کی ٹھان لی ہے؟“

”جی ہاں کیوں کہ اب تک میں چاہ کر بھی پاکستان جان نہیں سکا۔ میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ میری ماں تھی۔ ان کا پیار تھا۔ متا کا قرض کون چکا سکا ہے؟ پھر میری امی تو بہت معصوم اور بہت اخلاق والی تھیں۔ اسی لیے بار بار پاکستان دیکھنے کا خواب دیکھتے ہوئے بھی میں ان سے منہ بھر کر کبھی فرمائش نہیں کرتا۔ لیکن اب میں اپنے اس خواب کو ضرور پورا کروں گا۔“

”پاکستان جانا چاہتے ہو چلے جانا۔ میں خود انتظام کر دوں گا مگر پہلے تم لاارڈ ڈلفی کی جائداد پر اپنا حق جما لو۔ اسے حاصل کر کے کسی کیرئیر کے سپرد کر کے جاؤ۔“

”آپ کا مشورہ میرے سر آنکھوں پر اس لندن میں آپ لوگوں کے سوانہ کوئی پہلے تھا اور نہ اب کوئی ہے۔ آپ لوگ میرے بھلے کے لیے ہی سوچتے ہیں مگر.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان باتوں کو کوئی مارو پہلے کھانا کھاؤ۔ تمہاری پسندیدہ ڈش ماش کی چھڑی فائف تیار کی ہے۔“ کہتے ہوئے چچی جان نے ڈائینگ ٹیبل پر رکھی پلیٹ میں کھڑی نکالتے ہوئے کہا۔

ساؤتھ ہال میں پاکستان سے لائی ہوئی تمام اشیاء شامل جاتی ہے جس میں اصلی گھی اور اچار بھی ہے۔ میں نے ابھی تک پاکستان تو دیکھا نہیں ہے مگر پاکستانی ڈش چچی کی بدولت کھاتا رہا ہوں۔ ماش کی چھڑی بھی ڈال کر اور آم کا اچار۔ میں خود کو روک نہ سکا اور ٹیبل کی طرف کھینچا چلا آیا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

”دیکھو بیٹا! اس دنیا میں پیسے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اس کا احساس تمہیں بھی ہوگا۔ اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ جذبات کو تھپکیاں دے کر سلاو اور لاارڈ ڈلفی کی جائداد اپنے نام کر دو۔“ کھانے کے درمیان بھی چچا سمجھاتے رہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کہا ”آپ کی اس بات کا جواب میں کل دوں گا۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے ماچسٹر کے لیے نکلتا ہے۔ کل تک لوٹ آؤں گا پھر آپ کو بتا دوں گا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔“ میں ان کے گھر سے نکل آیا۔

ابھی میں باہر نکلا ہی تھا کہ ٹوبل الفسٹن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ایک ساتھ کھیل کر ہم بڑے ہوئے۔ وہ مجھے اپنا دوست ہی نہیں بھائی کہتا تھا۔ وہ بھی نسلا انگریز تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”ہیلو بویو کیسے ہو؟ اتنے دن بعد نظر آئے۔ تعلیم مکمل کر لی ناں۔“

”ہاں.....“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”آؤ وہاں بیٹھتے ہیں، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

میں اس کے ساتھ سامنے والے پارک میں آ گیا۔

اس نے ایک خالی بیچ پر بیٹھتے ہوئے کہا ”ڈیوڈ تم میرے دوست ہی نہیں میرے بھائی کی طرح ہو۔ ایسٹ لندن میں تم سے زیادہ قریب میرے اور کوئی نہیں ہے۔ بچپن سے میں تم سے خود کو بہت قریب سمجھتا رہا ہوں۔ تمہارے دل میں پتا نہیں میرے لیے کیا جذبات ہیں میں نہیں جانتا۔“

”میں تمہاری اس تمہید کا مقصد سمجھ نہیں پایا؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ تمہارے گریڈ پالارڈ ڈلفی نے اپنی وصیت میں ساری جائداد تمہارے نام کر دی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اور تم اس دولت کو شکرا رہے ہو؟“

”ہاں یہ بھی سچ ہے۔“ میں نے اقرار کیا۔

”ایسا اس لیے نا کہ تمہاری ممانے لاارڈ ڈلفی کے گھر میں رہنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ان سے ناراض تھیں۔“

”ہاں!“

”گزرے وقت کی باتوں کو سینے سے لگائے رکھنا عقل مند ہی نہیں ہے۔ لاارڈ ڈلفی کی اپنی ایک حیثیت تھی۔ ان کا بہت بڑا نام تھا۔ ان کے نام سے جڑنا بھی فخر کی بات ہے۔ میری نانوتو لاارڈ کی وصیت پر عمل کر لو۔ ان کی جائداد پر قبضہ لے لو ورنہ....“

”ورنہ کیا؟“

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو لاارڈ ڈلفی کی جائداد پر گدھ نظریں گزائے ہوئے ہیں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”گدھ؟ کون سے گدھ؟“ میں نے اچھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”میں ایک راسخ العقیدہ کیتھولک ہوں۔ پابندی سے چرچ جاتا ہوں.....“

”ہاں یہ میں مانتا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس کا بھی تمہیں علم ہے کہ جو خدا باپ کے پیارے بیٹے کو غلط سمجھتا ہے میں اسے غلط سمجھتا ہوں، خواہ وہ یہودی ہو یا مسلم۔“

”ہاں یہ بھی جانتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کو بدترین سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے خدا کے بیٹے کو ازیت دی۔ اسے سولی چڑھایا۔“ وہ اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا اور میں دوستی کے ناتے برداشت کر رہا تھا۔ وہ مذہب کے معاملے میں جنونی تھا مگر دوست تھا اس لیے میں خاموش تھا۔ مجھے یار کی یاری سے مطلب تھا۔ یار کے فعل سے نہیں۔ اس لیے بھی میں ہمت نہ کوش ہونے کی ادا کاری کر رہا تھا۔

”یہ خدا باپ کی مجرم قوم ہے۔ سبت کی مجرم ہے۔ من سلوا کی شکرائی ہوئی قوم ہے۔ یعنی کہ طمع و حرص میں بھری قوم ہے۔ لالچ ان کی سرشت میں ہے، دنیا کی سب سے لالچی اور کینہ پرور قوم ہے۔ مگر آپسی اتحاد میں ان کا ثانی نہیں ہے۔“ کہہ کر اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا جیسے وہ میرے چہرے پر اپنے الفاظ کا پرتو ڈھونڈ رہا ہو۔ رد عمل دیکھ رہا ہو۔ میں اس کی اس تقریر سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا مگر اس کی نگاہوں کی پیش سے

فورا ہی متوجہ رہنے کی اداکاری کرنے لگا۔ اس نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا۔ ”اپنے اکلوتے ملک کی خاطر وہ اپنی دنیا سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ ہر سطح پر ایسی اطلاع بھی ملی ہے کہ یہ چھوٹے موٹے جرائم انفرادی طور پر بھی کرتے ہیں اپنے ملک کی خاطر۔ یعنی جو جہاں جس طرح جس سے ہوتا ہے اپنے ملک کی معیشت کو سنبھال دینے کے لیے سرمایہ ہیجتار ہوتا ہے۔ دنیا کے جس کو نے میں یہودی ہے وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ اس وقت ایک یہودی گروپ یہاں بھی کارروایاں کر رہا ہے۔ میرے دوستوں کی اطلاع کے مطابق ایک گروپ تمہارے گرائڈ پاک کی جائداد پر نظریں گڑائے ہوئے ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔ اب میری دلچسپی اس کی باتوں میں بڑھ گئی تھی۔ ”وہ لارڈ ڈلفی کی جائداد میں دلچسپی کیوں لینے لگے؟“

”اس لیے کہ اس کی قیمت وہ کھری کر کے اپنے ملک بھیج سکیں۔ زرمبادلہ ان کے ملک میں پہنچتا رہے۔ یا پھر وہ اسے اپنے کسی کام میں لانا چاہتے ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو جائداد پر قبضہ حاصل کر لو۔“

اس کی باتوں نے مجھے سوچ میں ڈال دیا تھا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر اسرائیلیوں کے مفاد کی خاطر جائداد چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی مجھے یہودیوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کی ظلم کی داستانیں میں میڈیا پر دیکھتا رہتا تھا مگر میں عالمی میڈیا تو تھا نہیں کہ ان ظالموں کے ظلم کو نظر انداز کر دیتا۔ وہ مظلوم فلسطینیوں کی بستیاں اجاڑتے رہیں۔ ان کی لاشیں گراتے رہیں اور ہم خاموش رہیں۔ میں ان لوگوں جیسا تو تھا نہیں جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے دہشت گردی پر اتر آئے ہیں اور اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کر کے اپنے ہی لوگوں کو قتل کرتے ہیں تا کہ اقوام عالم کہہ سکے کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں۔ یعنی یہودیوں کی سازش کا خود ہی شکار ہو رہے ہیں۔ ایسی ہی سازش رہنے کی وجہ سے میں ان یہودیوں کو ناپسند کرتا تھا کہ وہ دکن کو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لینے پر مجبور کر دینے والی سازش تیار کرتے ہیں۔ اب مجھے یاد آگیا تھا کہ وکیل کے ساتھ جو آدمی بیٹھا تھا اس کے چہرے پر وہی خباثت تھی جو ہر یہودی کے چہرے کا خاصہ ہے۔ مجھے تو بل کی بات سچ لگنے لگی تھی۔

”اتنے بڑے لندن میں انہوں نے مجھے کیسے تاک لیا؟“ میں نے اپنے ذہن میں ابھرتے سوال کا جواب مانگا۔ ”یہ بات سب کو معلوم ہے کہ تم پاکستان جانے کی سوچ رہے ہو۔ اس ملک میں جانا چاہتے ہو جس کو تم نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اور یہ بھی تمہارے علم میں ہوگی کہ تعصب پرست اس ملک کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ وہ ایک مسلمان ملک ہے۔ ایسا ملک جو مسلمانوں کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ ہم برستا ہے فلسطین میں اور لوگ روڈ پر نکل آتے ہیں پاکستان میں۔“

”ایسا ہونا عجیب خیر بات نہیں ہے۔ تم ایک کیتھولک عیسائی ہو۔ کسی بھی کیتھولک کے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے تو تمہارا دل دکھتا ہے نا؟“

”وہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ ملک ہر اسلام دشمن شخص کی نظروں میں خار ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے جسے کیسل آف اسلام کہا جاسکتا ہے۔ وہاں تمہارے جانے کا سن کر ہی وہ متوجہ ہوئے ہوں گے۔ ان کی گدھ نظریں ہیں۔ وہ ہر ایک پر نظر رکھتے ہیں۔“

میرے ذہن میں ایک لاوا سا پکنے لگا تھا۔ گویا یہودیوں نے اس جائداد پر آنکھیں گڑا دی ہیں۔ اسے بچانا ضروری ہے۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہودی صرف بڑے بڑے کام کرتے ہیں مگر اب پتا چلا کہ وہ ہر سطح پر کام کر

رہے ہیں۔ اپنی قوم اور ملک کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے لارڈ ڈلفی کی جائداد پر قبضہ بنالینا چاہیے ورنہ یہ بھی ان ڈائریکٹ وے میں یہودیوں کی پرانی ہو جائے گی۔ وہ ایک ایک بینی کر رہے ہیں تاکہ ان کے ملک کو ترقی ملتی رہے۔ وہ دنیا پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکیں۔

”اچھا یہاں میں اس بارے میں اپنے لوگوں سے مشورہ کرتا ہوں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ”میری باتوں پر غور کرتے رہنا۔“ اس نے ہاتھ ملایا اور باہر چلا گیا۔ میں بھی پارک سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ بس پیدل پیدل ہی آگے جاتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل بھی نہیں تھا۔ مجھے کہاں جانا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ دماغ میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ بس میں سوچ میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ حالاں کہ کل تک میں صرف پاکستان جانے پر غور کر رہا تھا۔ اس پاکستان جہاں نواب افتخار الملک تھے۔ وہ افتخار الملک جنہیں میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر میرے لیے وہ بہت اہم تھے۔

نواب افتخار الملک بھارتی شہر یانی پت کے شے مگر اب وہ پاکستانی شہری ہیں۔ وہاں کے شہر کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ خود تو کراچی میں رہتے ہیں مگر ان کی محبت میرے دل میں رہتی ہے۔ اس لیے بھی کہ امی انھیں دل کی گہرائی سے چاہتی تھیں۔ امی میرے لیے سب کچھ تھیں۔ وہ جیسا کہتی تھیں میں ویسا ہی کرتا تھا، انھوں نے لندن کے ماحول سے ہٹ کر میری پرورش کی تھی۔ بالکل اسلامی انداز میں۔ اس لیے میں انھیں ماما مامی نہیں امی جان کہتا تھا۔ امی کے ساتھ ایک اور بستی تھی جس نے میرے نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ تھیں شہلا چچی۔

شہلا چچی کے شوہر امجد صدیقی امی کے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے ہی امی کا تعارف نواب افتخار الملک سے کرایا تھا۔ افتخار الملک ان کے دوست تھے وہ بہت معصوم اور بہت جینکس تھے۔ امی نے یہی بتایا تھا۔ ان کی معصومیت نے ہی امی کو ان کا گریڈ بنایا تھا۔ انہوں نے افتخار الملک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ جسے افتخار الملک نے بھی دل سے قبول کر لیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہ دوستی محبت میں بدل گئی اور پھر شادی کے روپ میں ڈھل گئی۔ دونوں ایک بندھن میں بندھ گئے تھے۔

امی انگریز والدین کی بیٹی تھیں، خطاب یافتہ انگریز کی اور انگریز برصغیر کے حکمران تھے۔ وہ خود کو آقا اور ہندوستانیوں کو غلام سمجھتے تھے۔ اس لیے امی کے پاپا لارڈ ڈلفی اور ان کی ممانے ان کا باپ کاٹ کر دیا۔ مگر امی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبرا سکیں۔ ابوکا ہاتھ پکڑ کر اپنی ماما یا کا گھر چھوڑ دیا۔ ایسے وقت میں امجد چچا نے ان کا ساتھ دیا۔

امجد چچا نے لندن کے مضافات میں ایک گھر لے رکھا تھا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ رہتے تھے۔ شہلا چچی کی مذہبی خاتون تھیں۔ نماز روزے کی سخت پابند۔ ان پر امجد چچا نے ذمے داری ڈال دی تھی کہ وہ امی کو اسلامی تعلیمات سمجھایا کریں گی، انھوں نے امی کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، نماز روزے کے طریقے بتائے۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ سکھایا۔ تاکہ وہ پوری طرح سے مسلمان نظر آئیں۔

ابو امی کی پیاریک نشانی کے طور پر میں اس دنیا میں آنے والا تھا کہ برصغیر میں تعصب کے عفریت نے منہ چاڑ دیا۔ انسانیت مر گئی حیوانیت کا بول بالا ہو گیا۔ بستی کی بستیاں جلائی جانے لگیں۔ لاشوں کے مینار کھڑے کیے جانے لگے۔

وہاں کے بگڑتے ہوئے حالات دیکھ کر ابو کے والدین نے ٹیلی گرام دیا کہ فوراً آ جاؤ۔ ابوتا ریلوے ہی پال پت چلے گئے۔

ابو ایسے گئے کہ پھر انھوں نے مڑ کر خبر نہ لی۔ امی شہلا چچی کے نہ خانے یعنی ڈیسٹ میں زندگی گزارنے لگیں۔ تعلیم یافتہ تھیں۔ انھیں ایک اچھی سی نوکری بھی مل گئی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا اور میں چار سال کا ہو گیا۔ امجد چچا نے ابو کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ جب بھی کوئی ہندوستان سے آتا یا وہاں جاتا امجد چچا اس سے ابو کے بارے میں معلوم کرانے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر کہیں سے بھی حوصلہ افزا خبر نہ ملتی۔ ہندوستان سے آنے والے بتاتے کہ اب وہاں پانی پت میں مسلمان نہیں رہے۔ افتخار الملک کی حویلی جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ شہر میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں ہے۔ یوں بھی ان دنوں ہندوستان مسلمانوں کا مغل بنا ہوا تھا۔ اخبارات مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی المیہ نامک داستانیں سنارہے تھے۔ وہاں سے آنے والے خبروں کی تائید کرتے کہ اب تک لاکھوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ امی نے بھی خود کو بیوا تسلیم کر لیا تھا مگر اسلامی احکامات کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ ان کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ ان کے ساتھ منتقل ہو جائیں لیکن امی کسی طور راضی نہ ہوئیں۔ اس معاملے میں شہلا چچی نے امی کا بھرپور ساتھ دیا۔ جب وہ دفتر چلی جاتیں تو شہلا چچی مجھے سنبھالتیں، مجھے دینی باتیں بتاتیں۔ امی کو شرع کے نکات سمجھاتیں۔

جب میں پانچ سال کا تھا کہ پاکستان سے ابو کا خط آ گیا۔ خط لانے والے نے ہی ابو کو تلاش کیا تھا۔ اسے یہ کام امجد چچا نے سونپا تھا اور اس شخص نے کسی نہ کسی طرح ابو کو ڈھونڈ لیا تھا۔ واپسی کے وقت وہ ان کا خط لے کر آئے تھے۔ خط میں ابو نے لکھا تھا کہ ”لندن سے آنے کے تیسرے ہی دن شہر میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا۔ ایک طرف نیچے مسلمان تھے دوسری طرف ہتھیار بند غنڈے اور مسلح پولس والے۔ ان سب نے مل کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ ہماری حویلی پر بھی بولاؤنیوں نے حملہ کر دیا۔ گھر کے ایک ایک فرد کو قتل کر دیا گیا۔ میری قسمت میں شوکرین کھانا تھا کہ میں اپنی دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ ان کی ایک ہندو سہیلی کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہیں یہ خبر ملی تھی۔ جن کے گھر گیا ہوا تھا۔ ان صاحب میں انسانیت باقی تھی۔ انھوں نے اپنے یہاں چار دن تک ہم تینوں کو چھپائے رکھا۔ پورا شہر بلوئیوں کے گھرے میں تھا۔ ان کا گھیراؤ ڈر کر نکل جانے میں کیسے کامیاب ہوا۔ یہ ناممکن کام کیسے ممکن ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جس شخص نے ہمیں اس گھیرے سے نکالا تھا اس نے ہمیں امدادی کیمپ تک پہنچایا پھر ہم وہاں سے پاکستان آ گئے۔ اس دور پر آشوب میں مجھے خود اپنی خبر نہ تھی، تمہیں کیسے یاد رکھتا۔ مگر آج امجد کے ایک دوست نے میرے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس بیٹے کو دیکھنے کی بڑی آرزو ہے مگر کیا کروں کہ میں یہاں پیسے پیسے کھاتا ہوں۔ دو بہنوں کا ساتھ ہے اس لیے لندن جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم آزاد ہو۔ اگر چاہو تو کسی کا ساتھ پکڑ لینا مگر میری ایک غریب باپ کی التجا ہے کہ میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔ کہیں وہ بھی لندن کے رنگ میں نہ رنگ جائے۔ اگر زندگی رہی تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔“

اس خط کے بعد ابو کا کوئی خط نہیں آیا۔ امی اور امجد چچا نے بہت کوشش کی کہ ان کو رقم بھیج کر لندن بلا لیں مگر وہ کراچی کے اس محلے سے کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔ پھر امی نے بھی امجد چچا کو مطلع کر دیا کہ وہ ابو کو پریشان نہ کریں۔ حالات سازگار ہوں گے تو وہ خود رابطہ کر لیں گے۔

سال بہ سال گزرتے رہے۔ ہمارے حالات بھی کچھ حد تک سنبھل گئے۔ امی نے کچھ پیسے جمع کر کے ساؤتھ ہال میں ایک گھر لے لیا۔ لگو کہ وہاں سے ان کا آس بہت دور تھا مگر اپنا گھر تو تھا۔ اس درمیان بھی مجھے ابو کا انتظار رہا مگر ابو نے مڑ کر خبر نہ لی۔

امی پر وقت سے پہلے بڑھا پا گیا تھا۔ انھیں کھانسی بھی رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ انھیں ٹی بی ہے۔ علاج چلنا رہا۔ ڈاکٹر جو پرہیز بتاتے امی اس کا الٹ کرتیں شائد وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ یا پھر انجانے میں ایسا ہو جاتا تھا۔ ابو کی یادوں کا بخشا ہوا یہ روگ بالآخر اس سٹیج پر آ گیا کہ ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے۔

لوگ کہتے ہیں وقفا مشرق کی میراث ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ وقفا عورت کی سرشت میں داخل ہے خواہ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی۔ یہی وجہ تھی کہ امی نے ابو کی بے وفائی کے باوجود مجھے بھی ان سے متنفر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ کہتیں کہ تمہارے ابو کی پریشانی میں ہوں گے اسی لیے وہ انہیں پارہے ہیں مگر وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی بات غلط ہے یا سچ یہ جاننے کے لیے میں ایک بار ابو سے ملنا چاہتا تھا۔ امی کو پاکستان چلنے کی ترغیب بھی دیتا تھا مگر ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ”نہیں اگر میں وہاں گئی تو وہ اور پریشان ہو جائیں گے۔“

ایسے وقت میں مجھے ایک اور کی بری طرح ستانی تھی۔ اکیلے پن کا درد بری طرح چوٹا تھا۔ دل درد سے بھر اٹھتا تھا۔ اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کاش میری ایک بہن بھی ہوتی۔ اس کی شرارتیں پہنچیں اس گھر کے سونے پن کو دور کر دیتیں، امی ہمہ وقت جسکی تنہائی نظر آتیں۔ ایسے وقت میں اگر ایک بہن ہوتی تو امی کا ہاتھ ضرور پٹائی۔

میں یہی کچھ سوچتا رہتا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ امی کے چہرے پر مہر جھاٹ بڑتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا کہ ان کو کسی روگ نے گھیر لیا ہے۔

روگ تو آخر روگ ہوتا ہے آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا ہے اور پھر ایک دن اپنا بھیا نک جڑا کھول کر نکل لیتا ہے۔ وہی ہوا بالآخر اس نے امی کو قہر تک پہنچایا دیا۔

امی کو مسلم کیونٹی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کے انتقال کا سب نے اثر لیا۔ امجد صدیقی چچا شہلا چچی کے علاوہ بھی بہت سارے مسلم کیونٹی والوں نے اثر لیا تھا۔ امی پابندی سے نماز پڑھتی تھیں۔ اسلام کیونٹی سنٹر جانی تھیں اس لیے بہت سے مسلمان ان کی قربانی سے واقف تھے۔ سب نے مجھ سے تعزیت کی تھی۔

تعزیت دکھ کم نہیں کرتی۔ میں بھی اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ دن رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔

اس دن بھی میں کمرے میں لیٹا ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ چچا جان کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے میری پریشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر بولے۔ ”بتا تمہاری امی کے انتقال کو پورے تین ماہ ہو گئے ہیں مگر تم اب تک سوگ میں پڑے ہو۔ ایسے کیسے چلے گا۔ زندگی کو انجوائے کرو، غم کی دھوپ سے خوشیوں کے سائے میں آنے کی کوشش کرو۔“

”کیا کروں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“
”دیکھو بیٹا۔ اب تم ہو شمند ہو۔ اب تمہاری امی بھی نہیں رہیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم شادی کر لو۔“
”نہیں چچا جان! میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔“ میں نے اردو بولنے کی کوشش کی۔ میں اپنی تہذیب کو اب اور زیادہ اپنانا چاہتا تھا اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ میں خود کو اس طرح کا بنا لوں کہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سمجھ

جائیں کہ یہ مسلمان ہے۔ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ اب نہیں بلاتے ہیں تو نہ بلائیں مگر میں اپنی شناخت بھولوں گا۔“ میری اس جسارت پر وہ حیران رہ گئے اور گلوگیر لہجے میں کہنے لگے۔
 ”داؤد! میں نے تمہیں گئے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ تمہاری ہر خوشی کو مقدم سمجھا ہے۔ اگر تمہیں شادی نہیں کرنا ہے تو زنی سے بات کرو! مجھے احساس مت دلاؤ کہ تمہاری پرورش میں کوئی کھوٹ ہے۔“ امجد صدیقی کا لہجہ میں چھپاؤ دارے کی طرح میرے دل کو چیر گیا۔ کچھ رک کر انہوں نے کہا ”آخر کیوں؟ اگر شادی نہیں کرو گے تو پھر کیسے یہ زندگی گزرے گی؟“

”نہیں بچا جان! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ دراصل میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے لہجے میں زنی پیدا کر لی تھی۔

”کیوں؟ بغیر کسی شریکِ غم کے زندگی کیسے گزرے گی؟ میرا کیا ہے، کسی بھی وقت میری آنکھیں بند ہو سکتی ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر کم نہیں ہوتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہارے سر پر سہرا سجا دوں۔ ایک مرد کے لیے سب سے ہم درد اور مضبوط سہارا بیوی ہی کا ہوتا ہے۔“

”نہیں بچا جان!“ میں نے مسکرا کر ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”سب سے ہمدرد و مضبوط سہارا بھائی بہنوں کا ہوتا ہے۔“

”یہ تمہاری کم عقلی ہے بیٹے؟ تم ابھی نادان ہو۔ میری بھی دو بہنیں ہیں۔ بچپن میں ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ جدا ہونے کا تصور بھی محال تھا لیکن شادی ہونے کے بعد وہ دونوں ہی دور چلی گئیں۔ اپنے شوہروں کے ساتھ۔ ایک بہن کینیڈا میں ہے۔ اس کا شوہر وہاں پروفیسر ہے، وہ خود بھی پروفیسر ہے۔ دوسری امریکا میں بس گئی ہے دونوں اپنے اپنے شوہروں میں گن ہیں۔ دونوں بہنوں کا یہ حال ہے کہ سال دو سال میں کبھی یاد آ گیا تو کسی نے دوسطریں مجھے لکھ دیں۔ وہ بھی جب انھیں کوئی کام پڑے تب۔ امریکا والی بہن کا پرسوں خط آیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھیج رہی ہے۔“

”کب؟ وہ کب آ رہی ہیں؟“ میں انھیں اپنی بہن بنالوں گا“ میرے دل میں بس ایک ارمان ہے میری بھی ایک بہن ہو۔“ میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑتی میری زبان پر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے وہ یہاں نہیں آ رہی ہیں! اپنے دوھیال بریڈ فورڈ میں رہیں گی اور ان کے دوھیال والوں سے تو میری کبھی بی بی نہیں۔ بہت ہی گھٹیا لوگ ہیں۔“ ان کے جواب سے مجھ پر ادس پڑ گئی اور خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ مجھے ہوئے چہرے کے ساتھ میں بیزار ہو کر اٹھ گیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو سوئے چلا۔“

اس دن کے بعد بچپن کا دوست تھا۔ مجھے پورے امید کی کہ وہ اس پر آشوب وقت میں میری مدد کرے گا۔ اسی امید کی ذور سے بندھا میں چلا آیا تھا۔

اس صحتی شہر میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ جہاں جلتے ہیں وہاں اندھرا بھی ہوتا ہے۔ میری زندگی میں جو اندھیرا پھیلا ہوا تھا اسے دور کرنے کے لیے مناسب نوکری کی ضرورت تھی۔ قابلیت میرے پاس تھی لیکن قابلیت کے مطابق نوکری نہیں تھی۔ میں نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا کہ امجد نے سہارا پیش کر دیا۔ و اشرف کی مگتیر کا بھائی تھا۔ اس نے مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری دلا دی۔ اشرف کے احسانوں تلے تو میں

امی نے وہاں جانا پسند نہ کیا تو میں کیوں جاؤں؟ انہوں نے پہاڑ جیسی زندگی مفلسی میں گزار دی۔ آسائش کو ٹھکراتی رہیں پھر میں کیوں احسان لوں؟ پھر وہ لارڈ ہوں گے اپنے گھر کے۔ جب مسلمان نہ ہوئے تو پھر رشتہ داری کیسی؟
 نانا بھی ضد کے کپے تھے متواتر کوشش کیے جا رہے تھے۔ کبھی ان کا نوکر آ جاتا تو کبھی ان کا وکیل۔ میں تو تنگ آ گیا تھا۔

وقت تھا کہ گزرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وصیت میں مجھے سب کچھ سوئپ دیا تھا۔ اس دن میں اسی سلسلے میں وکیل کے پاس گیا تھا کہ دوست سے ملاقات ہو گئی اور اس نے مجھے ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا۔ اور میں نے اگلے ہی دن وکیل کے پاس پہنچ کر کاغذات جمع کروائے اور عدالت میں خود کو وارنٹ ثابت کر کے قبضہ لے لیا اور گھر آ کر میں آئندہ کیا کرنا ہے اس بارے میں غور کرنے لگا۔ کافی دیر تک سوچ کے ساگر میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ پھر پانچ رات کے کس پہر نیند یاد یوی مہربان ہو گئی اور میں بے خبر ہو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ یکایک آنکھ کھل گئی۔ یہ نیند یوں ہی نہیں ٹوٹی تھی بلکہ ضرب شدید سے آنکھ کھلی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے پر گرز سے وار کیا ہو۔ دماغ تک جھجھکا اٹھا تھا، ابھی میں آنکھیں کھول کر وار کرنے والے کو دیکھتا کہ دوبار ضرب پڑی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پھر سے وار ہوا۔ مجھے احساس ہوا کہ چھوٹا تھا کہ مجھے بیٹھ سے باندھ دیا گیا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے جکڑ رکھا ہے اور مار رہے ہیں۔ یہ کون ہیں۔ کس لیے میرے گھر میں گھس آئے ہیں؟ سب سوچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں بس خود کو آزاد کرانے کی کوشش کیے جا رہا تھا کہ کسی نے حکم دیا ”بہت ہو گیا۔ اتنا ہی آج کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ اب بھی نہ سدرھو تو پھر دیکھا جائے گا۔“

پھر ایسا لگا جیسے میری کدی سے سورج طلوع ہوا ہو۔ رنگ برنگے شرارے سے آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے رات کا منظر یاد آنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس شہر دوستان میں دشمنوں کی یورش کہاں سے ہو گئی؟ کون میرا دشمن در آیا ہے؟ کیوں مجھے نشانہ بنایا گیا؟ جیسی مجھے دوست کی بات یاد آ گئی کہ یہودی تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو میری جان بھی خطرے میں ہے۔ اس کا ایک ہی علاج سمجھ میں آیا کہ میں شہر چھوڑ دوں۔ اس لیے کہ دوبارہ بھی حملہ ہو سکتا تھا اور یہ حملہ قاتلانہ ہی نہیں جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے میں نے نہایت خاموشی سے نہ صرف گھر چھوڑ بلکہ شہر بھی چھوڑ دیا اور قسمت آزمائی بریڈ فورڈ چلا آیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اشرف کو فون کر دیا تھا۔ اشرف میرے بچپن کا دوست تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ اس پر آشوب وقت میں میری مدد کرے گا۔ اسی امید کی ذور سے بندھا میں چلا آیا تھا۔

اس صحتی شہر میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ جہاں جلتے ہیں وہاں اندھرا بھی ہوتا ہے۔ میری زندگی میں جو اندھیرا پھیلا ہوا تھا اسے دور کرنے کے لیے مناسب نوکری کی ضرورت تھی۔ قابلیت میرے پاس تھی لیکن قابلیت کے مطابق نوکری نہیں تھی۔ میں نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا کہ امجد نے سہارا پیش کر دیا۔ و اشرف کی مگتیر کا بھائی تھا۔ اس نے مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری دلا دی۔ اشرف کے احسانوں تلے تو میں

پہلے ہی دبا ہوا تھا اب احمد کے احسان کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔

جس دن مجھے جوائنٹنگ لیسٹر ملا اسی شام میں شکر یہ ادا کرنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے آواز دی۔ ”تمہیں نہ دیکھو بھی تمہارے مہمان آئے ہیں۔“ آواز کے ساتھ ہی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

بوائے کٹ بال اور دوپٹے سے محروم سر کو دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ میں جس شہر سے آیا تھا وہاں کبھی مسلمانوں میں بے حجابی کی ایسی تصویر نظر نہیں آئی تھی اس لیے ناگوار کی تیز لہر دماغ میں دوڑ گئی۔ ”مائی ناٹی اینڈ سوئٹ سسٹمینہ۔“ اس نے مسکرا کر تعارف کرایا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ اشرف کی مکتبہ ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی سلام کے لیے میرے ہاتھ اٹھ گئے۔ ”تم دونوں باتیں کرؤ میں ذرا فریٹس ہوں۔“ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ڈونٹ مائنڈ میں ابھی حاضر ہوا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کے دوسری جانب چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی تمہینہ نے بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ میرے دیور ہیں؟ آپ کے پاکستان میں یہی کہتے ہیں نا؟ سنا ہے آپ لاڈ ڈالنی کے نواسے ہو کر بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں۔“ اس کے اس جملے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میرے بارے میں علم ہے کہ میں پاکستان سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔

اس کی بے حجابی پر پاکستان کے بارے میں اس کے ریمارکس پر میں چونک گیا تھا۔ ایک عجیب سی کڑواہٹ کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے ظاہر نہیں کیا اور لہجے میں متحاش پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بھائی سمجھو۔“ ”اچھا۔“ اس نے اس طرح جواب دیا جیسے کوئین کی کڑوی گولی نگل رہی ہو۔ ”ہاں مجھے ایک بہن کی ضرورت ہے۔ بچپن سے ایک ننھی مٹی گڑیا جیسی بہن کا خواب دیکھتا رہا ہوں کیا تم اس کی تعبیر نہیں بنو گی؟“

”اوگاڈ! آپ لوگ خواب بہت دیکھتے ہیں۔ ہمارے اسٹیٹس میں ایسا نہیں ہوتا“ پھر بھی میں آپ کی خواہش کو نہیں ٹھکراؤں گی یوں تو میرے تین بھائی ہیں جو تھا آپ کو مان لیتی ہوں۔“

اس کے انداز گفتگو نے مجھے مایوس کیا تھا پھر بھی میں مطمئن ہو گیا۔ میں جانتا تھا جب لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس کے دل میں ارمان جاگتے ہیں کہ وہ نئے رشتوں سے پہچانی جائے۔ اسے بھائی چچی ممانی کے القاب سے نوازا جائے۔ وہ بھی میری جانب اسی امید سے بڑھی تھی لیکن میں نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ بچپن سے جن رشتوں کی دُور سے وہ بندھی تھی میں نے بھی اپنے آپ کو اسی شکل میں پیش کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مایوس نظر آئی تھی۔ مگر میں نے اسے بہن کے طور پر قبول کر لیا تھا۔

یہی کشش مجھے ہر روز کھینچ کر اس کے گھر لے جانے لگی۔ وقت کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی بدل گیا اور اس نے مجھے دل سے بھائی کا مقام دے دیا۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا وہ مجھے بھیا کہہ کر مخاطب کرتی۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی میں اس کے اندر سے مغرب کی بے حجابی دور نہ کر سکا۔ پاکستان کے بارے میں اس کے خیالات تبدیل نہ کر سکا۔ پھر بھی مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگانے لگتے اور وہ کبھی ننھی مٹی پٹی کی طرح ضد کرنے لگتی۔ یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ضدیں کرتی رہتی اور میں مانتا رہتا۔

”بھائی جان ہری اپ پلینز آج ایک فنکشن میں جانا ہے۔“

”اوہ آج دن بہت بور گزرا چلیے لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔“

”میں کب سے راہ دیکھ رہی تھی“ فائٹ تیار ہو جاؤ۔ شاپنگ کے لیے چلتا ہے۔“

اور میں اپنی جھکن بھول کر اس کے حکم پر دوڑ پڑتا۔

اس مقدس بندھن میں بندھ کر میں بھول گیا تھا کہ لوگ دل میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ رشتے کے تقدس کو نہیں مانتے۔ انھیں تو حرج کے لگانے میں مزہ آتا ہے۔ چھوٹے ذہنوں کے لوگ باتیں بنانے لگے۔

اور تو راشراف بھی مجھ پر چڑھ دوڑا کہ میں اس کی منگیتر کو درغلار ہا ہوں۔ میں نے لاکھ صفائی پیش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی اور مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔

اپنا سامان لے کر میں ایک ہوٹل میں چلا آیا اور ایک ہفتے کی جدوجہد کے بعد دس پاؤنڈ ماہوار پر فلیٹ حاصل کر لیا۔ میرے سامنے والا فلیٹ بھی خالی تھا اس لیے وہ فلور سنسان ہی رہتا تھا۔

اس فلیٹ میں آئے ہوئے مجھے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ سامنے والے فلیٹ میں نئے کرائے دار آ گئے۔ وہ بھی پاکستانی تھے۔ اس گھرانے میں لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے ہی میں اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے ان دونوں کے مزاج کا بھی مطالعہ کر ڈالا تھا۔

بڑی بہن جتنی سنجید اور کم گوئی، چھوٹی اتنی ہی شوخ اور باتوئی تھی۔ جب سے وہ آئی تھی کام کم کر رہی تھی اور باتیں زیادہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

اس کی تیز آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ شوخی بھری باتیں میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لارہی تھیں۔ میں چائے کا کپ تھاں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ آواز ختم ہو گئی۔ میں اس کی باتوں میں اس طرح گھو گیا تھا کہ اس کی خاموشی گراں گزرنے لگی اور میں جھنجھلا کر بچن میں چلا گیا، پیالی رکھ کر لوٹ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک اٹھا۔ جب سے میں اس فلیٹ میں آیا تھا پہلی بار دستک ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا..... ”کون؟“

”ملک مین۔“ باہر سے آواز آئی۔ اسے بل ادا کرنا تھا اس لیے میں باہر آ گیا۔ بل اور دودھ کی بوتل لے کر میں نے اسے رقم دی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اب میرا ایک ہی کام تھا کہ میں اپارٹمنٹ میں آنے کے بعد ان لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش میں لگ جاتا۔ اگر وہ لوگ بچن میں ہوتے تو ان کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ میں خوب لطف لیتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا کہ ایک دن شام کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”دروازہ کھولیں.....“ وہی پڑوس کی شوخ آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت کے ساتھ وہ دونوں بہنیں تھیں۔

مجھے سوالیہ نظروں سے گھورتے دیکھ کر اسی شوخ لڑکی نے کہا۔ ”ہم لوگ سامنے والے فلیٹ میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ پاکستانی ہیں نا؟ اس لیے سوچا پڑوسیوں سے بھی مل لیا جائے۔“

”آئیے اندر آجئے۔“ میں نے انھیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں اندر آگئیں۔

”ذرا بھائی کو بلا دیجئے تاکہ تعارف ہو جائے۔“ شوخ لڑکی نے کہا۔

میں جواب میں ”سکرایا اور پھر ان دونوں بہنوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا بھیا ابھی تک کنوارا ہے۔“

”امی وغیرہ تو ہوں گی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں! اس دنیا میں اکیلا ہوں بالکل اکیلا۔“ میرے اس جملے پر دوسری لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا۔

اسے چونکتے دیکھ کر میں نے کہا۔ ”بچپن سے میں اکیلا ہوں۔“

نوعمری سے میرے دل میں بس ایک خواہش رہی ہے کہ کاش میری بھی کوئی بہن ہوتی، ننھی مٹی گڑیا ایسی! اب لگتا ہے میری یہ تنہا پوری ہو جائے گی۔ اللہ نے دو دو بنائیں بھیج دی ہیں۔“

”شکریہ بھائی جان! خاموش طبع لڑکی نے پہلی بات گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کی آواز میں عجیب قسم کا سوز تھا۔

لچر روٹا ہوا تھا۔ شاید اسے آج تک کسی نے بہن نہیں کہا تھا نہ سمجھا تھا۔ وہ اس مقدس رشتے سے محروم رہی ہوگی یا

پھر بھائی ہوتے ہوئے بھی اس کی محبت کو رستی ہوگی۔ جیسی اس کی آنکھوں میں چاہتوں کے سورج چمک اٹھے

تھے۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ ”تو کیوں نہ ہم اپنے غم بانٹ لیں! میرا بھی کوئی بھائی نہیں ہے۔“

”تو یقین کر میں تم دونوں کو سگے بھائی سے بھی زیادہ چاہت دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی رندہ گئی۔

میرے لچے کی یاسیت نے شاہدان کی امی کو بھی صوم کر دیا تھا وہ بول اٹھیں۔ ”بیٹا! میں بھی تمہیں سگے بیٹے کی

طرح چاہوں گی۔ تم چہرے سے کسی شریف اور مہذب خاندان کے لگتے ہو۔“

”امی!“ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میرے آنسو بہہ نکلے۔

”بیٹے! خدا کے ہر کام میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سیک ٹاؤن کا اتنا عمدہ مکان چھوڑ کر ہم لوگوں کے

یہاں آنے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ نبیلہ کے ابو بھی تم سے مل کر

بہت خوش ہوں گے۔“ پھر انھوں نے شوخ لڑکی کی طرف مڑ کر کہا۔ ”راحیلہ! جا کر اپنے ابو کو بلا لا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے نبیلہ سے کہا۔ ”میری گڑیا بہن! اب اس گھر پر تیرا بھی حق ہے۔ وہ سامنے

کچن ہے جہاں فائٹ دو تین کپ چائے بنا لانا کہ میں پہلی بار اپنی بہن کے ہاتھوں کی چائے پی سکوں۔“

وہ کچن میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی راحیلہ ایک ادھیڑ مگر بارعب شخص کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ انھوں

نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے راحیلہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ابھی میں تو بہت خوش ہوں کہ نبیلہ کی

دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ وہ تو ہر ایک کو بھائی بنانے پر تلی رہتی ہے اور اس چکر میں اپنے جیب خرچ کا سارا پیسا

جھونک دیتی ہے۔ لیکن آج پہلی بار سنا کہ کسی نے اسے بہن بنانے کی پیشکش کی۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہوئی

جار ہی ہوگی۔“

”آپ کا احسان ہے کہ آپ مجھے.....“

”احسان کیسا بیٹے!“ انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ میں کچھ اور بھی کہتا کہ نبیلہ چائے کی ٹرے اٹھاتے

ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے اس کے ابو نے کہا۔ ”نبیلہ! تمہاری خواہش تو

پوری ہوگئی۔ تمہیں ماشا اللہ ایک جوان بھائی مل گیا۔“ وہ مسکرا دی۔

چائے ختم کر کے انھوں نے مجھ سے گھر آنے کی دعوت دی پھر میں انھیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔

اس دن کے بعد سے میں ان لوگوں کے بہت قریب ہو گیا، بالکل گھر کے فرد کی طرح! ناشتان کے یہاں

کرتا اور رات کا کھانا بھی وہیں کھاتا۔ ہر مینے کی پہلی تاریخ کو خواہ کی رقم لا کرای کے ہاتھ میں دے دیتا اور وہ

اس رقم میں سے بیشتر کسی نہ کسی بھانے بھی پر خرچ کر دیتیں باقی میرے نام سے جمع کر دیتیں۔ میں چاہتے ہوئے

بھی ان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

خالص گھیر لیا ماحول ملا تو میری عادت میرے اطوار میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ پہلے میں رات کو دس بجے تک

سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا تھا، مگر اب چارپائے فکلیں بھی دیکھتا تھا لیکن نبیلہ کی باز پرس کے خوف سے میں نے زیادہ

دیر باہر رہنا چھوڑ دیا تھا۔ آفس سے سیدھا گھر آ جاتا اور دونوں بہنوں کے ساتھ کسی مذاق میں وقت گزار جاتا۔

نبیلہ تو مجھ سے اتنی ٹوٹ کر محبت کرنے لگی تھی کہ اگر میری سگی بہن ہوتی تو شاید وہ بھی نہ کرتی۔ اس بات میں ذرہ

برابر بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر میں اس کی جان مانگتا تو وہ آنکھیں بند کر کے مجھ پر جان قربان کر دیتی۔ اس معصوم لڑکی

کی دیوانگی نے مجھے بھی اپنا اسیر کر لیا تھا۔ اس کی بے پناہ چاہت نے میرے ترے ہوئے وجود کو قرار بخش دیا تھا۔

میں سمجھنے لگا تھا کہ منزل مقصود یہی ہے۔ میں نے تو بس تھوڑی سی چاہت، تھوڑا سا پیار مانگا تھا، بہن کی چاہت میں

اپنی برسوں کی پیاس بجھا، کوریائے محبت کے چند قطرے مانگے تھے اور مجھے بساط سے بڑھ کر پیار مل گیا تھا۔

میں تو خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا کہ پہلی شوکر لگی قطرہ اسرت زہر ہلال میں بدل گیا اور پھرے ہوئے

سیلاب کی مانند اپنی زد میں مجھے خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ نفرت کے اس تیز دھارے کا راستہ مجھ سے نہ

رک سکا۔ شاید اس میں بھی میری غلطی تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ ہر زاویہ دل کی آنکھوں سے نہیں ناپا جاتا، دماغ

کے پرکار سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

میں ان دنوں راحیلہ کو امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ کتابوں میں دلچسپی

نہیں لے رہی۔ اس کی آنکھیں کچھ کہتی ہوئی نظر آتیں۔ ایک ایسا پیغام تھا ان آنکھوں میں جسے سننے کی مجھ میں

تاب نہیں تھی۔ اس کا پیغام غیر صوتی تھا۔ آواز تو زبان کی دین ہے لیکن صرف زبان نہیں بولتی انسان کی آنکھیں

اور چہرے بھی بولتے ہیں۔ وہ بھی غیر صوتی اشاروں میں مفہوم ادا کر رہی تھی۔ اور میں سمجھ کر بھی انجان بنا ہوا خون

کے گھونٹ پی رہا تھا۔

ایک روز تو اس نے حد کر دی۔ میں اسے گرامر کے نکتے سمجھا رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ”داؤد بھائی! آپ نے

کبھی محبت کی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے سپاٹ لچھے میں کہا۔ ”لیکن یہ بات پوچھنے کا کون سا وقت ہے؟“

”کس سے؟“ اس نے میرے سر پر لچے کو نظر انداز کر کے کہا۔

”تم سے“ نبیلہ سے امی اور ابو سے!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”اونہہ!“ اس نے برا سامنے بنایا۔ ”فارگاڈ سیک!“ میں کسی اور محبت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ جیسی

قلموں یا بیانی دی ڈراموں میں محبوب اور.....“

”راحیلہ!“ میں نے ڈانٹا۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی؟ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔“

”منہ بولے بڑے بھائی!“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”اور سگے بھائی کے علاوہ کسی سے بھی.....“

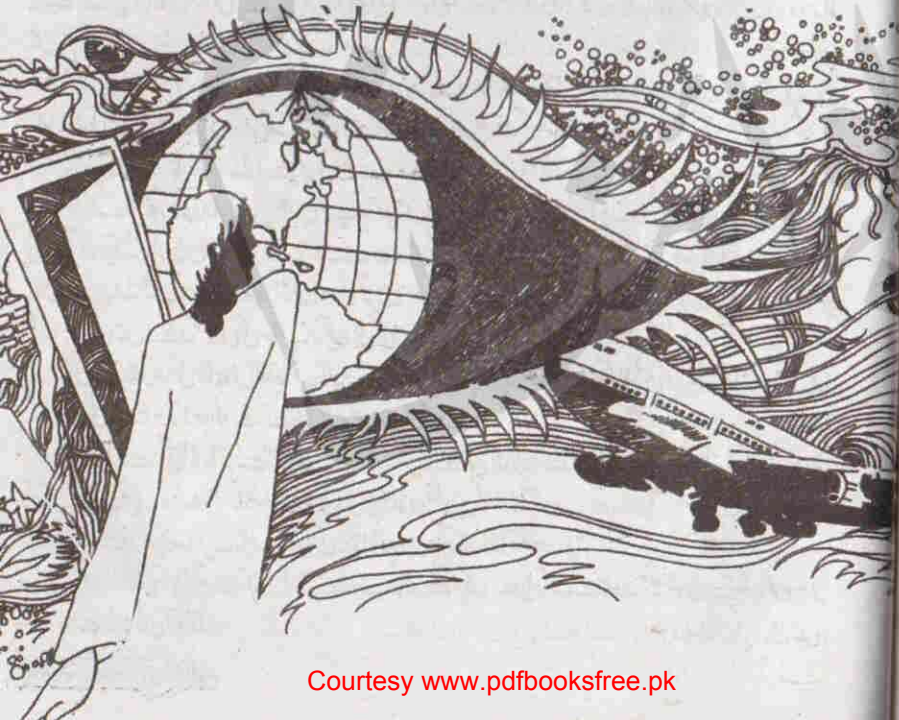
وہ کچھ اور کہتی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کہیں غصے میں صبر کا پیمانہ پھلک نہ جائے، اسی ڈر سے فوراً باہر نکل گیا۔

شازی سعید مغل

تاشون

حزین صدیقی کا خیال
عالم رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور متادوں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی بارہویں کڑی



میں سمجھ چکا تھا کہ مسلمان ہو کر بھی پاکستانی ہوتے ہوئے بھی یہاں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں اگر پاکستانی اپنے معاشرے کی حفاظت نہ کریں تو ان کے بچے بھی لگام سے باہر ہو جائیں۔ جس طرح یہاں باپ کی عمر والے کو چھوٹی عمر کی بچیاں بوئے فریڈ بنا کر باپ سے ملواتی ہیں اور باپ خوش ہوتا کہ یہ اس کا نچا معاملہ ہے۔ بارہ بارہ سال کی کنواری ماں گھر میں نظر آتی ہے۔ مگر کچھ پاکستانیوں کی کوشش سے جو معاشرہ سنبھل رہا ہے۔ پاکستانی خود کو گندگی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی تعریف انگریز بھی کرنے لگے ہیں۔ اب یہ کچھ اور بات ہے کہ شیطان پھر بھی گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بھی شیطانی فکر پر توجہ دیتی ہے۔ اسے سنبھالنا ضروری تھا اسی لیے میں نے ڈانٹ دیا تھا۔

دو چار دن تو وہ سبھی رہی لیکن پھر اس پر قلمی محبت کا بھوت سوار ہو گیا۔ وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں تھی۔ ایک دن پھر اس نے یکواں شروع کر دی اس نے لکھتے لکھتے قلم روک کر کہا۔ ”داؤد بھائی!“

”کیا ہے؟“
”جانتے ہیں میں آپ سے کتنا پیار کرتی ہوں؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سے چمک تھی۔
”جتنا بہن اپنے بھائی سے کرتی ہے جتنا پیار مجھ سے نیلہ کرتی ہے۔“
”داؤد بھائی!“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا واقعی آپ اتنے بدحوہ ہیں یا پھر میرے علاوہ کوئی اور آپ کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ میرے دل کی ہر دھڑکن تو بس آپ ہی کا نام لیتی ہے۔“
میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا ایسی روایات بات کہیں سن لیتا؟ میرا ادھنا تھوڑا سا لٹے سے گھوم گیا اور چٹاخ کی آواز دور تک پھیل گئی۔ ”بے شرم! میں تیری زبان بھیج لوں گا۔ ابھی جا کر امی کو بتاتا ہوں۔“ میں بری طرح بھٹ پڑا۔ میری ڈانٹ اور مار کو نظر انداز کر کے اس نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”داؤد صاحب! آپ نے ابھی عورت کا ایک رخ دیکھا ہے، وہ اگر پھول ہے تو ناگن بھی ہے، لیجئے دوسرا رخ بھی دیکھ لیجئے.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کرتے کا گریبان پھاڑ لیا اور زور زور سے چیخنے لگی ”بچاؤ! بچاؤ!“
اس کی آواز کافی بلند تھی میرے قلیٹ سے اس کے قلیٹ تک پہنچ گئی۔ اس کی چیخ سن کر اس کے امی ابو دوڑتے ہوئے آئے۔

انھیں دیکھتے ہی وہ اپنی امی سے لپٹ گئی اور کہنے لگی ”یہ..... انسان کے روپ میں بیٹھریا ہے امی! ابھی یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا!“

راجیلہ کے روپ میں میرے سامنے کو یا ایک پتھرناری ہوئی ناگن تھی جو اپنا پھن بھلائے کھڑی تھی بلکہ اس نے اپنے زہر لیے الزامات سے مجھے ڈس لیا تھا۔ میں گنگ ہو گیا تھا۔ غم و غصے نے میری زبان پر قفل لگا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف دھماکے ہو رہے ہوں اور کانوں میں صرف اُچی دھماکوں کی گونج تھی۔ ساعت جھکن دھماکے جو میرے دماغ کی شریانوں کو بری طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔

انھی دھماکوں کے درمیان راجیلہ کے لبوں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے امی سے کہا تھا۔ ”راجیلہ کو لے جاؤ۔“ امی اسے فوراً لے کر چلی گئیں۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی نکل گئے۔ شاید عزت کے خوف سے انھوں نے معاملے کو طول نہیں دیا تھا۔ پاکستانی کیونٹی میں بات چیل جاتی اسی لیے وہ خاموشی سے چلے گئے تھے۔ وہ لوگ تو چلے گئے لیکن میں نظر نہ آنے والی آگ میں جھلنے لگا۔ اندر ہی اندر بھڑکتی ہوئی آگ نے مجھ کو اکھ کر دیا۔

آگے کا احوال جاننے کے لیے آئندہ ماہ شمارہ فروری میں دوسری قسط ملاحظہ فرمائیے

ایک چیخ اور بلند ہوئی تھی پھر تو جیسے اس کی دیوانہ وار چیخوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ تھا۔ ناشون کے ساتھ موجود عمر سومر، مونگا اور زلفی بری طرح چونک اٹھے تھے۔

”ارے، کیا کو کیا ہوا ہے؟“ زلفی نے تشویش کے ساتھ کہا تھا۔

”چلو، نیچے چل کر دیکھتے ہیں۔“ مونگا کے یہ کہنے کے ساتھ ہی عمر سومر اور زلفی نیچے جانے کے لیے اٹھے تھے۔

”سب ایک ساتھ نہیں جائیں گے۔“ ناشون نے انہیں روکے ہوئے کہا تھا۔ ”میں اور زلفی جاتے ہیں تم اور عمر یہیں

رانی بھابی کے پاس رہو۔“ یہ کہتے ہوئے ناشون تیزی سے سڑھیاں اترتا چلا گیا تھا جبکہ زلفی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

نیچے وی لاؤنچ میں عجب ہی تماشا ان کا منظر تھا۔ کیا جوان کے لیے مزید چائے اور کافی بنا کر اور پرلا رہی تھی اس وقت زمین پر بیٹھی اپنے پیروں پر بٹائی ہڈیاں انداز میں چیخ رہی تھی۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور اس میں موجود گارک ٹوٹ کر کچی کرکچی ہو کے اس کے ارد گرد دکھڑے پڑے تھے لیکن وہ جواتے ہڈیاں انداز میں چیخ رہی تھی اس کی وجہ؟ اس کی آنکھیں وی لاؤنچ کی کھڑکیوں سے باہر بارغ میں موجود درختوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ناشون نے کیا کا یہ حال دیکھ کر لمحے کے ہزارویں حصے میں اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ بات وہ نہیں جو نظر آ رہی ہے بلکہ بات تو کچھ اور ہی ہے اور وہ نظر کا شبہ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

”کیا، کیا، ہوش میں آؤ۔“ زلفی کے پکارنے پر بھی کیا کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے تو اس نے کیا کو کانٹوں سے پکڑ کر ہلا ڈالا تھا۔

ناشون نے فوراً ہی کچھ پڑھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ کیا کے سر پر رکھا تھا تو یکنٹ ہی جیسے کیا کی چیخوں کو بریک لگ گیا تھا اور پھر اس نے پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناشون کی طرف دیکھا اور پھر وہ خوف زدہ انداز میں باہر کی طرف اشارہ کرنے لگی تھی۔

”ہاں، کیا ہوا؟ کون تھا باہر؟“ زلفی نے اسے بولنے کا حوصلہ دیا تھا۔ اس دوران ناشون نے تیزی سے کھانے کی میز پر رکھے پانی کے جگ سے گلاس بھر اور پھر کچھ پھونک کر کیا کو دیا۔

”ٹوپی جاؤ۔“ ناشون نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

کیا نے ناشون کی ہدایات پر گلاس اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرے ہی لمحے ایک سانس میں سارا پانی پی گئی۔

پانی پی کر کیا کے اوسان خاصے بحال ہوئے۔ وہ زمین سے کھڑی ہوئے گی۔ زلفی نے کیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ کیا انگڑائی ہوئی تو قریبی صوفے پر بیٹھ گئی لیکن وہ اب بھی خوفزدہ سے انداز میں مڑمڑ کر باہر لان میں لگے درختوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔

زلفی نے پھر کیا کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”بتاؤ، کون تھا وہاں پر؟ کوئی چور ڈاکو؟ کسی کو دیوار پھاندتے دیکھا کیا؟“ زلفی کے بتاؤ تو سوالات سے کیا جیسے گھبراہٹ ہوئی تھی۔

”آرام سے زلفی، آرام سے، نہ کوئی چور تھا اور نہ ہی ڈاکو، تم پریشان مت ہو، کیا نے جو دیکھا وہ کچھ اور ہی تھا بلکہ تھی کیوں ٹھیک ہے؟“ ناشون نے کیا کی پیشانی پر نظریں گڑا دی تھیں۔

”جی جی، بالکل صاحب جی۔“ کیا کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھا تھا۔

”گھبراؤ نہیں کیا، تم نے کیا دیکھا ہے؟ سب کچھ مجھے ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ۔“ ناشون نے کیا کو حوصلہ دلاتے نرم لہجے میں کہا تھا۔

کیا نے نظریں اٹھائیں۔ ”وہ میں نے..... میں نے.....“ کیا نے انگلی سے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ ”وہاں درختوں کے پیچھے کوئی کالے کپڑوں میں کھڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ نہیں چوراچکا تو نہیں آ گیا؟ کہیں گیٹ تو کھلا نہیں رہ گیا؟ ابھی میں باہر جا کر دیکھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کالے کپڑوں میں لمبوس چیز باہر آ گئی۔ اف میرے خدا.....! وہ کتنا خوفناک چہرہ تھا۔“ کیا نے جھرجھری لی۔ ”کالی رنگت، بال اس کے لمبے سیاہ اور مہرے ہوئے تھے بالکل سفید آنکھیں۔“ اس چہرے پر صرف اور صرف وہ آنکھیں تھیں باقی چہرہ کچھ نہیں تھا۔ وہ میری نظروں کے سامنے بالکل اسپرنگ کی طرح اچھلی تھی اور وہاں اونچی والی شان پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ وہ مجھے گھور رہی تھی اور پھر اچانک اس کے چہرے پر ناک اور منہ بھی گیا تھا۔“ یہ بتانے کے بعد کیا کا سانس تیزی سے پھولنے اور آنکھیں پھیلنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ پیروں میں لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ ناشون نے فوراً ہی زیر لب کچھ پڑھتے پڑھتے اپنا دہانہ ہاتھ کیا کے سر پر رکھ دیا تھا۔ دھیرے دھیرے کیا نارمل ہونے لگی تھی۔

”ہاں پھر کیا ہوا؟“ ناشون نے سوال کیا تھا۔

”پھر صاحب، اس خوفناک عورت کے منہ سے ایک لمبی سی سرخ زبان جھپٹی چیز نکلی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے خون ٹپک رہا ہو۔ یہ زبان دیکھتے ہی دیکھتے لمبی پتلی سی جھپٹی ہوتی گئی تھی یہاں تک کہ زمین سے لگ گئی تھی۔ اس کی انگارہ آگ برساتی آنکھیں اور وہ لال خون ڈکانی زبان مجھے اپنی جانب بوھتی محسوس ہو رہی تھیں۔“ کیا پر ایک بار پھر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

”اف، یہ سب کیا ہے؟ میرے گھر کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟“ زلفی بس رونے کے قریب ہی تھا۔

اب ناشون نے اپنی توجہ زلفی کی جانب کر لی تھی۔ ”دھیرے دھیرے رکھو زلفی، اتنا سب کچھ ہونے کے بعد تمہیں اندازہ تو ہو ہی چکا ہے کہ تمہارا کن طاقتوں اور کن خباثتوں سے واسطہ پڑ چکا ہے یا پڑ سکتا ہے۔ اب یوں حیران اور پریشان ہونا چھوڑو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی صرف اور صرف یہی کہوں گا کہ یہ طاغوتی طاقتیں اپنا کتنا ہی مظاہرہ کیوں نہ کر لیں، ہمارا بازو کچھ نہیں سکتیں کیونکہ ہمارے ساتھ اس کائنات کا ان طاقتوں کو ہانے والا مالک ہے۔“

”وہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ ابھی میری رانی کو ہوش نہیں آیا اور ایک نئی شیطانی قوت درختوں پر نظر آ گئی، وہ بھی ابھی اس گھر میں آ سکتی ہے بلکہ آ گئی ہے۔“ زلفی کی اس تمام گفتگو کے دوران ناشون بس اسے تاسف سے دیکھے جا رہا تھا کہ اچانک زلفی کو خود ہی اپنے بولے ہوئے لفظوں کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کی زبان کو جیسے ایک دم بریک لگ گیا اور وہ حواس باختہ سا ناشون کو دیکھنے لگا اور پھر یکایک اپنی جگہ سے اٹھا اور لپک کر ناشون کے پاس آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

”سوری یار، پلیز، ریلی ویری سوری، معاف کر دو، بہت ڈس ہارٹ ہو جاتا ہوں میں کبھی کبھی انجانے میں پتہ نہیں کیا کچھ کہہ دیتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ناشون نے زلفی کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ”لیکن ایک بات، تم کیا اکثر لوگ بر ملا کہہ دیتے ہیں کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے تو ہمارے ساتھ ایسا ویسا ہو رہا ہے لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تو ان کے ساتھ ہمیشہ سے ہے لیکن کیا وہ اللہ کے ساتھ ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے زلفی، اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے والوں کے لیے۔ پہلے وہ اس سوال کا جواب لائیں پھر اللہ تعالیٰ سے شکوہ کریں۔ تسلی ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ ناشون نے بہت رسامیت سے کہا تھا۔

سچی کہانیاں 239

”سوسری تاشون۔“ زلفی نے باقاعدہ تاشون کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔
تاشون نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ ”نہیں دوست، معافی مانگی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو وہی
سب کو معاف کرنے کا حق دار ہے۔“
”بے شک۔“ زلفی نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا چلو اب ان باتوں کو چھوڑ دو اور جو کچھ کمپانی دیکھا، اس کی فکر مت کرو رانی بھائی پر کیا گیا اتنا کاری
وار ضائع ہو جانے پر سیل شیپاگل ہوا بھی ہے یہ بہت شدید اور مکمل وار تھا اور وہ خالی گیا۔ کامیابی کے نشے اور
یقین کے باوجود ہونے والی ناکامی انسان کو پاگل بنا ڈالتی ہے اور سیل شیپا اب اسی دور سے گزر رہی ہے اس کی
طاقتیں اس وقت کمزور پڑ چکی ہیں لیکن اس کے چیلے تو اپنی مادام کے لیے سرگرم ہیں یہ انہی کی سرگرمی کا ایک
مظاہرہ تھا اور بس، صرف ہمیں پریشان کرنے کے لیے ورنہ تو اس وقت سیل شیپا کے ہاں صاف ماتم بچھی ہوئی ہے
زلفی، اس کے خوشی بچے سے اس کا قیمتی شکار جو کھل گیا ہے۔“ تاشون نے دوران درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا تھا جن پر کچھ دیر پہلے ہی کمپانی نے ایک عفریت کو اپنا غضب ڈھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ ساحل سمندر پر واقع ہے۔ سیل شیپا کے بھوت بنگلے پر جنم لینے والی اس حیرت اور اسرار سے بھری کہانی کی
روداد ہے جو ایک رات پہلے پیش آئی تھی۔ کسی کے آنے کی سواگت کی تیاریاں چل رہی تھیں، سیل شیپا کے اس
بھوت بنگلے کو سجایا جا رہا تھا، پر اسرار خوشبوئیں مکین اور مکان کا احاطہ کر رہی تھیں۔ کالی مومی شمعوں سے بنگلے کا ہر
کونہ سجا ہوا تھا۔ سیل شیپا اپنے خاص کمرے میں پانچ کونوں والے طلسمی ستارے کے درمیان بیٹھی تیزی سے منتر
پڑھنے میں مصروف تھی کہ ہوا کا ایک زوردار جھونکا اس کی کالی شمعوں کو بجھا ڈالتا ہے پھر تو جیسے سیل شیپا کے اس
بھوت بنگلے میں بھونچال سا آجاتا ہے، سیل شیپا کے گھر کے کونے کونے سے سفید سرمئی، کالے مرغولے جوق
در جوق برآمد ہوتے ہیں، پر چھائیوں میں ڈھلتے ہیں، بڑے بھدے، بے ہنگم اجسام نہایت بھیاں تک خدو خال اور
منمنائی آوازوں کے ساتھ سیل شیپا کی دعوت عام کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ راحت چچا جوان
ان دیکھے پر اسرار مہمانوں کی ضیافت کے منتظم اعلیٰ تھے، پریشان ہوا تھے ہیں، باہر مطلع صاف ہوتا ہے لیکن سیل شیپا
کے گھر میں گھٹاؤپ اندھیرے نے اپنا آسن جمار کھا ہے۔ اس سے پہلے کہ راحت چچا کچھ سمجھ پاتے، سیل شیپا کا
دروازہ دھڑ سے کھلتا ہے، تھوڑی دیر پہلے کی سوسری سیل شیپا اس وقت کسی ہراساں ہرئی کی طرح بدکی ہوئی نظر
آ رہی ہے، اس کا سرخ و سپید رنگ زردی مائل ہو رہا ہے، وحشت اور لاچار ی پورے وجود پر طاری ہے۔ راحت
چچا، سیل شیپا کو دیکھتے ہی لپکے ہیں۔ ”مادام.....“

سیل شیپا نے تورا کر دیوار کا سہارا لیا۔ سیل شیپا کی یہ درگت دیکھ کر راحت چچا کے چھکے ہی چھوٹ گئے ہیں۔
”راحت، کھڑے کیا ہو؟ گاڑی..... گاڑی نکالو، جلدی کرو۔“ سیل شیپا نے اپنی قوتوں کو جمع کرتے ہوئے
کہا۔ ”دشمن، دشمن۔“ سیل شیپا کے منہ سے بے ربط الفاظ ادا ہوئے۔

راحت چچا نے اس وقت اپنی بساط سے بڑھ کر تیزی دکھائی۔ سیل شیپا دوسرے ہی لمحے گاڑی میں ہے۔ سیل
شیپا کا دیوہیکل ڈرائیور کسی بھوت کی طرح اندھیرے سے برآمد ہوا ہے، گاڑی ہواؤں سے باتیں کرنے لگی ہے
اور پھر بمشکل دس منٹ کے بعد سیل شیپا کی گاڑی سرسرا تے درختوں کے درمیان نیلی رنگت والے بدہیت سوغی

بیلوں کے جھرمٹ میں سجے بنگلے میں موجود ہے۔ راحت چچا نے گاڑی کے رکتے ہی سیل شیپا کو سہارا دے کر
گاڑی سے اتارا ہے، یہ وہی بنگلہ ہے جہاں سیل شیپا اپنے پر اسرار آسٹری سیلیوں کے ساتھ اکثر محفل جماتی
ہے۔ شیطانی قربان گاہ، سیل شیپا کا قبلہ اول و آخر لیکن آج سیل شیپا محفل سجانے نہیں بلکہ اپنی زندگی بچانے کرتی
پڑتی برے حال یہاں تک پہنچی ہے۔ بری طرح ہاتھی سیل شیپا کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ شیطانی فرستادہ
ہے۔ وہ راحت چچا کے سہارے مغربی ہال تک مغربی دیوار پر بنے پانچ پہلوؤں ستارے پر اپنے پورے ہاتھ کا
دباؤ ڈال رہی ہے۔ سیل شیپا کے چاروں طرف سفید سرمئی کثیف دھوئیں کے چکر کھاتے مرغولے گھوم رہے ہیں
جیسے سیل شیپا سے زیادہ انہیں شیطانی عبادت گاہ میں پناہ لینے کی جلدی ہو۔ دیوار کے ایک حصے کے ہٹ جانے
سے زمین دوز تہ خانہ سامنے آ گیا ہے۔ سیل شیپا اپنی قوتوں کو ایک بار پھر جمع کر کے تیزی سے سڑھیاں اترنے
لگی ہے۔ راحت چچا اور ان کے پیچھے کثیف دھوئیں کی چادر بھی اس تہہ خانے میں داخل ہو گئی ہے اور پھر
دوسرے ہی لمحے وہ سرخ آفتیں پھر سے بنی قربان گاہ کے فرش پر تقریباً ڈھیر ہو چکی ہے۔ اب وہ اپنے آقا
ابلیس کے قدموں میں آ چکی ہے، پر یہاں ایک دیوہیکل مجسمہ ہے جس کے چہرے کے خدو خال ایک پہاڑی
بکرے کے ہیں، اس کی آنکھیں اس وقت زندہ معلوم دے رہی تھیں، شرر برسا رہی تھیں اس عبادت میں
لگے لمپ کی دھندلی سی روشنی میں سرخ آفتیں پھر اب خیانت سے چمکتے نظر آ رہے ہیں۔ عبادت گاہ کے
چاروں طرف تہہ خانے کی دیواروں میں سیل شیپا کے پیچھے آنے والے دھوئیں کے مرغولے غائب ہو چکے ہیں۔
اب دیکھنے والی آنکھ نگارہ کرتی ہے تو تہہ خانے کی دیواروں، چھت اور فرش تک صرف بھیاں تک آنکھیں نظر
آ رہی ہیں، صرف آنکھیں۔ سیل شیپا کے تمام شیطانی جیلوں کی آج یہاں آقا کے سامنے ملتی ہے۔

اس کالے بھنگ شیطانی بکرے کی شکل والے مجسمے کی آفتیں آنکھیں سیل شیپا کو گھور رہی ہیں پھر ایک
نہایت ہی کرخت آواز اس تہہ خانے میں گونگی ہے۔ ”سیل شیپا، کھڑی ہو جاؤ۔“

آواز سننے ہی تہہ خانے کی دیواروں اور فرش پر بنی آنکھیں یلکھت غائب ہو گئیں۔ راحت چچا جو تہہ خانے
کے دروازے کے باہر غیر ارادی سخت ترین سردی سے تھر تھرا رہے تھے، بے ہوش ہو کر گر پڑے ہیں اور سیل شیپا
کا چہرہ سفید پڑ گیا ہے۔ دہشت و تشویش کی لہریں اس کے جسم میں دوڑ رہی ہیں۔ وہ تہہ خانے میں موجود سخت ترین
سردی کے باوجود تھر تھرا رہتا پنا کاںپ رہی ہے۔ اس نے یکبارگی نظریں اٹھائی ہیں لیکن اس کے آقا کی شیطانی
آنکھوں سے نکلنے والی آسٹری شعاعیں اتنی طاقت ور ہیں کہ سیل شیپا کو محسوس ہوا ہے جیسے اس کی آنکھیں دھندلی
پڑ گئی ہوں۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے کر لی ہیں اور پھر وحشت و دیوانگی ناکامی و حسرت و یاس کی شکار سیل شیپا ایک
غیر فطری مخلوق بن گئی ہے، بے ربط سازوں کی ایک بلند چیخ کے ساتھ رقص ابلیس شروع ہو گیا ہے۔ سیل شیپا شیطان
کو خوش کرنے اور ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے شیطانی تخت کے سامنے دیوانہ وار رقص کرنے لگی ہے۔ وہ
ایک انتہائی خوفناک اور بدست رقص ہے اور پھر رفتہ رفتہ سیل شیپا نے شیطانی عبادت گاہ میں رکھی دنیا کی ہر قسم کی
شراب اپنے اندر اٹھانا شروع کر دی ہے، بے ربط سازوں کا بے ہنگم شور بڑھ گیا ہے، تیز کثیف دھوئیں دار
خوشبوؤں نے سیل شیپا کو چاروں طرف سے جیسے جکڑ لیا ہے۔ کچھ دیر پہلے کی بے دم اور چال بلب سیل شیپا میں اس
وقت کوئی شیطانی قوت کارفرما ہے۔ وہ انتہائی غیر فطری غیر مہذبانہ انداز میں رقص کر رہی ہے اور پھر ایک آسٹری
موسیقی بند ہو گئی ہے۔ اب مکمل سکوت کا عالم طاری ہے۔ سیل شیپا شیطانی تخت کے سامنے ڈھیر ہو چکی ہے۔ رقص

مکمل ہو چکا ہے۔ اب وہ دوپہر تک مجھ سے کادھرتا انسان کا تھا لیکن سر کی پہاڑی بکرے سے مشابہت سیل شیا کا آقا تخت کے چاروں طرف چکر لگا رہا ہے۔ اس خوف ناک سیکنوں والے آقا نے سیل شیا پر یکبارگی دوبارہ آنکھیں جمادی ہیں اور اس کے ساتھ ہی سیل شیا میکا کی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حواس اب بحال ہوئے ہیں۔ اپنے آقا کو یوں اپنے سامنے درشن دیتے دیکھ کر سیل شیا پر شادی سرگ طاری ہوئے لگی ہے۔ اسے اپنا وہ دکھ اپنی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی جس کا منہ دیکھ کر یہاں پہنچی تھی اب بہت چھوٹی محسوس ہو رہی ہے۔ اس کی ناکاکی والا یہی وقت تھا جب رانیہ کی روح اس کے جسم میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بخیر و خوبی واپس آئی تھی۔

رانیہ کے نیند سے اٹھنے کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا، ناشون، عمر سومر، زلفی اور مونگا چاروں مکیا کے ساتھ ہونے والے ہینک واقعے کے بارے میں اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ مکیا شاید خوف و ہراس کا شکار تھی۔ اس گھر میں رانیہ کے ساتھ ہونے والے واقعات اس کی ہمت و حوصلے کو زلزلہ سے تھکے لیکن جب سے اس نے اپنی آنکھوں سے درختوں پر وہ غریبی تماشہ دیکھا تھا تب سے اس کی ہمت بھی کچھ ٹوٹ چھوٹی ہو گئی تھی۔ زلفی نے تو مکیا سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے اپنے گھر جاسکتی ہے اسے رکنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا لیکن وہ بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی اب بھی یہاں سے جانے کو تیار ہی نہ تھی۔ اس وقت بھی وہ وی لاؤن میں کافی نارل سے انداز میں بیٹھی اپنے معمول کے کام سرانجام تو دے رہی تھی لیکن وقفے وقفے سے ان درختوں پر نظر ڈالنا نہیں بھولتی تھی۔

عمر سومر نے مکیا کی ان حرکات و سکنات کو نوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ایسا لگتا ہے اسے درختوں میں اب بھی کچھ نظر آ رہا ہے۔“

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ ناشون نے فوراً ہی کہا تھا۔ ”وہاں اب کوئی نہیں ہے یہ ایک فطری عمل ہے جو مکیا سے سرزد ہو رہا ہے ویسے وہ کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہے اس نے بہت ہمت کی ہے اس لیے یہاں ہم لوگوں کے درمیان ہے۔“

”ویسے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم سحر والے موضوع پر گفتگو میں مصروف تھے، عین اسی وقت مکیا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔“ عمر سومر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن یہی عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے اس چیل آ سیب جو بھی کچھ تھا اس کا آنا بہت برا لگا۔ ہم اچھا خاصا سحر انگیز مقامات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔“

”تو کیا ہوا؟ بات وہیں سے دوبارہ شروع بھی کی جاسکتی ہے ویسے بھی آج کا دن واقعی سحر انگیزی لیے ہوئے ہے۔“ ناشون نے زلفی کی بات سن کر دو درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم نے کہا تھا مشتری زہرہ زحل، شمس، قمر وغیرہ قمران کرتے ہیں، بعد نظر بناتے ہیں تو ہم خود کو سحر انگیز مقام پر پاتے ہیں لیکن کون سی جگہ سحر انگیز ہے اور کون سی نہیں یہ کیسے پتہ چلتا ہے؟“ عمر نے وہی سوال دہرایا تھا۔

”آپ کو اس کا احساس اس جگہ پر پہنچ کر ہو سکتا ہے اور یہ خاص قسم کا احساس آگے پر ہوتا ہے جو اسے وہاں اس جگہ موجودگی پر محسوس ہوتا ہے اس مقام پر انسان گفتگو نہیں کرنا چاہتا وہ خاموش رہنا چاہتا ہے وہ محسوس کرتا ہے جیسا کہ وہ ساری دنیا سے الگ تھلک ہے وہ جب تک اس جگہ یا مقام پر رہتا ہے ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا

کے ایک ایسے مختصر سے گوشے میں ہے جہاں سے ایک اعلیٰ وارفع دنیا کی طرف دروازہ کھلتا ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ آپ جب خود کو کسی سحر انگیز مقام پر محسوس کریں یعنی کوئی جگہ اٹریکٹ کرے تو وہاں کچھ نشانیوں ضرور ہوتی ہیں جیسا کہ کسی جنگل کا گوشہ کسی کو اچانک اٹریکٹ کرے یا اپنے ہی گھر میں باغ کا کوئی حصہ یا کالج اور اسکولز میں لگے درخت یا وہ جہاں جابجا جنگلی پھول دار جھاڑیاں اور پودے اک آتے ہیں جہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی ہے۔ اگر کہیں کوئی ایسا حصہ دریافت ہو جاتا ہے تو وہاں پر آپ کو کچھ خاص قسم کے پرانے پتھر مل جائیں گے۔ اگر آپ کو ایک بڑا اور بالکل کول یا چوکور یا نیچے سے کول اور اوپر سے نوکدار پتھر مل جائے تو سمجھ جائے کہ آپ نے سحر انگیز مقام تلاش کر لیا ہے۔“

”ایسے پتھر عموماً بہت کم نظر آتے ہیں۔“ زلفی نے ناشون کی بات کا ٹیٹھی۔

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، قدیم مصری تہذیب میں یہ کول پتھر ایسی قوتوں کی قربانیاں گاہ تصور کیے جاتے تھے جو بنی نوع انسان کو مادی تحائف مثلاً خوراک، روپیہ پیسہ اور دوسری دنیوی اشیاء دینے کی قوت رکھتی تھیں، چوکور پتھر ایسی زمینی قوتوں کے نزدیک خاص طور پر مقدس ہوتے ہیں جو اچھی فصلیں پیدا کر لیتی ہیں چنانچہ ایسی قوتوں کو بطور ہدیہ گیہوں یا کوئی ایسا پودا پیش کیا جاسکتا تھا جو گھر کے قریب آگاہ ہوا ہو۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی کسان ایسا کرے گا تو اس کی فصلیں اچھی ہوں گی جبکہ نیچے سے کول اور اوپر سے نوک دار پتھر کو سنگ حب سمجھا جاتا تھا جو اپنے اور محبوب کے درمیان محبت بڑھانا چاہتے تھے۔ وہ نیلے پھولوں کا ہار بنا کر اس پر پڑھاتے تھے۔ مصری تہذیب پر اسراریت سے بھری پڑی ہے اور آج تک یہ پر اسراریت چلتی چلی آرہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا میں دوسری تہذیبوں میں بہت سے اسرار و قوت اور لوگوں کے ساتھ صدیوں کی دھول میں دفن ہو گئے ہیں لیکن مصری تہذیب واحد تہذیب ہے جس کی پر اسراریت سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی چلی گئی۔ آج بھی مصر میں قدیم پر اسرار مصری تہذیب کی نمود کی جھلک نظر آتی ہے آج بھی لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔“

”ناشون اس حوالے سے صنوبر کے درختوں کے بارے میں تمہارا کیا کہنا ہے؟“ عمر نے پوچھا۔

”صنوبر کے درخت؟ مجھ لگتا ہے تم صنوبر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ ناشون نے کتنی تیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”ہاں، میرا ایک کلاس فیلو تھا انگریز میں، بنگلہ دیش سے تعلق تھا اس کا وہ کہتا تھا کہ جو صنوبر کے درخت کے نیچے ساری رات سوئے اسے اپنا مستقبل خواب میں نظر آ جاتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ عمر نے سوال کیا تھا۔

”یہاں ایک بات بہت اہم ہے، وہ یہ کہ صنوبر کے درخت عموماً سحر انگیز مقامات پر ملیں گے اور سچے خواب انسان کی روحانی صلاحیتوں کی ترجمانی کرتے ہیں جس کا نفس جتنا پاک صاف ہوگا اس کی پرواز اتنی ہی بلند ہوگی، نفس کی پاکی کیا ہے؟ اور اس کی بیماریاں اس کا علاج اس ٹاپک پر گفتگو کریں گے تو اصل ٹاپک یہ ہو جائے گا، بس اتنا جاننا لو کہ جو جتنا اس دنیا کے بھیلوں سے دور ہوگا، خود کو مسافر سمجھ کر دنیا میں رہے گا وہ بہت ہی خرابیوں سے بچ جائے گا، پر سکون رہے گا اس کا دل مطمئن ہوگا یعنی نفس مطمئن ہوگا تو اس صورت میں سچے خواب یعنی الہامی خواب نظر آ سکتے ہیں ویسے انسانوں کی ظاہری حالت دیکھ کر آپ ٹھیک طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح چل رہے ہیں۔ وہ اللہ کی رضا پر راضی ہیں یعنی انہیں نفس مطمئن حاصل ہے۔ اگر یہ ہے تو سب کچھ حاصل ہے، چنانچہ تمہارے دوست نے جو صنوبر کے نیچے سچے خواب کا ذکر کیا، اس کی سحر انگیزی کی بنا پر کیا کیونکہ پر سکون اور شانت مقامات پر صنوبر کے درخت ملتے ہیں جہاں آپ صرف اپنے

آپ سے ملاقات کریں میں نے تمہیں بتایا کہ ایسا لگتا ہے ان سحر انگیز مقامات پر کہ جیسا کہ دوسری دنیا کا دارالہ کھلا محسوس ہو رہا ہو چنانچہ یہ اس کی وجہ سے ہے۔ آپ ان مقامات پر اگر مراقبہ کریں تو بھی آپ کو رفتہ رفتہ بے خواب نظر آسکتے ہیں کیونکہ نفس اور روح کی پاکیزگی کے لیے ایسے مقامات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

”لگتا ہے پودوں، درختوں، قدیم داستانوں اور علم نجوم میں بہت گہرا تعلق موجود ہے؟“ زلفی نے پوچھا تھا۔

”زلفی! تم ٹھیک کہتے ہو ذرا اصل یہ جو کائنات ہے اس کی تمام چیزیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ہر چیز میں اس کا علم اور نشانیاں رکھی گئی ہیں لیکن عقل والوں کے لیے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا اور کائنات کی ہر شے اس کی تسخیر میں دے دی لیکن انفس انسان اپنے اس مقام سے ہٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ جانوروں سے بھی بدرجہا سلوک کر جاتا ہے جو اپنے اصل مقام سے ہٹ جاتا ہے محض سے ہٹ جاتا ہے وہ جو شہر مشرقی نے کہہ دیا ہے کہ کوئی قابل ہو تو ہم شان بھی کئی دیتے ہیں

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی دیتے ہیں

ناشون نے علامہ اقبال کا یہ شعر بڑے جذب کے ساتھ پڑھا تھا۔ ”یہ معاملہ ہے۔ تسخیر کائنات ڈھونڈنے والوں کے لیے اور نبی دنیا ان کا ساواگت کرتی ہے اس لیے اس مادی دنیا کے ہر شخص کو اس قسم کی باتیں تھوڑی کیا بہت عجیب و غریب لگیں گی لیکن میرے دوست! یہی تو وہ غی فی دنیا میں ہیں جو کہ ابن آدم کے لیے سحر کی گئی ہیں۔ کائنات کی ہر شے کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط باہم ہے جیسا کہ ابھی میں تمہیں یہ بتاؤں کہ کس طرح ایک عام سے کوکھر کے پودے کا ایک گچھا تو ذکر اپنے سونے والے کمرے میں رکھو تو یہ اعصابی تھکان سے چور چور بدن میں شفا یابی کے عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے اور ایک نئی قوت و طاقت دیتا ہے اور اگر کسی برتن میں پانی لے کر اس میں ایک رنگ آلود کھل بھی ڈال دیں اور پھر اس کوکھر کے پودے کا ایک گچھا لے کر اس میں ڈالیں تو حیرت انگیز طور پر شفا یابی کی رفتار تیز ہو جائے گی کیونکہ کوکھر وادوں پر سرخ کی حکمرانی ہے جو قوت و طاقت کا ستارہ ہے۔ اب دیکھو علم نجوم کا پھولوں سے تعلق کیسے بنتا ہے کہ مونا ر میں بکائن کے پھول گھر میں رکھنا چاہئیں کیونکہ بکائن کے درخت اور پھولوں پر مشتری کی حکمرانی ہے جو کہ خوش بختی لانے والا ستارہ ہے جبکہ ستارہ کلاب پر زہرہ کی حکومت ہے۔ ان پودوں کو جو دالے دن گھر میں لانا چاہیے کیونکہ یہ محبت کے معاملات کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ گھر میں ٹہلی پھول ضرور استعمال کریں مگر اصلی پھول پودے بھی ضرور لگائیں کیونکہ جب قمر اور زہرہ کی شعاعیں یکجا ہوتی ہیں تو محبت خوش بختی اور خوش بختی ملتی ہے۔“

”لیکن کچھ پودے جیسے ناگ پھنی ایسے ہوتے ہیں جن میں عجیب سی کڑوی مہک یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو بدبو پائی جاتی ہے ان کے بارے میں علم نجوم نے کیا کہا ہے؟“ اس موضوع میں عمر کچھ زیادہ دلچسپی لے رہا تھا کیونکہ وہ غائبی کا شوق رکھتا تھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ناگ پھنی کا پودا گھر میں نہیں لگانا چاہیے؟“

”ہاں! کانٹے دار یا بدبو دار پودوں کو گھر میں نہ ہی لگائیں تو بہتر ہے۔ اگر چہ اس میں ان پودوں کا کوئی قصور نہیں لیکن جو چیز بھی بدبو دار ہو یا کڑوی سی مہک رکھتی ہے وہ عموماً کسی نہ کسی معاملے کے لیے خراب ہوتی ہے اس لیے ایسے پودوں کو گھر میں لاکر کوئی خرابی مول نہ لیں۔ صرف خوشبو دار پودوں کو ہی گھر میں لگائیں۔“

”مجھے لگ رہا ہے کہ ہم اصل موضوع سے کچھ ہٹ گئے ہیں۔“ زلفی نے ناشون کی بات ختم ہوتی ہی کہا تھا۔

”زلفی!..... سحر انگیز مقامات کے ساتھ یہ پھول اور پودے باہم ربط رکھتے ہیں ان کے بغیر سحر انگیزی مکمل

نہیں کیا تمہیں یہ بات پہلے معلوم تھی کہ صنوبر کے درخت اور سحر انگیزی میں کیا تعلق ہے پھول اور پودوں میں کیا اسرار چھپا ہے؟“ ناشون نے اس سوال کی صورت گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔

”اچھا چلو! ہم بقول زلفی! اپنے موضوع سحر انگیز مقامات کی طرف آتے ہیں۔“ ناشون نے مسکراتے ہوئے بات آگے بڑھا لی تھی۔ ”سحر انگیز مقامات تو تم جان چکے ہو اسی طرح تاریک اور محسوس مقامات بھی ہوتے ہیں جس طرح ہم نیچوں کے سعد نظرات کے تحت خود کو خوش قسمت سحر انگیز مقامات پر پاتے ہیں اسی طرح محسوس نظرات کے تحت محسوس مقامات پر پائیں گے ان کے محسوس اثرات کا اندازہ بالکل اسی احساس سے ہوگا جس طرح سحر انگیز مقامات کا ہوا تھا یعنی خوشی کے بجائے بے چینی اور خوف محسوس ہوگا وہاں تمام کانٹے دار بدبو دار اور ایسے پودے جو کھڑے کوڑوں یا جانداروں کو مار دیتے ہیں پیدا ہوتے ہیں یا ایسے پودے بھی ملتے ہیں جو کھینچوں اور چھوئے کیڑوں کو اپنے اندر اس وقت بند کر لیتے ہیں جب وہ ان پر بیٹھتے ہیں اور یہ سب تاریک مقامات پر ہوتے ہیں تمام جنگلوں پر ایسے مقامات ہوتے ہیں جہاں موذی چیزیں پھلتی پھوٹی ہیں اور جو بھی کوئی وہاں جا کر سوتا ہے یا پکنک مناتا ہے تو اسے پھر بعد میں رونا پڑتا ہے۔ قدیم روایات کے مطابق ایسے مقامات شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں شیطانی قوتوں کے زیر اثر مقام پر انسان جیسے ہی داخل ہوتا ہے اسے فوراً خطرے کا نامعلوم احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسی جگہوں پر عموماً پندوں کی چچہاٹ نہیں ہوگی اور زمین سے نکلنے والی مہک بڑی ناگوار ناخوش ہوتی ہے۔ ایسی جگہوں پر وقت گزارنا سونا اور اکثر اوقات میں ایسی جگہوں سے صرف گزرتا ہی بڑا خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اسی صورت حال میں نقصان دہ شیطانی قوتیں متوجہ ہو جاتی ہیں چنانچہ ایسے مقامات پر جانے اور قوت گزارنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔“

”لیکن اکثر اوقات انسان کا ایسے مقامات سے گزر ہو ہی جاتا ہے؟ ایسی جگہیں تو ہم زندگی میں ایک سے زیادہ بار دیکھ ہی لیتے ہیں؟“ زلفی نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

”ہاں بالکل! انسانی زندگی میں ایسے مواقع آ ہی جاتے ہیں لیکن جن کو علم نہ ہو وہ محسوس جاتے ہیں اور جن کو علم ہو جائے تو وہ خود کو بہت بڑے صدموں اور نقصانات سے محفوظ کر لیتے ہیں اس لیے تو علم کو روشنی کہا گیا ہے۔“

”ناشون! تم نے درست کہا! اس لیے مجھے تمہاری یہ رصد گاہ آج بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ میرا نیچون سعد نظرات بتا رہا تھا اور میں نے خود کو ایک سحر انگیز مقام پر پایا۔“ عمر نے ایک لمبی سانس لے کر کہا تھا۔

”دیکھو عمر! جہاں کل رات اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک عظیم تجربہ یا معجزہ ہوا وہ جگہ سحر انگیزی اور خوش بختی لیے ہوئے تو ہوگی ہی تمہیں اس کا احساس اب اچانک وہاں کھڑے کھڑے اس لیے ہوا کہ یہ دیکھو۔“ ناشون نے بات کرتے کرتے عمر سومر و Natal chart کا تذکرہ کیا۔ ”میرے حساب کے مطابق تمہارا نیچون ٹھیک ایک گھنٹے پہلے طلوع اور قمر کی ساتھ سعد نظرات بتا رہا تھا اس لیے تم نے میری رصد گاہ کو سحر انگیز مقام کے بطور پایا یعنی اس مقام کی سحر انگیزی تم پر عیاں ہو گئی۔“

ابھی ناشون نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ جیسے کمرے میں ایک سحر انگیز خوشبو پھیل گئی۔

حیرت اسرار تجسس اور علم و آگہی سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

سلے وار پر اسرار کہانی اس کہانی کو آپ کبھی نہیں بھولیں گے

حیف سحر

گھائل اسرنا

احسن سلیم کا خیال

بے کار ہے غم، دشت میں اچھا ہوں اکیلا
کیا کم ہے مجھے تو بھی تصور میں یہیں ہے

اسرار کی دنیا سے کشید کیا گیا، دلچسپ اور عجیب سلسلہ قسط نمبر 21

خلاصہ

متر شنگ کی بناوت فرو کردی گئی اور وہ ہندی بنایا گیا۔ دونوں بچپن کے دوست ایک دوسرے سے شرمندہ ہوئے۔ متر شنگ یہ سوچ کر اس نے لوبھ اور لالچ میں اپنے دوست اور ہندوستان کے ہونے والے راجا سے غداری کی کاش اگلے ختم میں کنال کا تین کے پیدا ہو جوتا جاتی سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جلد سے جلد موت کی اچھا کا اظہار کیا مگر اسے قیدی بنایا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ تو ائین کی رو سے جتنا تیار اور تاج پوشی کی رسم ادا ہونے کے بعد متر شنگ کو برسر عام تختہ دار پر گھسیٹ لیا جائے گا۔ کشا رانی کو جب متر شنگ کی بناوت کی ناکامی کی خبر ملی تو وہ بڑی پریشان ہوئی کہ یہ متر شنگ نے کیوں کیا جو مضبوط اور سازش تیار کی گئی تھی اس میں متر شنگ کی بناوت کا تو کوئی ذکر نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راجہ کی کوششوں سے وہ کس طرح بناوت کرنے پر مجبور ہوا۔ کرن کی رہائی کے عوض کشا کو انصاف کی سیما میں پیش نہ کرنے کی صلاح دی گئی۔ کشا کے بیٹے جاوالت نے ماں کو مشورہ دی کہ وہ اس وقت کرن کو رہا کرے اور کنال کو جہاں ابد مان لینے کا پیغام بھیجے تاکہ کنال کے من سے ان کے بارے میں جو غبار ہے وہ چھٹ سکے۔ کشا نے پہلی بار بیٹے کو عقل کی بات کرتے دیکھا اور نہ ان کی اپنی عقل اس بے پناہ اور چاروں اور سے تیار توڑ ٹوٹنے والی مصیبت سے بالکل ہی جواب دے گئی تھی۔ انہوں نے کرن سے معافی مانگی اور اسے رہا کر دیا۔

کنال کا قافلہ پالمی چتر کی سرحدوں سے کچھ دور بڑاؤ کر چکا تھا اور دن بعد جتنا تیار کے انت پر کنال کی سواری پورے خطرے کے محل میں جا رہا ہے وہی تھی۔ کرن رہا ہو کر رہتی ہے پاس پہنچا تو رہتی ہے اسے متر شنگ کی بناوت اور گرفتاری کا پورا ماہر اسٹایا جسے کن کر وہ کنال کی اداوی اور بدلاؤ کا سبب جان گیا۔ اس نے راجہ کو راجن کو واپس بلانے کی صلاح دی کہ راجن کی بیٹی ہوئی کشا کے پاس کوئی کمزوری نہ چھوڑی جائے یوں راجن کو بھی بلالیا گیا۔ راجن کے ساتھ پریمو بھی آگئی جو راجن سے ملے کو ترس رہی تھی۔ اس نے کشا سے کہا کہ محل میں آدھسکے سے پہلے اس ناری کا پتا چانا اگر لازمی ہے تو مجھے بھی راجن کے ساتھ بھیج دیں پھر یہ کام کر گزروں گی ساتھ ہی ایک اور بھی کام پر یہودانے کشا کو بتایا کہ وہ کنال سے

کہے گی کہ آپ خدمت میں خبر رسائی کے جذبے کے تحت کشتا نے ایک خاص کنیر بھیجی ہے یوں جتنا تڑا میں ستر شکر کے علاوہ تمام کردار شریک ہو رہے جو اس عظیم مہم کی اس لافانی داستان کا حصہ ہیں۔ رجنی نے بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ اب بھی کنال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ براہمن جاتی اور دربار کے امرا اور آس پاس کی ریاستوں کے راہے مہاراجے رتھ کار رانیاں اور شہزادے شہزادیاں اور سب ہی اونچی ذاتوں کے لوگ کنال کو ایک غریب لڑکی کو ہندوستان کی ملکہ بنانے کی آگیا نہ دیں گے جبکہ پریوداکا کنیر کی حیثیت سے کنال کی خدمت میں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ کنال بھی قبول نہیں کریں گے۔ پریوداکا صرف قافلے میں رہنے کو ہی آتی تھی اس سے زیادہ وہ چاہتی تھی۔ انسو یا جسے شکر کا نام دیا گیا تھا اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی کہ کشتا رانی نے اپنی پائلیں بدل ڈالی تھیں مگر جس وقت پریوداکا نے اس سے یہ کہا کہ کشتا بھی اس ناری کی بیگناہ چاہتی ہے جس سے کنال دیواہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو رجنی کو لگا کہ انسو یا کی ضرورت پڑتی ہے۔

پھر اس دن کشتا نہایت بے کالی سے جاہرا میں اپنی کس آشرم میں اور انیس یہ بتایا کہ کنال جتنا سے ایک ایسی اجازت مانگ رہا ہے جو سارے نیوں کو بدلے کی بات ہے۔ وہ سچ ذات کی چھوری کو اپنی ملکہ بنانے کی بات کر رہا ہے۔ جتنا صرف اس کا ساتھ دے رہی ہے بلکہ جتنا بہت خوش ہے اس فیصلے سے۔ پائلی کی یہ کن جیسے دم ہی تو نکل گئی۔ کشتا نے جو پائلی کی یہ حالت دیکھی تو زمین کشتا کے پیروں سے بھی سرک گئی۔

اب آپ آگے پڑے۔

”مہاراج‘ گستاخی معاف‘ کیا اس معاملے میں آپ بھی خود کو بے بس محسوس کر رہے ہیں؟“ اتنی دیر میں پائلی سنبھل کر بیٹھ چکے تھے۔

”کشتا“ یہ تو اذیت ہے۔ سراسر جتنا کو براہمن اور دھرم دونوں سے دور کرنے کی کوشش ہے جو جتنا راضی ہو گئی اور انہوں نے دھاراک رشیوں، مہارپوتوں اور مہا پجاریوں کی باتیں بھی ماننے سے انکار کر دیا اور وہ کنال کے لیے اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی سننے سے انکاری ہوئے تو دھرم کی قبولیت جائے گی۔ یہ تو برا اذیت ہو جائے گا کشتا۔“

”پھر مہا پجاری جی اب کیا ہوگا؟“ کشتا کی حالت دیدنی تھی۔

”یہ دیش میں چھیڑی جانے والی ایسی جنگ ہے جو بھھداری سے نہ لڑی گئی تو سب آشرم اور مندر اور سارا دھرم نشت ہو جائے گا سب سے زیادہ لہو پجاریوں اور رشیوں کا بے گناہ۔ اس سے زیادہ ہولناک منظر اتہاس میں کبھی آسمان نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب جتنا خود اپنے ہاتھوں سے مہارشیوں اور پجاریوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لہو لہان کرے گی ان کے پران چھین لے گی“ کنال نے بڑی غضب کی چال چلی ہے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں بڑی بھاری اور ناقابل یقین بغاوت ہے۔“

”تو پھر مہاراج“ کیا وہ سچ ذات کی چھوری ہندوستان کی رانی بن جائے گی؟“ کشتا نے پائلی کی خوف میں ڈوبی باتوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

”بھھداری کا تقاضہ تو یہی ہے حالانکہ جو یہ ریت پڑ گئی تو سمجھو ہندوستان میں سب اونچی ذاتوں کا ستیا ناس ہو جائے گا۔ اسے روکنے کا اپنا ڈھونڈنا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ کشتا جلد سے جلد یہ جان لینے کو بے چین تھی کہ آخر ہوگا کیا، کیسے کنال کو رجنی سے دیواہ کرنے سے روکا جاسکے گا؟

”اگر کنال سے یہ بات کی جائے کہ وہ اس چھوری کو رانی کا مان سامان نہ دے اور بس اپنی جو رو بنا کے اپنی ذات تک محدود کر لے تو کیا کنال یہ بات منظور کر لے گا؟“

”ہرگز نہیں مہاراج“ یہ کام تو وہ چھپا چوری بھی کر سکتا تھا یوں جتنا سے اس کی آگیا لینے کا مطلب اس سچ ذات کی چھوری کو مہارانی بنانے کے علاوہ کچھ نہیں اور کیا ہندوستان کنال کے ہندو بیست میں رائے رہے گا اس کی کوئی رانی نہ ہوگی؟“

”تم نے ایک سوال میں دو باتیں پوچھ لیں کشتا، پہلی یہ کہ تم ایسا سمجھتی ہو کہ کنال اس چھوری کو ملکہ بنانے سے کم یہ راضی نہ ہوگا جو وہ مان گیا تو راجندھانی بنا ملکہ کے کیسے رہے گی؟ ہم سمجھتے ہیں۔“ انہوں نے تھوڑی دیر رکنے کے بعد کہا۔ ”تم نے بھی یہ ضرور تسلیم کیا کہ وہ مان بھی سکتا ہے۔ گر مان بھی گیا تو ہندوستان کو بنارانی کے رائے رکھنا بھی بڑی غضب کی شرمندگی کا باعث ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کنال مانے گا کہ نہیں؟ اس کا مان جانا اس بات سے زیادہ اہم ہے کہ ہندوستان رائے رہ سکتا ہے۔ کم سے کم برسوں سے چلی آرہی رسم و رواج اور دھرم کے انٹ شددھوں کا پاس تو رہے جائے گا ورنہ اونچ نیچ کی جو لکیر مانو جاتی کی بھلائی اور سنسار کو بنائے رکھنے کو بھگوان نے بھیجی ہے وہ مٹ سکتی ہے اور اس کا مٹنا آنے والے سب دنوں کے لیے بڑی بھاری تباہی لائے گا۔ رہی رانی کی بات تو وہ سارے رتبے اور مان سامان بدستور آپ کے ہی اختیار میں رہیں تو کوئی ایسی انہونی بات نہیں۔“ پائلی کے منہ سے یہ نہایت عجیب و غریب بات سن کر کچھ بھی سوچے بغیر کشتا خوشی سے پاگل ہو گئی۔

”آپ کے منہ میں سارے جہاں کی لکشی ہیرے جواہرات میں نے یہ بات کبھی سننے میں بھی نہیں سوچی تھی۔ آپ سچ دھرم اور دیش دونوں کے بڑے سچے اور کچے پریمی اور خیر خواہ ہیں مہاراج“ میں آپ کی ابھائی ہوں۔ پائے لاگوں۔“ کشتا مہارپوتہ کے پیروں کو چھونے کے لیے جھک گئی۔ یہ خیال اسے پاگل کیے دیتا تھا

با آواز بلند پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا۔

”محترم مہارپوتہ اور تمام مہارشیو پتھیوں کو پرنام۔“

مجھے آشا ہے کہ دھارمک سہا کوئی ایسا فیصلہ میری اس بات کے جواب میں نہ کرے گی جس کے مطابق میں ایک غریب ناری کو اپنی رانی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ دلش میں انتشار اور خون خرابہ ہوا ایسی کوئی غلطی خود دھرم کے رکھشوں کو کبھی بہت پہنچی پڑ سکتی ہے کہ کنال کو تلوار اٹھانے پر کوئی مجبور نہ کرے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ دھرم جتنا کے لیے ہے جتنا دھرم کے لیے نہیں ہے۔ جو کنال اشوکا کو سن منائی کرنی ہوئی تھی تو ہم جتنا کی بھی پرواہ نہ کرتے مگر کنال کو اپنے دلش کی جتنا کے سب ہی سدیوں سے پریم ہے وہ کسی بھی ذات کے ہوں کنال کے لیے باعث عزت اور اہم ہیں تب ہی ہم نے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے میں جتنا کی مرضی حاصل کرنے کو ضروری سمجھا۔ اب یہ دھارمک سہا کے شریک رشیوں پنڈتوں اور گیارہوں کا کرتو ہے کہ وہ کوئی غلط فیصلہ یا ایسا فیصلہ نہ کریں جو جتنا کی مرضی کے خلاف ہو۔“

یہ پورا سندیس پڑھتے ہوئے مہارپوتہ پانینی صرف ایک جگہ چونک کر رہے اور انہوں نے مجلس میں شریک رشیوں پنڈتوں کی طرف غور سے دیکھا وہ جگہ تھی دھرم جتنا کے لیے ہے جتنا دھرم کے لیے نہیں ہے مگر سب ہی چہروں پر ایک ایسا سکوت کنڈلی مارے بیٹھا تھا جیسے وہ سانس لینا بھول گئے ہوں۔

شام ہونے سے پہلے مہارپوتہ نے کنال کو جواب لکھ دیا اور وہ تمام دھارمک سہا کو اسی طرح پڑھ کر سنایا گیا جیسے سندیس پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ جواب تھا۔

”مہاراجہ کنال اشوکا۔“

کی خدمت میں پرنام۔

مہاراجہ خاطر جمع رہے دھارمک سہا کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جو دلش میں انتشار اور خون خرابے کا باعث ہو۔ دھارمک منڈل جتنا کے جذباتوں کا پورا دھیان رکھے گی اور مہاراج کا آدھی سہا کے پیش نظر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ دودن بعد جب دھارمک سہا ساپت ہو تو مہاراجہ کنال آشرم میں پدھاریں اور سہا کے دس نمائندوں سے بالمشافہ ملاقات کر کے انہیں مطمئن کریں اور کچھ سوالوں کے جواب دیں جو مہاراج کے لیے یہ ممکن ہو تو آشرم کے سب ہی باسی آپ کے سواگت میں جتنے کو اپنا سوا بھاگیہ سمجھیں اور جو یہ ممکن نہ ہو تو سہا اپنے فیصلے سے آپ کو اور جتنا کو ضرور آگاہ کرے گی کہ یہ سہا اسی کارن بھائی گئی ہے۔

مہارپوتہ پانینی اور دھارمک سہا میں شریک سب ہی رشی تپسوی اور پنڈت منڈل۔

کنال نے جواب پڑھنے کے بعد رجنی سے صلاح لینا ضروری سمجھا۔ بھاری سوچ بچار کے بعد رجنی نے دھارمک سہا کے دسیوں نمائندوں سے ملنے کو ہی ٹھیک سمجھا اور یوں دودن بعد کنال اپنی سپاہ کے دس بہترین سپاہیوں کے ساتھ دھارمک سہا میں جا پہنچا۔ مہارپوتہ اور دیگر دھارمک شخصیات نے اس کا سواگت بڑے زبردست تیار یوں سے خود کنال کی توقع سے بڑھ کر کیا۔ کشتا کو بھی تمام واقعات کی بل بل کی خبر تھی لہذا بے چارے اور اتنا ولی کشتا نے اس مغل میں شرکت کی درخواست پیچیدگی جو نہایت ادب و احترام سے مسترد کر دی تھی تاہم کشتا کو آشرم کے شاہی مہمان خانے میں پدھارنے کی اجازت کنال کی مرضی اور صلاح سے دے دی گئی۔ کشتا گرچہ یہ بہت کم معلوم ہوا مگر وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کی حیثیت سخت خطرے سے دوچار تھی اور طاقت کا سلسلہ

کہ ایسی شاندار حیثیت تو اسے اس وقت بھی حاصل نہ ہوتی جب اس کا اپنا بیٹا جالوت راج سنگھ پر جا بیٹھتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ کاش کنال مہاراج کی بات مان لے تو کتنا اچھا ہو وہ مرتے دم تک مہارانی بنی رہے گی اور پھر وہ ایسی صورت میں کبھی کنال کی کسی اونچی ذات کی چھوری سے شادی کرنے کی بات غلطی سے بھی زبان پر نہیں لائے گی مگر چند ہی لمحوں میں اس کی خوشی کا نور ہو گئی جب اسے محسوس ہوا کہ کنال رجنی کو مہارانی بنانے سے کم پر راضی نہ ہوگا تب.....“

”اگر وہ راضی نہ ہوا تو مہاراج؟“ اس خیال میں ڈوبتی کشتا اور کیا پوچھ سکتی تھی۔

”تب پھر کوئی بڑی کم ظرف اور گھٹیا چال چلنا ہوگی۔“ پانینی نے آنکھوں میں جیسے کوئی منظر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں۔“ کشتا کی آواز خود بخود سرکشی میں بدل گئی۔

”ابھی کچھ بھی کہنا مشکل ہے کل یا اس کے اگلے دن کچھ بتا سکیں گے۔“ کشتا کو فوری طور پر کچھ مایوسی ہوئی تھی۔

یہ خبر تمام منتری منڈل اور روسا اونچی ذات والوں میں راجے مہاراجوں میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ کنال ایک نیچی ذات کی کنیا کو اپنی رانی بنانا چاہتا ہے جو اونچے مرتبے والے امراء روسا اور مہاراجے پر اس لگائے بیٹھے تھے کہ جب کنال اپنی رانی چننے کے واسطے مغل آراستہ کرے گا تو وہ بھی اپنی اپنی سہریلوں کو قسمت آزمائے کو اس دکھاوے میں سمجھیں گے جانے ہندوستان کی سب سے اہم اور با اختیار ناری انہی کی بیٹی یا بہن بن جائے۔ کنال کی چنتا سے یہ درخواست کہ وہ ایک غریب چھوری کو اپنی رانی بنانا چاہتا ہے آپ مجھے اس کی آگیا دیں گے۔ ان سب آس و آشا لگائے رکھنے والے افراد میں شدید مایوسی اور غصہ بن گئی۔ انہیں کنال سے ایسے دھرم اور روایت شکن ہونے کی قطعی امید نہ تھی چنانچہ تمام اونچے ایوانوں میں کھلبلی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اب یہ سوال اپنی جگہ اہمیت اختیار کر گیا کہ کنال جیسے جری اور بہادر راجکمار کے سامنے کون ہے جو زبان کھولے یا سوال اٹھائے چنانچہ سب کے سب دم سادھے بیٹھے رہے کسی کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ وہ کشتا سے ہی اس بارے میں کوئی سوال کرتے۔ پانینی نے آنا فانا تمام مہارشیوں اور پنڈتوں اور بھاریوں کو جمع کرنے کی ابتدا کر دی۔ وہ جتنا تڑا کا چوتھا دن تھا جب ایک جاسوس دشوا متر نے یہ خبر شاہی خیمے میں پہنچوائی کہ ہونے والے مہاراج کی اس روایت شکنی اور دھرم پیش قدمی کو روکنے کے لیے دھارمک سہا شروع ہو چکی ہے جس میں یہ فیصلہ اتم ہونے کو ہے کہ راجکمار کنال کو دھرم اور روایت کی توہین کرنے سے روکا جائے۔“

یہ سنتے ہی کنال نے مغل مگر کسی قدر تپش سے کہا۔ ”جو ہم نہیں چاہتے وہ یہ لوگ چاہتے ہیں ہم دھرم اور روایت کے خلاف کچھ بھی کر سکتے ہیں مگر اپنی پر جا کے خلاف کبھی کچھ نہیں کریں گے۔ ہمارا فیصلہ جتنا کو پسند ہے تو ہمیں کسی اور کی کوئی پرواہ کیوں ہو؟“

چنانچہ اسی وقت کنال نے ایک سندیس تیار کرایا اور دھارمک سہا میں بھجوا دیا۔ یہ سندیس لے کر بھی دشوا متر گیا۔ اس نے بڑی شان و شوکت سے دھارمک سہا میں یہ پیغام پہنچوایا اور خود عارضی نشست گاہ میں فروکش ہوا۔ مہارپوتہ پانینی نے اپنے خاص نمائندے کے ذریعے یہ سندیس لے کر اس عظیم آشرم میں یہ سندیس

کہ ایسی شاندار حیثیت تو اسے اس وقت بھی حاصل نہ ہوتی جب اس کا اپنا بیٹا جالوت راج سنگھ پر جا بیٹھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ کاش کنال مہاراج کی بات مان لے تو کتنا اچھا ہو وہ مرتے دم تک مہارانی بنی رہے گی اور پھر وہ ایسی صورت میں کبھی کنال کی کسی اونچی ذات کی چھوری سے شادی کرنے کی بات غلطی سے بھی زبان پر نہیں لائے گی مگر چند ہی لمحوں میں اس کی خوشی کا نور ہو گئی جب اسے محسوس ہوا کہ کنال رنجی کو مہارانی بنانے سے کم پر راضی نہ ہوگا تب.....

”اگر وہ راضی نہ ہوا تو مہاراج؟“ اس خیال میں ڈوبتی کشتا اور کیا پوچھ سکتی تھی۔

”تب پھر کوئی بڑی کم ظرف اور گھٹیا چال چلنا ہوگی۔“ پائی نے آنکھوں میں جیسے کوئی منظر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سمجھتی نہیں۔“ کشتا کی آواز خود بخود سرکشی میں بدل گئی۔

”ابھی کچھ بھی کہنا مشکل ہے، کل یا اس کے اگلے دن کچھ بتا سکیں گے۔“ کشتا کو فوری طور پر کچھ مایوسی ہوئی تھی۔

.....

یہ خبر تمام منتری منڈل اور رؤسا، اونچی ذات والوں میں راجے مہاراجوں میں، جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ کنال ایک ننھی ذات کی کنیا کو اپنی رانی بنانا چاہتا ہے جو اپنے مرتے والے امراء رؤسا اور مہاراجے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ جب کنال اپنی رانی چننے کے واسطے غفلت آراستہ کرے گا تو وہ بھی اپنی اپنی ستر یوں کو قسمت آزمائی کے واسطے لگا دے گا۔ ان ستر یوں میں سے ایک غریب چھوری کو اپنی رانی بنانا چاہتا ہے آپ مجھے اس بہن بن جائے۔ کنال کی چنتا سے یہ درخواست کہ وہ ایک غریب چھوری کو اپنی رانی بنانا چاہتا ہے آپ مجھے اس کی آگیا دیں گے۔ ان سب آس و آشا لگائے رکھنے والے افراد میں شدید مایوسی اور غصہ بن گئی۔ انہیں کنال سے ایسے ادھر اور روایت شکن ہونے کی قطعی امید نہ تھی چنانچہ تمام اونچے ایوانوں میں کھلبلی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اب یہ سوال اپنی جگہ اہمیت اختیار کر گیا کہ کنال جیسے جری اور بہادر راجہ کے سامنے کون ہے جو زبان کھولے یا سوال اٹھائے چنانچہ سب کے سب دم سادھے بیٹھے رہے، کسی کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ وہ کشتا سے ہی اس بارے میں کوئی سوال کرتے۔ پائی نے آنا فانا تمام مہارشیوں اور پنڈتوں اور پجاریوں کو جمع کرنے کی ابتدا کر دی۔ وہ جتنا بڑا اکوچ تھا دن تھا جب ایک جاسوس دشوا متر نے یہ خبر شاہی خیمے میں پہنچوائی کہ ہونے والے مہاراج کی اس روایت شکنی اور ادھر پیش قدمی کو روکنے کے لیے دھارک سبھا شروع ہو چکی ہے جس میں یہ فیصلہ اتم ہونے کو ہے کہ راجہ کنال کو دھرم اور روایت کی توہین کرنے سے روکا جائے۔

یہ سنتے ہی کنال نے خجل مگر کسی قدر تپش سے کہا۔ ”جو ہم نہیں چاہتے وہ یہ لوگ چاہتے ہیں ہم دھرم اور روایت کے خلاف کچھ بھی کر سکتے ہیں مگر اپنی پر جا کے خلاف کبھی کچھ نہیں کریں گے۔ ہمارا فیصلہ جتنا کو پسند ہے تو ہمیں کسی اور کی کوئی پرواہ کیوں ہو؟“

چنانچہ اسی وقت کنال نے ایک سند یہ تیار کرایا اور دھارک سبھا میں بھجوا دیا۔ یہ سند یہ لے کر بھی دشوا متر گیا۔ اس نے بڑی شان و شوکت سے دھارک سبھا میں یہ پیغام پہنچوایا اور خود عارضی نشست گاہ میں فروکش ہوا۔ مہاراجہ و ہت پائی نے اپنے خاص نمائندے کے ذریعے وہ سند یہ منگوائی اور اس عظیم آشرم میں یہ سند یہ

با آواز بلند پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا۔

”محترم مہاراجہ و ہت اور تمام مہارشیو پندویوں کو پر نام۔

مجھے آشا ہے کہ دھارک سبھا کوئی ایسا فیصلہ میری اس بات کے جواب میں نہ کرے گی جس کے مطابق میں ایک غریب ناری کو اپنی رانی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ دلش میں انتشار اور خون خرابہ ہوا کسی کوئی غلطی خود دھرم کے رکھشوں کو کبھی بہت ہی بڑی ہوتی ہے کہ کنال کو تلوار اٹھانے پر کوئی مجبور نہ کرے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ دھرم جتنا کے لیے ہے جتنا دھرم کے لیے نہیں ہے۔ جو کنال اشوکا کو من مٹائی کرنی ہوئی تھی تو ہم جتنا کی بھی پرواہ نہ کرتے مگر کنال کو اپنے دلش کی جتنا کے سب ہی سندھیوں سے پریم ہے وہ کسی بھی ذات کے ہوں کنال کے لیے باعث عزت اور انہم ہیں تب ہی ہم نے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے میں جتنا کی مرضی حاصل کرنے کو ضروری سمجھا۔ اب یہ دھارک سبھا کے شریک رشیوں پنڈتوں اور گیارہوں کا کر تو ہے کہ وہ کوئی غلط فیصلہ یا ایسا فیصلہ نہ کریں جو جتنا کی مرضی کے خلاف ہو۔“

یہ پورا سندیس پڑھتے ہوئے مہاراجہ و ہت پائی صرف ایک جگہ چونک کر رہے اور انہوں نے مجلس میں شریک رشیوں پنڈتوں کی طرف غور سے دیکھا وہ جگہ تھی دھرم جتنا کے لیے ہے جتنا دھرم کے لیے نہیں ہے مگر سب ہی چہروں پر ایک ایسا سکوت کنڈلی مارے بیٹھا تھا جیسے وہ سانس لینا بھول گئے ہوں۔

شام ہونے سے پہلے مہاراجہ و ہت نے کنال کو جواب لکھ دیا اور وہ تمام دھارک سبھا کو اسی طرح پڑھ کر سنایا گیا جیسے سند یہ پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ جواب تھا۔

”مہاراجہ کنال اشوکا۔

کی خدمت میں پر نام۔

مہاراجہ خاطر جمع رہیں دھارک سبھا کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جو دلش میں انتشار اور خون خرابے کا باعث ہو۔ دھارک منڈل جتنا کے جذباتوں کا پورا دھیان رکھے گی اور مہاراج کا آدھ بھی سبھا کے پیش نظر ہے۔ کیا یہی اچھا ہو کہ دو دن بعد جب دھارک سبھا ساہت ہو تو مہاراجہ کنال آشرم میں پدھاریں اور سبھا کے دس نمائندوں سے بالمشافہ ملاقات کر کے انہیں مطمئن کریں اور کچھ سوالوں کے جواب دیں جو مہاراج کے لیے یہ ممکن ہو تو آشرم کے سب ہی باہمی آپ کے سواگت میں جتنے کو اپنا سو بھاگیہ سمجھیں اور جو یہ ممکن نہ ہو تو سبھا اپنے فیصلے سے آپ کو اور جتنا کو ضرور آگاہ کرے گی کہ یہ سبھا ہی کارن چٹائی گئی ہے۔

مہاراجہ و ہت پائی اور دھارک سبھا میں شریک سب ہی رشی تپوی اور پنڈت منڈل۔“

کنال نے جواب پڑھنے کے بعد رنجی سے صلاح لینا ضروری سمجھا۔ بھاری سوچ بچار کے بعد رنجی نے دھارک سبھا کے دسیوں نمائندوں سے ملنے کو ہی ٹھیک سمجھا اور یوں دو دن بعد کنال اپنی سپاہ کے دس بہترین سپاہ سالاروں کے ساتھ دھارک سبھا میں جا پہنچا۔ مہاراجہ و ہت اور دیگر دھارک شخصیات نے اس کا سواگت بڑی زبردست تیاریوں سے خود کنال کی توقع سے بڑھ کر کیا۔ کشتا کو بھی تمام واقعات کی پل پل کی خبریں ہلڈاے پلین اور اتاوی کشتا نے اس محفل میں شرکت کی درخواست بھیجی جو نہایت ادب و احترام سے مسترد کر دی گئی تاہم کشتا کو آشرم کے شاہی مہمان خانے میں پدھارنے کی اجازت کنال کی مرضی اور صلاح سے دے دی گئی۔ کشتا کو گرچہ یہ بہت کم معلوم ہوا مگر وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کی حیثیت سخت خطرے سے دوچار تھی اور طاقت کا سارا

وزن کنال کی اور جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے سارے پتے کھیل کر ہار چکی تھی۔ اب اسے ساری امید صرف دھارک سبھا اور مہاراج پوت سے ہی تھی کہ وہ ضرور کنال کے راستے میں آہنی دیوار ثابت ہوں گے مگر جس وقت کشاکش سبھا کا فیصلہ پہنچا تو اس کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹھو بدن میں لپونہیں۔

دھارک سبھا کا فیصلہ تھا۔

”مہاراج کنال نے جس طرح دھارک سبھا اور براہمن جاتی کا آدر کرتے ہوئے اس سبھا میں شریک ہو کر تمام رشیوں کو عزت بخشی ہے اس سے یہ پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے کہ مہاراجہ کے دل میں دھرم کی بڑی زبردست عزت اور مہانتا ہے لہذا یہ دھارک سبھا اپنے مہاراجہ کو مایوس نہیں کرے گی اور کنال راجہ کو اپنی رانی چنے کا پورا اختیار دیتی ہے اور اسی میں راضی برضا ہے۔“

اب کشاکش کے پاس کوئی امید باقی نہ بچی تھی اور کنال کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ اس نے دھارک سبھا کی بہت ہی شائستگی بنائے رکھنے والے انتہائی فیصلے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور آشرم کے سب ہی رشیوں اور مہاراجہ کو یقین دلایا کہ کنال کے عہد میں آشرم اور اس سے جڑے سب ہی لوگوں کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے بعد بھی رجنی کے کہنے پر کنال نے جتنا تیرا جاری رکھی اور پورے دس دن بعد وہ نہایت شان و شوکت سے اپنے باپ اشوکا کے عالی شان محل میں راجا پورے ایک مہینے کا جشن منانے کا اعلان ہوا اور محل کے دروہام سب آہنی آرائش سازوں نے وہ کمال ہنر دکھایا دنیا دنگ رہ گئی۔ محل کو پھولوں اور قیمتی قسم کے آرائشی طریقوں سے بالکل دلہن کی طرح سجایا گیا۔ کنال بہت خوش تھا کہ اس کی محبت کو منزل ملنے والی تھی اسی کی مرضی کے انوسار 15 یوم کے بعد تاج پوشی کی رسم ادا ہونا تھی اور ٹھیک 15 دن بعد جب تمام اختیارات و احکامات کنال کے ہاتھوں میں ساری مجلس اور منتری منڈل دے دیں گے تو کنال اور رجنی کی شادی کا مہورت شہ سے نکالا جائے گا۔ یہ سب جشن پورے جو بن پر تھا اور کشاکش جلی ہوئی بلی کی طرح اپنے محل میں منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اس نے ایک اور کثیر کوئی کو پریمودا کو بلانے بھیجا تو محل کے اعرایض گوشے میں دو کثیروں نے اپنے جیون میں پہلی بار سکھ اور آزادی محسوس کی۔

”کیوں بلایا ہے اس گزرتے سے کی رانی نے تجھے؟“ کوئی نے کہا۔

”کتنی عجیب بات ہے بلانے تو مجھے آئی ہے اور الٹا مجھ ہی سے پوچھتی ہے کہ مجھے یہ کیوں بلایا ہے اس حد کی ماری پاپ کی پوتریا نے؟“ پریمودا نے مسکرا کر کہا۔

”سچ پوچھو تو جیون میں پہلی بار اس رجنی کے کارن میں اس کا یہ آدیش ٹھکرانے کی حیثیت میں ہوں کیونکہ اب میں کشاکش کی نہیں مہاراج کنال کی باندی ہوں۔“

”تیرا جو من چاہے وہ کر مجھے تو یوں بھی اب تو کثیر نہیں لگتی عجیب مجید بھاؤ ہیں تیرے۔ راجہ مہاراجوں کی سنگت میں رہ کر انہی کی طرح مشکل پسند ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بات تو بتا۔“ کوئی نے ذرا ٹھہر کر دوسرا موضوع بدلا۔

”مجھے معلوم ہے تو کا پوچھے گی؟ خود کشاکش کی اب بھی یہی بے چینی ہے۔“

”تو تو بڑی گیانی ہو گئی بتا تو سہی میں کیا کہن والی تھی؟“ کوئی کو آج کتنے ہی سے بعد ایسی آزاد خیالی سے پریمودا سے باتیں کرتے بہت اچھا لگ رہا تھا وہ کشاکش کے محل میں آس پاس منڈلاتے خوف کے سایوں سے

کتنی محفوظ ہو گئی تھی کہ ہر وقت ہر قدم خوف اور ڈر دامن گیر رہتا تھا مگر یہاں کنال کے محل میں سب کتنے آزاد اور بہت حد تک اپنی مرضی کے مالک تھے۔

”یہی کہ مہاراج کنال کی رانی کو کسی نے بھی نہیں دیکھا تو وہ اتنی چھپا کے کیوں رکھی جا رہی ہے؟ یہی پوچھنے والی تھی تو نا بول؟“ پریمودا نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹی۔ کوئی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”یہی تو سب سے اہم بات ہے جس کے لیے دیش میں سب کو بڑی بے صبری لگی ہے اور سب سے زیادہ کشاکش کی رانی کو۔ اپنی رانی سے دیواہ کرنے کے لیے مہاراج کنال کو چٹکی کھنائیوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا ہے یہ وہ ہی جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کتنے دشمن ہیں خاص طور سے ان کے پریم کے تو جب وہ راج سنگھاسن پر بیٹھ جائیں گے اور دیواہ کی ڈونڈی بجا دی جائے گی تب وہ یہ پردہ اٹھائیں گے اور پھر تو جو چاہے سو دیکھے پر تب تک نہیں۔“

”اچھا تو بڑی پنڈتا بن بنی ہوئی ہے تو نے تو دیکھ لیا نا چل اب میں چلتی ہوں تو کہے تو رانی سے کہہ دوں کہ تو اب اس کی کثیر نہیں رہی۔“ کوئی جیسے محل ہی تو گئی۔

”نہیں ایسا مت بول مجھے آخر تک اس عورت کی خبر نہ رکھنی ہوگی۔ وہ ایسی ڈائن ہے جو کسی بھی وقت ڈس سکتی ہے اور تو مہاراج کی رانی کی طرف سے کیوں دل چھوٹا کرتی ہے؟ چل آ تجھے ملاؤں پھر تو یہ بھی مان لے گی کہ تو ان سے مل چکی ہے۔“

”اچھا یہ کب ہوا؟ چل اب زیادہ بھارتوں میں مت پڑ میں تجھے ملاتی ہوں۔“

وہ دونوں دیوان خاص کے اس حصے میں چلی گئیں جہاں رجنی کا قیام تھا۔ رستے میں ذرا سے فاصلے پر بہت سے سپاہیوں نے روکا مگر پریمودا کے پاس ایک ایسی نشانی تھی رجنی کی دی ہوئی کہ اسے رجنی تک پہنچنے دیا گیا۔ جس وقت پریمودا اور کوئی رجنی کے پاس پہنچی ہیں تو انہوں نے عجیب منظر دیکھا دونوں کو گھنٹی حیرت ہوئی۔ رجنی کا باپ اس کے بالوں میں لٹھی کرے تھا اور اس کی پٹیا کوندہ رہا تھا۔ دونوں کے منہ سے دبی دبی ہنسی نکل گئی۔

”آؤ آؤ ہنسومت یہاں بیٹھو میری میا تو بچپن میں ہی چل بیس میرے سارے کام یہ میرا باپ ہی تو کرتا تھا۔“ رجنی نے باپ کو پیار کیا۔ ”یہی میری ماں ہے یہی میرا باپ ہے۔“

”پر رجنی اس سے تو تم کل میں ہو کتنی ہی کثیریں اور باندیاں تمہارے ایک اشارے کی منتظر ہیں تو پھر باپ کو کیوں تکلیف دی؟“ پریمودا نے کہا۔ کوئی ایک دم ٹپکی باندھے رجنی کو دیکھے چلی جا رہی تھی جیسے اس کے ہوں جاتے رہے ہوں۔

”اری پریمودا تو کیوں ایسی باتیں کرتی ہے؟ تو اور ہم تو ایک سارے ہیں اور پھر میری پتری اب راجا کی رانی بننے والی ہے۔ جانے کب ایسی سیوا کرنا نصیب ہو۔ جو کچھ دن رچے ہیں ان کو میں اپنی رجنی کے ساتھ ایسے ہی بتانا چاہوں گا جیسے ہم دونوں باپ بیٹی پہلے بتایا کرتے تھے۔“ باپو نے خوب دلچسپی سے کہا۔

”ٹھیک ہے باپو ٹھیک ہے رانی بن کے تو رجنی ہم سب پر حکومت کرنے والی ہے۔“ پریمودا باپو کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”یہ کون ہے پریمودا اور تم کنال مہاراج کی مرضی کے خلاف اسے ہم تک لے کر آئی ہو۔“ رجنی نے کوئی

”یہ میری بڑی جاٹا ریمیکل ہے اسی نے اپنی جان پر کھیل کر کشمیری کی سازشوں کی خبر آپ تک پہنچائی تھی۔ کوئی نام ہے اس کا۔“ بریوڈا نے غشی کی سی کیفیت میں کھڑی کوئی کا تعارف کرایا۔

”اب پہچان لو یہ کون ہیں“ فوج کے بڑے بہادر اور شجاع سپاہی۔ ”پر یہودانے رجنی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہائے دیا“ آپ؟“ کوئی کے منہ سے نکلا۔

”ہاں مگر یہ راز بھی کسی کو پتا نہ چلے۔ ہم اپنی رانی کے لیے جان دے دیں گے مگر اس پر ہماری وجہ سے کوئی آج آئے نہ ہوئے دینا کوئی۔“ بڑھو دانے کوئی کوا کا ندھ سے پکڑ کر اپنے قریب کیا۔

”تم فکر مت کر دو پر بودا ہم اپنی رانی کو ایک ہلکی سی کھروچ بھی کبھی پہنچنے نہ دیں گے۔ بھگوان کرنے اس نازک اور کوئل اور شیل رانی کو اب کبھی تلوار نہ اٹھانی پڑے۔“ کوئی جھٹ سے رجنی کے پیروں میں بیٹھ گئی

اور اس کے ہاتھوں کو چومنے لگی۔

”جلی جاؤ“ معلوم ہو جائے گا اور اب ان کے من میں کسا چل رہا ہے؟“ رجنی نے کہا اور یوں بریودا کشنا

”کس میری بہن رجنی مجھے ایک مارا نے سنے سے نہ لگا لیں گی کہ کہ مانو کی طرح مجھے اس لگتا ہے جیسے ہم آج کے پاس جانے کو تیار ہو گئی۔ وہ جاتے جاتے چلتی اور آبدیدہ ہو کر بولی۔

اسی بھینٹ جانے کبھی ہو یا نہ ہو۔“ اس کی آنکھیں پوری طرح چمک پڑیں۔ رجنی نے اٹھ کر پرہیز کو دیکھا۔

”کیوں ایسی باتیں کرتی ہو؟ پتو ہے ہی سدا کاروگی پتو کیوں ایسی باتیں کرتی ہے ہری بھلی۔“

چھوڑنے لگی۔ ”سچ ہے مہارانی، ہندوستان کی ملکہ آپ کو ہی ہونا چاہیے۔“

واپس بھیج دیا اور اب ایک خاص نشست گاہ میں جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا پر یود اور کشتارانی اکیلی

”کیا ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری برسوں پرانی کینسر پریکودا اب بھی ہماری وفادار ہے؟“

”اوہ..... تو تم نے وفاداری بدل ڈالی پر یہود؟“

جھوٹی یوں ہیں باندی کا دھرم اپنے مال کی وفاداری ہے اور اس سے میں آپ کی بیٹی مہاراج کنال کی کنیز ہوں۔ آپ نے خود ہی مجھے ان کو سونپ دیا تھا تاکہ آپ کے سوتیلے بیٹے کنال کے من میں آپ کے لیے

وہ بڑی نرمی سے بولی۔ ”پریسودا“ یہ بھولتی ہوں کہ تمہیں کنال کی کینئر بنایا ایک مقصد کے تحت تھا، وہ ہماری

”اس کا مطلب ہے، کشمیری اب بھی اپنی چالوں میں مصروف ہیں لیکن میں کیا بات کر رہا ہوں؟“ کھیل تو ختم ہو گیا مگر اپنی پرانی کتیر سے برسوں کے پریمیودا کی یہ بات سن کر کشا ایک دم جیسے بھل گئی۔

”جی، پوچھیے۔“ یہودیوں نے بھی رسالہ سے کہا۔
 ”کچھ شکر ادا کرو، اس رسالہ میں تمہاری؟“

”کیا تم یہ بتا چلا تمہیں کہ وہ کنیا کون ہے جو سچا ہے؟“ کہیں میں کنال کی سینٹینا میں بیٹھ کر،

”تو ہم بھی جانتے ہیں پر یسودا، ہم اس سے آگے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ سپاہی کون تھا، اس کا نام کیا۔“

”جو میں کہوں کہ میں نہ جان پائی کیوں کہ مہاراج کنال نے جب مجھے اپنی رانی کی خدمت میں دیا تو

میرے سامنے ایک بہت ہی ملوک ناری تھی جو سراسر ایک عورت ہی تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں یہ جان سکوں کہ یہ نیشن کس سماجی سے ملنے ہیں؟ پر میں یہ سوچ نہیں لگائی کہ وہ ناری بن کے اتنی تبدیل ہو گئی ہے کہ

یہ جان لینا ممکن ہے کہ وہ سبک بھی تھی۔" یہ یودا نے براعتما لہجہ میں کہا۔

گئی اس کی کچھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا جواب دے؟
”جب سے میں کنال مہاراج کے محل میں ہوں، میں نے کرشن کو نہیں دیکھا، صرف رجنی کو دیکھا ہے اور

آپ اچھی طرح جانتی ہیں ایک کنیر کی یہ بجاں نہیں کہ وہ مہاراج کی سینا کے سیلوں کے بارے میں ہون

”کبھی کبھی ارجن بھی دکھا تمہیں؟“ کشتہ کے ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔

”ایک بار دکھا تھا، وہ کنال مہاراج کے خصوصی سینک وٹے میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔ اس وقت لڑن ہیں۔“

وہاں۔
”یہ بڑی انہونی ہے کہ کرشن اور کنال کے خصوصی دتے میں شامل نہیں ہے؟“ کشنا نے جیسے کوئی اور

”اب میں چلتی ہوں رانی کو کہیں میری ضرورت نہ ہو۔“ ریموڈ کی اس بات سے کشتانے دو بائیں

پریس ایک یہ کہ پریودوائے اس سے جائے کی اپنی طرف سے۔
پریودوائے اپنے عام سے فقرے میں یہ احساس دلایا کہ اب اصل رانی کشتاہیں بلکہ جتنی ہے۔
”ہم جن کو سنا کہ آؤ تمہارے ہم سے ملنے جاتی ہو؟“ کشتا چھے کھسیا گئی۔

”آپ پھر بھول رہی ہیں کہ اس سے ہندوستان کی رانی رجنی ہی ہیں اور میں ان کی ادنیٰ کنیز آزا

اجازت لیے نہیں جاسی ہوں؟

55

”تو کم سے کم ہمارا نام تو نہیں لیتیں، کوئی اپنی مجبوری بتا دیتیں؟“

”اب یہ ممکن نہیں، رانی کی کینروں کی بڑی گہری چھان پھٹک کے بعد ان کے بارے میں سب کچھ جان کر ہی رکھا گیا ہے ان کے ایک ایک پل کی خبر رکھی جا رہی ہے۔“ پریودا نے احتیاطوں کا ذکر کیا۔

”کنال اپنی رانی کو اس طرح سات پردوں میں چھپا کے کیوں رکھنا چاہتا ہے؟“

”یہ بات اور اس سوال کا جواب میں نہ دے سکوں گی، معذرت چاہتی ہوں، تو ہمارا راج کنال ہی بتا سکتے ہیں۔ اب مجھے جانا ہوگا۔“ کشتا نے اپنی توہین کو بڑی صفائی سے چھپایا اور کشتا کو بڑی اچھی طرح رخصت کیا۔

.....

پریودا کی باتیں سن کر رجنی تھوڑی سی پریشان ہوئی۔ کنال دن بھر بہت مصروف رہتا تھا۔ بہت سے لوگ ملنے آیا کرتے تھے جن سے وہ مل جل کے ہلکان ہو جاتا، رات گئے جب ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہو جاتا، تب اسے بڑی شدت سے رجنی کی یاد آتی اور اس دن تو خود رجنی نے اسے ملاقات کا نیتا دیا۔ وہ دونوں چاندنی رات میں ایک وسیع راہداری کے اشوکا سنگار رانی جھروکے پاس ملے۔ رجنی کا حسن قیامت ڈھار ہاتھ اور کنال اسے دیکھتے ہی عین اس طرح سے مسحور ہو گیا جیسے پہلی بار وہ رجنی کو دیکھ کر ہوا تھا۔ جب دیر تک کنال کچھ نہ بولا تو رجنی نے گفتگو شروع کی۔

”ہماری جھکن سے جسم ٹوٹا ہوگا، دن بھر ایک ہی انگ سے بیٹھے رہنا، لوگوں کی ایک جیسی باتیں سنتے رہنے سے جی بڑا کسٹندی سے اکٹا جاتا ہوگا۔“

”ہاں مگر اس سے تو تمہارے دیدار کے نشے میں سب کچھ بھول گئے ہیں ہم۔“ وہ رکا، بے قراری سے رجنی کو پکڑا اور بولا۔ ”کیا آج ہمیں وہی گیت پھر سے نہ سنا دو گی؟“

چاندنی سارے رستوں پر پھیلی ہوئی تھی، تارے بھی ٹٹمار رہے تھے، بڑا ہی دلقریب ماحول تھا جیسے قدرت بھی کسی انہونی، آن دیکھی مستی سے جھوم رہی ہو۔ رجنی نے گیت چھیڑا، گیت تھا کہ الوہی سازوں اور آوازوں کی سنگت تھی۔ رجنی کی میٹھی ریلی مدھ بھری آواز جیسے آسمانوں کی کوئی منزہ اور پاکیزہ مخلوق ایک ساتھ آواز سے آواز ملا کے ہم آہنگ ہو۔ ساری اشیاء جھوم رہی تھیں، دلوں کے نرم تاروں میں کیسی لے تھی جو بے چلی گئی۔ گیت جانے کب کا ختم ہو گیا مگر اس کی گونج بدستور سنائی دیتی رہی۔ دو بے چین اور بے قرار دل ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے، تب یکا یک رجنی کے پیروں کی پائل بج اٹھی اور وہ ایسی بے خودی سے نرت بھاؤ میں ناچی کہ نرت راج بھی شرم جائے۔ دنیا کی کوئی راس لیلیا اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی، آٹھوں رس تھے جن کے سینے پر رجنی کے پاؤں جھلٹے تھے آہ..... کیا نظارہ تھا جو اس رات چشم فلک نے دیکھا، کیسا کھنکھور دل چاہیے اس منظر کے خاتمے کا حکم سنانے کو بھگو ان کے چہروں میں جانے کتنے دیوتاؤں نے دہائیاں دیں، پر سنسار کی ریت بدلی نہ جا سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ رجنی نے جو بات کہنے کو کنال سے ملنا چاہا تھا وہ بات من کے نہاں خانوں میں دفن ہو گئی اور جانے کب کے کب سویرا آن دھمکا۔ وقت کبھی کسی دیوتا کی خواہش سے بھی روکا نہ جا سکا اور اسے ساہت ہوا۔

مایا جال نے کجوں کے بھیر سے جھانک کے دیکھا اور اسے راستہ صاف ہی نظر آیا، دو پریمی کیسی آردھنا سے اور نہ محسوس کرنے کی انتہا کے آئندہ سے سنسار سے بے خود ہو گئے اور کسی کی مجال نہ رہی جو پہلی منزل کی اس راہداری میں قدم دھر سکتا، تب ہی بہت اچانک پریودا وہاں آ کر گری وہ دُجی تھی، تیر اس کے جسم کے

آر پار ہو چکا تھا۔ رجنی ہڑبڑا کے اٹھی۔ کنال کے اوسان بحال ہوئے کہ خطا ہوئے دونوں نے جلتی بجھتی آنکھوں سے پریودا کو دیکھا۔ دیش پر یونانیوں کا ملہ ہو چکا تھا، یہ بڑا زردی شب خون تھا۔ سپاہ بنا کنال کے حکم کے لڑنے پر مجبور ہوئی اور اسی سے میں بھیت کے جا گئے دشمنوں نے کل کے محافظوں کو قابو کر لیا۔ پریودا صرف اتنا کہہ سکی۔ ”رجنی، کشتا کے لوگوں نے جالوت کی سینا کے ساتھ مل کر متر شگ کو آزاد کر لیا ہے اور اس حملی نے کرن کو بھی کس لیا ہے۔ کشتا سارے محل میں دندناتی آپ دونوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ منظر بدل چکا ہے اور وہ جان ہار گئی۔

کنال نے فوری طور پر رجنی کو جھروکے سے نیچے اتر کے اپنی جان بچانے کا آدیش دیا کہ وہ دونوں اس وقت نہتے تھے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مٹی آنکھوں سے رجنی نے کنال کو دیکھا اور کہا۔ ”مجھے اپنے ساتھ سے الگ مت کیجیے مہاراج۔“

”رجنی، ہم جلدیں ملیں گے۔ تم کسی سرکشت جگہ پہنچ جاؤ۔ میں بس تم تک پہنچتا ہوں کچھ ہی سے میں۔“

”اور یوں میرا کنال.....!“

مزار کی خاموش فضا میں سرد کورجنی کی سسکیاں سنادیں اور وہ ہڑبڑا کے بیدار ہو گیا۔

تاریخ سے جڑی اس اسرار بھری کہانی کے باقی واقعات آئندہ مہینے ملاحظہ کیجیے۔

اک بار کہو

نگہت اعظمی کے سادہ اور پرکار قلم سے ایسی کہانی جس میں ہر اس لڑکی کو اپنا عکس نظر آئے گا جو ہر قسم کے نامساعد حالات میں نیکی اور سچائی کا پرچم تھا، سر اٹھا کر بیٹھا ہنر جانتی ہے۔ اس کہانی میں آپ کو زندگی کے مختلف روپ سانس لینے محسوس ہوں گے۔

علی میاں پبلیکیشنز

30 عزیز مارکٹ اور دو بازار۔ لاہور

فون: 414 7247

کتاب
ملنے کا پتہ

نگہت اعظمی

سال نو مبارک ہو!



سب سے پہلے اس دعا کے ساتھ سال نو کی مبارک باد قبول فرمائیے کہ
خدا کرے یہ سال ہماری قوم و ملک کے لئے کشمیری مجاہدین کے لیے اور
پورے عالم اسلام کے لیے مبارک ثابت ہو۔

ہرگز نہ والہ سال اپنے پیچھے بہت سی اچھی بری یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ یادیں
کامیابیوں اور ناکامیوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو خود احتسابی کے عمل سے
آگاہ ہیں ان کامیابیوں اور ناکامیوں سے دراصل سبق حاصل کرتے ہیں اور یہی درس
خوش آئند مستقبل کا ضامن بن سکتا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

کیا آپ نے کبھی خود احتسابی سے کام لیا؟ اگر نہیں تو اس مرتبہ تھوڑی سی دیر کے لیے
یکسوئی کے ساتھ سوچئے کہ آپ نے گزشتہ سال کیا کھویا، کیا پایا؟ یہ سوچ آپ کو وہ غلطیاں
نہیں دہرانے دے گی جو ناکامیوں کا باعث بنی تھیں۔

خود احتسابی کی اس سوچ کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھیے گا۔ اپنے آپ سے یہ بھی
ضرور پوچھ لیجیے گا کہ آپ نے اپنی قوم و وطن کے لیے کیا کیا تھا؟ ہماری عادت ہے کہ ہم
معاشرے کی ہر خرابی کا الزام ہمیشہ دوسروں پر رکھ دیتے ہیں اور اسے دور کرنے کا ذمہ دار
حکومت کو بٹھراتے ہیں۔ کسی مفکر نے کہا تھا کہ اگر آدمی اپنی اصلاح خود کر لیا کرے تو
معاشرے کا کم از کم ایک آدمی تو سدھر جائے گا۔ اگر ہماری قوم کا ہر فرد اس مفکر کے مقولے پر
عمل پیرا ہو جائے تو ہماری قوم بے مثال اور وطن جنت نظیر بن سکتا ہے۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ ادارہ یہ سچی کہانیاں اور دو شیزہ میں جنوری 1994ء میں لکھا، کیا یہ سچ نہیں؟